Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو ادب اور عساکرِ پاکستان

جلد اوّل

(کیپٹن) شاکر کنڈان

ناشر
ادارہ فروغ ادب کنڈان تحصیل شاہ پور ضلع سرگودہا

پبلی کیشنز نمبر ۵

ISPR-5149/ 62 / PR (M)

نام کتاب : اُردو اَدب اور عساکرِ پاکستان

جلد : اول (شاعری)

مؤلف : شاکر کنڈان

صفحات : ۳۸۴

اشاعت اول ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

کیلی گرافی : محمد اسلم مرزا، گجرات شہر فون: 512478

قیمت : 300 روپے

ناشر

ادارہ فروغ اَدب

کنڈان تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا

انتساب

مملکتِ خداداد پاکستان

اور

افواجِ پاکستان

کے نام

○○○

جو اپنے ہیں اُن کے واسطے تو امان اور پیار لے کے چلنا
مگر عدوئے وطن کی قِسمت میں لمحہ لمحہ زوال لکھنا
وطن کی خاطر لیا ہے میں نے قلم کو ہاتھوں میں جب سے شاکرؔ
کبھی اصولِ تفنگ لکھنا ، کبھی روایاتِ ڈھال لکھنا

★

تعارف

نام	عطا رسول
اَدبی نام	شاکر کنڈان
ولدیت	حاجی محمد حسین
تعلیم	ایم۔اے
پیشہ	ملازمت (پاکستانی آرمی)
مستقل پتہ	موضع کنڈان کلاں تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا

تصانیف و تالیفات

آشوبِ زیست	اُردو شعری مجموعہ
رفاقتوں کی فصلیں	اُردو شعری مجموعہ
مسافرِ صحرا	شکیل ساقی کی غزلوں کا انتخاب
کُرلاٹ	ملک شاہسوار علی ناصر کی پنجابی کہانیوں کا انتخاب
اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان (حصہ اوّل)	تحقیق و تذکرہ
اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان	تحقیق و تذکرہ (تین جلدیں زیرِ طبع)
جادۂ شوق	حجازِ مقدس کا سفر نامہ (زیرِ طبع)
سُنجیاں گلیاں سجریاں راہواں	کالام کا سفر نامہ
من کے اندر اک مندر	شعری مجموعہ (زیرِ طبع)
بنائے وجہِ کائنات ۔۔۔ محمدؐ	سیرت النبیؐ (زیرِ ترتیب)
الحمدللہ	حمدیہ انتخاب (تین جلدیں زیرِ ترتیب)
طلع البدر علینا	نعتیہ انتخاب (۸ جلدیں زیرِ ترتیب)
غزل اُس نے چھیڑی	تحقیق (۲۵ جلدیں زیرِ ترتیب)
دھرتی دا لہنا	پنجابی شاعری (زیرِ طبع)
سوچ جزیرہ	اُردو نظم (زیرِ طبع)
پھول، رات اور آنگن	اردو کہانیوں کا مجموعہ (زیرِ ترتیب)

عطا رسول شاکر کنڈان

ع عودِ سخن ، عطائے سخن ، عظمتِ سخن
ط طارق تجھے کہوں یا کہوں فوزِ انجمن
ا الماس ہے عساکرِ ارضِ وطن کا تو
ر رخشاں ہے تو ادب کے حوالے سے چارسُو
س ساغر تمہارے ہاتھ میں علم و ادب کا ہے
و وانی ہے علم و فہم میں ، شاعر غضب کا ہے
ل لاریب تو عطا ہے خدا کے رسولؐ کی
ش شاہِ جہاں نے شاعری تیری قبول کی
ا ازبر کیا ہے تو نے محمدؐ کے نام کو
ک کہتا ہے دل سے مدحتِ خیرؐ الانام کو
ر رزقِ حلال تیری رگوں میں ہے جابجا
ک کیپٹن تجھے ادب کا بھی رب نے بنا دیا
ن نصرت تیرے نصیب میں دائم ، عطا ! رہے
ڈ ڈیرے پہ تیرے ظلِّ الٰہی سدا رہے
ا اجملؔ کی یہ دُعا ہے ، یہی اس کی التجا
ن ندرت کرے کلام میں قائم رہے عطا

نذرانہ خلوص منجانب اجملؔ جنڈیالوی

تار و پود

اُردو اَدب کا رجمنٹل سنٹر

کپتان شاکر کنڈان، جن کو میں ادب کا کُندن کہا کرتا ہوں، تلوار اور قلم کے دھنی ہیں ان کا تعلق پاکستان آرمی کے "رسالہ" کے بازو (ARM) سے ہے۔ کنڈان ایک اچھے شاعر ہیں۔ اگرچہ دیکھنے میں اتنے ٹھیٹھ سپاہی ہیں کہ جیسے شاعری ان کی چھاؤنی سے کبھی گزری ہی نہیں۔ جنگ کا محاذ جب سے سرد ہوا ہے، آپ نے اپنی پیش قدمی کے لیے ایک وسیع قلمی محاذ کھول لیا ہے۔ وہ گزشتہ چند برسوں سے عسکری "باوردی اہلِ قلم" ۰۰۰ ادیبوں، شاعروں ۰۰۰ کا تذکرہ مرتب کر رہے ہیں۔ جس کی پہلی "پریڈ" (جلد) آپ کے سامنے ہے۔ چونکہ آپ خود شاعر ہیں۔ لہذا سب سے پہلے آپ شعراء ہی کو "فائرنگ لائن" (Firing Line) پر لائے ہیں۔ نثر نگاروں کا "سکواڈرن" (Squadron) پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اس سیکشن میں جب ۰۰۰ شعراء "لائن حاضر" ہو گئے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ "پریڈ" کتنے "کالموں" پر جا کر ٹھہرے۔ بالخصوص جب انہوں نے دوسری عالمی جنگ کے "مورچوں" اور پہلی جنگِ عظیم کی خندقوں کو بھی کھنگالنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ شعراء کی تعداد بہرحال نثر نگاروں سے زیادہ نکلے گی۔ کہ موت کی آمد آمد ہو تو شاعروں میں بھی آمد آمد ہونے لگتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس میدان میں فوج کی نظامتِ تعلیم کے کوئی صاحبِ سیف و قلم میدان میں اتریں گے۔ مگر یہ کام ایک رسالے والا کر گزرا۔ اگرچہ اس پر ہمیں حیرت بھی نہ ہونی چاہیئے کہ "ٹینک" (Tank) تو میدان کا شہزادہ ہے۔ ہر چیک اس کی جاگیر!

اس کتاب میں جہاں کرنل فیض احمد فیض، کپتان ن م راشد، میجر (مولانا) چراغ حسن حسرت، آنریری کیپٹن جعفر طاہر، فلائٹ لیفٹننٹ سراج الدین ظفر جیسے عہد آفریں "باوردی شعراء" موجود ہیں وہاں کرنل (ڈاکٹر) جاذب ترین، کرنل دلنواز دل، لیفٹننٹ جنرل (ڈاکٹر) محمود الحسن اور (چار ستار) جنرل خالد محمود عارف جیسے معروف شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ پھر ۰۰۰ بعض ایسے ممتاز اور نامور شعراء کا تذکرہ اس حوالے سے غالباً پہلی مرتبہ اس نوع کی کسی دستاویز میں نظر آیا جن کے بارے میں شائد شاذ شاذ لوگوں ہی کو معلوم ہو کہ وہ بھی عساکر سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ مثلاً مولانا وقار انبالوی اور حاجی لق لق (پہلی جنگِ عظیم میں) حوالدار تھے۔ منیر نیازی بحریہ میں "سیلر" (Sailor)، اشفاق نقوی، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور خلیل رامپوری وغیرہ۔ ع

میرے بزم میں رازداں اور بھی ہیں

کپتان شاکر کنڈان نے شعراء کی کمشننگ (Commissioning) یعنی (انتخاب) میں "محمود و ایاز" والی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر رینک (Rank) (سطح) کے شاعر کو ایک ہی "لنگر" میں پہلو بہ پہلو "ہانڈی وال" بنا دیا ہے۔ چنانچہ نمونۂ کلام کی مد میں ہر شاعر کو برابری کی بنیاد پر "راشن ایشوع" (Ration Issue) کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی لگن اور تلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو "ریسرچ" (Research) کی پہلی شرط ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ عساکر سہ گانہ کا کوئی شاعر بھی اس تذکرے سے "بارہ پتھر" (باہر) نہیں رہا۔ مثلاً مجھے سرسری نگاہ سے مسودہ دیکھنے پر کرنل شیر محمد شاؔد اور سکواڈرن لیڈر قمقام حسین جعفری (جو گارڈن کالج راولپنڈی میں اُردو پڑھاتے رہے) دکھائی نہیں دیئے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے عسکری شعراء کی بھاری نفری جمع کر کے اس کتاب کو عسکری شاعروں کا اچھا خاصا "رجمنٹل سنٹر" (Regimental Centre) بنا دیا ہے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کیونکہ عسکری ادیب اور شاعر عموماً قلم کو پیچھے اور تلوار کو آگے رکھتے ہیں۔ چھپتے زیادہ اور چھپتے کم ہیں۔ شاعری ان کے اندر ابلتی ہے مگر نکلنے نہیں پاتی ۔۔۔ ماحول کا خول ہی کچھ ایسا تھا۔ غلامی کے دور میں انگریز آقا دیسی (Native) افسروں کو قلم کے قریب نہ جانے دیتا۔ انگریز کی فوج کا "انڈین سولجر" (Indian Soldier). باپ، ماں یا بیوی کے نام خط لکھنے (یا شلوار میں ازار بند ڈالنے) کے سوا قلم سے کوئی اور کام نہیں لے سکتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ "دیسی افسر" اپنی "باش گاہوں" (Officers Messes) میں ریڈیو سے اپنی موسیقی نہیں سن سکتے تھے اور آپس میں بھی اگر اردو میں بات کرتے تو سرگوشیوں میں کرتے۔ حالات کے اسی جبر نے فوج اور ادب کے درمیان یقیناً ایک افسوس ناک خلیج حائل کر رکھی تھی۔ جس سے علم "زنگ آلود" اور تلوار "صیقل" رہتی تھی۔ ترقی کا زینہ جہالت کے راستے سے کھلتا تھا۔ یہ تاثر عام پایا جاتا کہ شعر و ادب کا ذوق رکھنے والا شخص کار آمد سپاہی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قلم اور تلوار میں اینٹ اور کتے والا بیر تھا۔

انگریز نے ہمارے لیے شجاعت کو "جہالت" کے تابع اس لیے کر رکھا تھا کہ ہمارا کام لڑنا تھا "لڑوانا" نہیں تھا۔ ہمارا محاذِ جنگ اپنے سامنے کی چند گز زمین تک محدود تھا۔ خدا کا شکر کہ آزادی کے بعد ہم رفتہ رفتہ اس "بندی خانے" سے نکلنے لگے اور آج گو ہماری وردی وہی ہے مگر ہم وہ نہیں ہیں۔ غور فرمائیے کہ جس فوج کے پیشرو "نسل" کا سپاہی اُردو زبان رومن حروف میں پڑھتا تھا اور جس فوج کا افسر اپنی زبان بھول چکا تھا۔ اس میں ایک شاعر افسر (جنرل عارف) فوج کے سربراہ کے منصب تک پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑا ذہنی انقلاب تھا۔ مجھے اس کا کچھ اندازہ تو تھا۔ مگر سر اتنا بھی اونچا نہ تھا جتنا اس کتاب

کے مسودہ کو دیکھ کر ہوا۔ مجھے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنا "توپ کے پیچھے کا آدمی" (Man Behind the Gun) پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوط، طاقتور اور موثر معلوم ہوا ہے۔

اُردو زبان نے جنم ہی فوج کی کوکھ سے لیا ہے۔ اس موضوع پر شاکر کے بسیط جائزے کے بعد میرے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ بعض واقعات اور لطائف کا حوالہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ ان سے اُردو زبان اور عساکر کی ہم قدمی کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ اور اس تناظر میں اس زبان کی رسائی و کارفرمائی کا کچھ اندازہ بھی۔ مثلاً

۱۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے "ویٹرن" (Vetrens) کی روایت کے مطابق جن جن محاذوں پر "برٹش انڈین آرمی" لڑتی رہی وہاں "خفیہ اشارات" (Code Words) عموماً اردو کے استعمال کئے گئے۔

۲۔ انگریز سپہ سالار (بشمول لارڈ ماؤنٹ بیٹن) (Mount Baten) فیلڈ مارشل سر ولیم سلم (Slim) اور فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک (Auckinleck) "انڈین ٹروپس" (Indian Troops) سے جب بھی خطاب کرتے اردو ہی میں کرتے۔ ہاں تقریر بے شک "رومن" حروف میں لکھی ہوتی۔ تاریخی حوالے کے طور یہاں اس واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جنوب مشرقی ایشیاء میں جاپانیوں کی سپر اندازی کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لیے اردو میں تقریر کیپٹن (بعد میں جنرل اور چیف آف آرمی سٹاف) گل حسن نے لکھی جو اس وقت فیلڈ مارشل سلم کے اے ڈی سی (ADC) تھے۔ اس سلسلے میں مزے کی بات یہ ہے کہ فیلڈ مارشل کو گل حسن کا مسودہ پسند نہ آیا اور موصوف نے مسودے کو اپنا قلم بھی لگایا کیونکہ وہ گورکھا پلٹنوں کی "کمان" اردو میں کرتے رہے تھے۔ بعد میں ماؤنٹ بیٹن کے لیے ایک تقریر کا مسودہ (اردو کے صاحبِ اسلوب انشاء پرداز) میجر (مولانا) چراغ حسن حسرت نے تحریر کیا۔ مولانا نے "سپریمو" کو (یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا فوجی تخلص تھا) رومن حروف میں سے اُردو اٹھانے اور بولنے کی "ریہرسل" بھی کرائی اور ان کا کہنا تھا کہ وہ پہلی خواندگی ہی میں خاصے رواں ہو گئے۔

۳۔ ہماری "چنے کی دال" ہمارے "جوانوں" اور (دونوں عالمی جنگوں میں) ہمارے جنگی قیدیوں کے ساتھ ساتھ اُردو کے کئی الفاظ (جن میں طوائف کے لیے "لال بی بی" کا لفظ بھی شامل تھا) قاہرہ، بغداد، روم، جرمن، ایتھنز، برما، ملایا، سیام بلکہ جاپان تک جا پہنچے۔

۴۔ سمندر پار کے "جوانوں" کے لیے ۱۹۴۵ء میں پہلی مرتبہ اردو حروف میں سنگاپور سے ایک روزنامہ اخبار شائع ہوا۔ جس کا نام بھی "جوان" ہی تھا۔ اور جس کے مدیر اعلیٰ میجر (مولانا) چراغ حسن

حسرت تھے اور عملہ ادارت میں کیپٹن (بعد میں کرنل) مسعود احمد، کیپٹن (بعد میں کمانڈر اور اُردو افسانہ کے "ابنِ سعید") حسن عسکری، کیپٹن (بعد میں کرنل) جاوید خٹک، کیپٹن انعام اللہ قاضی اور راقم الحروف کے علاوہ ایک انگریز افسر کیپٹن ڈونلڈ الائے (Donald Ellay) بھی شامل تھے۔

ایک واقعہ پاکستان کے حوالے سے یاد آگیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کا جہادِ آزادی برپا تھا۔ ایک روز ہم نے اپنے سپہدار میجر جنرل نذیر احمد کو کچھ آزردہ سا دیکھا۔ پوچھا "سر خیر تو ہے" ہنس کر بولے باقی تو ٹھیک ٹھاک ہے مگر ایک بجوگ یہ ہے کہ کمانڈر انچیف (جنرل سر ڈوگلس گریسی) جنگ انگریزی میں لڑواتا ہے۔ جبکہ ہم اردو (بلکہ پنجابی اور پشتو) میں لڑ رہے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ سوانحی اور دستاویزی نوعیت کے ایسے تذکرے میں دید و شنید کی غیر رسمی باتوں پر "اسکالر دانشور" شاید ناک بھوں چڑھائیں۔ مگر میں دیانت داری کے ساتھ ان واقعات کو موضوع سے غیر متعلق نہیں سمجھتا۔

کپتان شاکر کنڈان کے کام کی مشکلات کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ واقعہ یہ کہ یہ معلومات چیونٹی کی طرح ایک الجھے، بکھرے ہوئے نیم روشن جنگل میں سے دانہ دانہ جمع کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نہایت قابلِ قدر قومی اور ادبی خدمت کے لیے کپتان کنڈان ہمارے دلوں کے "سلیوٹ" کے مستحق ہیں۔

سید ضمیر جعفری

23 رمضان 9/1 اسلام آباد

۱۔ کرنل شیر محمد شاد کتاب میں شامل ہیں۔

کچھ باتیں اُلجھی اُلجھی سی

۱۔ جب سورہ اقرا یعنی سورہ العلق کی ابتدائی پانچ آیات غارِ حرا میں بذریعہ وحی ہمارے پیارے نبی آقائے نامدار احمد مجتبےٰ محمد مصطفیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں تو ان میں پڑھنے اور قلم کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ چوتھی اور پانچویں آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ : " جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے۔ اس نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

اسی پر موقوف نہیں قرآن مجید میں کئی مقامات پر علم کا ذکر ہوا۔ کہیں فرشتوں کے اعتراض میں انسان سے علم کی باتیں اگلوائی گئیں تو کہیں انسان سے ہی علم میں اضافے کی دعائیں منگوائی گئیں۔ بہرحال اوپر دیئے گئے ترجمہ میں قلم کو تعلیم کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ یہ تو تھی وہ ابتدائی بات، جو اسلام کا پہلا درس تھا۔ چند ہی سال گزرے تھے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہوا " تم پر قتال کو فرض کیا گیا ہے " (البقرہ) اور پھر حکم ہوا " مفسدوں اور فتنہ پردازوں سے اس وقت تک لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے " (الانفال)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح ارشادات فرما دیئے کہ مسلم قوم کی بقا ان دونوں احکام کی بجا آوری میں ہے۔ یعنی علم اور جہاد۔ علم کے لیے قلم کو مخصوص فرمادیا اور جہاد کے لیے سیف کو۔ سیف سے مراد آج کے دور کی جنگوں میں استعمال ہونے والے سب ہتھیار ہیں اور قلم سے مراد ذرائع تعلیم۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی ہمارے نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں علم کے حصول کے لیے دور دراز کے سفر پر جانے اور اس کے فرض ہونے کی اہمیت پر زور دیا وہاں صحابہ کرامؓ کو کئی مقامات پر بھیجا کہ وہ (قرآن و اسلام کے علاوہ) دوسرے علوم بھی سیکھ آئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپؐ صرف مسجد و مصلیٰ کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ تلوار ہاتھ میں لے کر دور دور تک دشمنانِ اسلام سے ٹکرانے کے لیے گئے اور ٹکرائے۔ یہ وہ عملی قدم تھا جو آپؐ نے اٹھایا اور جس کی تعلیم فرمائی۔

قرآن و سنت کے بے شمار حوالوں کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو قلم اور تلوار کا رشتۂ اٹوٹ کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ دونوں فرائض پوری امتِ مسلمہ پر لاگو ہیں لیکن حالات اور وقت نے تلوار ہاتھ

میں لے کر جہاد کا فرض ادا کرنے والوں کو ایک علیحدہ تسبیح میں پرو دیا۔ میں اسلام سے پہلے کے حالات کا جائزہ پیش نہیں کر رہا۔ بلکہ دینِ اسلام کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں چند حوالے پیش کر رہا ہوں۔ بہر حال ابتداء میں ہر مسلمان جیشِ محمدیؐ کا سپاہی ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب اسلامی دنیا کی وسعت اور روز بروز اضافے کو دیکھا تو کئی اصلاحات نافذ فرمائیں اور پھر فوج بھی ایک الگ شعبہ قرار پایا۔

جب ہم اسلام کے ابتدائی ایام سے لے کر آج تک کی فوج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایسے بے شمار نام ملتے ہیں جن کے ایک ہاتھ میں تلوار ہوتی تھی اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ جو میدانِ جنگ میں تو دہشت اور موت ہوتے تھے لیکن امن کے دور میں مبلغ، مفسر، مؤرخ، شاعر اور ادیب ہوتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہی لے لیجئے کتنے ہی حضرات صاحب ایوان ہوئے ہیں۔ جن کی قلم اور تلوار کی کاٹ سے ہی اسلام کو اس قدر وسعت ملی۔ وہ جب جنگوں میں دھڑا دھڑ حملے کر رہے ہوتے تھے تو رجز بھی جاری ہوتا تھا۔ بلکہ اگر کسی وجہ سے کوئی سپاہی دشمن کے خلاف حصہ نہ لے سکتا تھا تو اسے دکھ ہوتا تھا اور وہ اپنے اس دکھ کا اظہار بھی شعروں میں کرتا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جنگ قادسیہ کا میدان گرم ہے۔ لشکرِ اسلامی اس وقت کے سب سے بڑے اور طاقتور لشکرِ ایران سے نبرد آزما ہے۔ اسلامی جیش کے ایک سپاہی حضرت ابو محجنؓ کو شراب نوشی کے جرم میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص (سپہ سالارِ لشکرِ اسلام) نے پابہ زنجیر کر رکھا ہے اور اپنی زوجہ کی حفاظت میں یہ کہہ کر چھوڑا کہ میں میدانِ جنگ سے واپسی پر فیصلہ کروں گا۔ ادھر ملزم جنگ کا منظر دیکھ کر بھاگنے یا سکون کی نہیں سوچ رہا بلکہ جہاد سے محرومی کے غم میں نڈھال بیٹھا ہے۔ اور دھائیں مار مار کر رو رہا ہے اور پھر اپنے محافظ سے فی البدیہہ اشعار میں عرض کرتا ہے۔

ترجمہ:

الف۔ اس سے بڑھ کر غم ناک بات کیا ہوگی کہ سوار نیزہ بازی میں مصروف ہیں اور میں قید میں پڑا ہوں۔

ب۔ اٹھنا چاہتا ہوں تو زنجیریں اٹھنے نہیں دیتیں۔ دروازے اس طرح بند کر دیئے گئے ہیں کہ پکار پکار کر رہ جاتا ہوں مگر کوئی کان نہیں دھرتا۔

ج۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بڑا مال دار اور برادری والا تھا۔ لیکن آج تنہا ہوں اور کوئی غم گسار نہیں۔

د۔ مجھے یہ غم کھائے جاتا ہے کہ ہر صبح طلوع ہونے والا سورج مجھے زنجیروں میں جکڑا ہوا اور خاموش پاتا ہے۔

ہ۔ گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ لوگ جانبازی اور سرفروشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور میری حالت دگرگوں ہے۔

د۔ اے خاتونِ محترم! مجھے ہتھیار دے دیجئے۔ جنگ طول پکڑتی جاتی ہے۔

ز۔ خدا کی قسم! میں بد عہدی نہیں کروں گا۔ نہ دھوکے سے کام لوں گا۔

ح۔ زندہ بچ رہا تو واپس آجاؤں گا اور مارا گیا تو گویا دل کی مراد پوری ہو جائے گی۔

اور پھر اس خاتونِ محترم نے بلا جھجک بیڑیاں کھول دیں۔ حضرت ابو محجن رضؓ میدانِ جنگ میں جاتے ہیں اور جو نظارہ فلک اور اپنے و غیر دیکھتے ہیں اسے تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا ہے۔ تو یہ ہے ایک جذبہ جو صاحبِ قلم و سیف میں موجزن دکھائی دیتا ہے اور ہاں! یہ کچھ لوگوں کے ذہن میں الجھنے والے ایک فتور اور ایک سوال کا جواب بھی ہے۔

۲۔ بات چونکہ اردو ادب کی کرنا مقصود ہے۔ اس لیے یہاں اردو ادب کی بات کرتے ہوئے کچھ متعصب لوگوں کے اس سوال کا جواب بھی دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جن کے ذہن میں یہ الجھن ہے کہ اردو زبان کا تعلق فوج سے نہیں ہے یا فوج محدود ہونے کے باعث اردو ادب کی خدمت نہیں کر سکتی یا کر رہی۔ تو جناب! مجھے ایک تحریر یاد آرہی ہے جو شاید ابن انشاء یا صدیق سالک کے سفر ترکی کے کسی سفرنامہ میں میری نظروں سے گزری تھی۔ مفہوم کچھ یوں ہے "میں ایک سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک بڑے سے دروازے پر لگے ہوئے ایک تختے پر نظر پڑی، لکھا تھا "اردو اکادمی" دل بڑا خوش ہوا کہ ع سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ جب اندر گیا تو دیکھا کہ فوجی روزمرہ کی ڈرل میں مصروف ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ بھئی! اردو تو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لشکر کے ہیں" یہ تو تھا ایک تحریر کا حوالہ۔ لیکن اصلیت کچھ یوں ہے کہ اردو حقیقت میں ترکی زبان کا ہی ایک لفظ ہے۔ یہ الگ بات کہ کچھ لوگوں نے اسے فارسی سے منسلک کر دیا۔ مثلاً غالب کے ایک شاگرد علاؤالدین علائی (وفات ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴) نے ۵ مئی ۱۸۶۶ء کو (دلی سوسائٹی) کے ایک اجلاس میں اپنے پڑھے جانے والے ایک مضمون میں کہا "واضح ہو کہ "لشکر" کو فارسی میں اردو بھی کہتے ہیں۔ جس کا ترجمہ عربی میں جیش اور انگریزی میں کیمپ و آرمی ہے ہر چند کہ بعض لوگ اردو کو بمعنی لشکر لفظ ترکی بتاتے ہیں۔ مگر یہ لفظ فارسی کا ہے۔ بایں حال جب اس زبان نے ترکیب پائی اور لشکر کے بازار گاہ میں جہاں اطراف و اکناف عالم کے تجار آتے جاتے تھے۔ صرف محاورات و مکالمات ہوتے تو یوماً بعد یوم اس کی ترقی ہوتی گئی۔ اور نام اس کا زبان اردو ہوا۔ از آنجاں کہ بعد عہد اکبر زمانہ شاہ جہاں آباد قرار پایا اور خود اپنی ذات سے بادشاہ بھی اس جا متمکن بردوام رہا تو نام اس لشکر کا تنہا اردو ہے

معلیٰ رکھی جس کا ترجمہ انگریزی میں رائل کیمپ ہو سکتا ہے"۔

لیکن ماہر لسانیات اور محقق اردو کو ترکی زبان کا لفظ ہی قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں بے شمار محققین کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ جن کی تحریریں میں نے پڑھیں۔ مثلاً عین الحق فرید کوٹی، سلیم اختر، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، دائرہ معارف الاسلامیہ، چند ایک انسائیکلو پیڈیا ز، گراہم بیلی، سر جارج ابراہم گریرسن، گارساں دتاسی وغیرہ اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ " اُردو " ترکی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہے فرودگاہ لشکر، پڑاؤ، لشکر، جیش، سپاہ، حصہ لشکر یا چھاؤنی۔ بلکہ حافظ محمود شیرانی تو لکھتے ہیں کہ " یہ لفظ اصل ترکی ہیں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوردا، اوردہ، اردہ، اوردو اور اردو۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال خیمہ، بازار لشکر، حرم گاہ، محل و محل سرائے شاہی و قلعے پر بھی ہوتا ہے۔

۳۔ لفظ اردو برصغیر میں سب سے پہلے شہنشاہ بابر نے اپنی کتاب " تزک بابری " میں استعمال کیا۔ لکھتے ہیں " دروقت رسیدن نزد باہیان جادر ہائے مارا کہ عقب ماندہ بود مے پیند، مارا خیال کردہ زود برے گردند بہ اردوئے خود رسید بہ ہیچ چیز تقید نہ شدہ کوچ می کنند " تزک بابری ۱۵۳۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ اکبر کے عہد میں یہ لفظ خاصا مقبول ہو چکا تھا اور کئی ترکیبوں میں استعمال ہوتا تھا۔ جیسے " اردوئے علیہا، اردوئے معلیٰ، اردوئے لشکر، اردوئے حضرت، اردو ظفر قرین، اردوئے عالی اور اردوئے بزرگ وغیرہ وغیرہ"

تزک بابری کے تقریباً ایک سو سال بعد یعنی ۱۶۴۷ء میں جب شہنشاہ شاہجہان نے آگرہ کی بجائے دہلی کو پایہ تخت بنایا تو شاہی محل اور قلعہ کے نزدیک جو بازار واقع تھا، اسے اردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ چونکہ وہاں سپاہ کا مسکن تھا اسی نسبت سے اسے یہ نام دیا گیا اور اس بازار میں بولی جانے والی زبان کو لسانِ اُردوئے معلیٰ کہا گیا۔ اس ضمن میں میر امن دہلوی " باغ و بہار " میں لکھتے ہیں:

" تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تب سے شاہجہان آباد مشہور ہوا۔۰۰۰ اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا"۔

میر امن دہلوی کو ہم ماہر لسانیات کی حیثیت سے نہیں جانتے۔ لہذا اس سلسلے میں کچھ ماہرین کی رائے دیکھتے ہیں جو ان سے متعلق نظر آتی ہے۔ بقول ان کے:

"حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ ان ہی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا۔ پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمانوں کی آمیزش پائی۔ آخر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام

نہاد سلطنت چلی آتی ہے۔ ہندوستان فتح گیا ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے آخر وہاں سے آن کر پس ماندوں کو گوشمالی دی کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لا ثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی"۔

مغربی ماہرین میں سے گارساں دتاسی، سر چارلس لائل، گریرسن اور جان بیمز وغیرہ نے بھی مغل حکومت میں اور وہ بھی بالعموم شہنشاہ اکبر کے عہد سے اس کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ ان تمام ماہرین کے بموجب مغل پرچم تلے ہندوستان کے مختلف علاقے کے لوگ اور خاص طور سے فوجی جب اردو میں جمع ہو کر اکٹھے رہنے پر مجبور ہوئے تو روزمرہ کے میل ملاپ، سماجی روابط اور عام بول چال میں طرح طرح کے الفاظ کی آمیزش سے ایک کام چلاؤ قسم کی بولی نے جنم لیا۔ جس نے بعد ازاں ترقی پذیر ہو کر عربی، فارسی الفاظ کی آمیزش سے اپنے دامن میں وسعت پیدا کی اور بالآخر ادبی تخلیقات کی جوت سے زبان کا نام پایا۔

سر چارلس لائل کے مطابق:

"اردو شمالی ہندوستان کی وہ بولی ہے۔ جس نے عہدِ اکبری کے اردو بازار میں مختلف زبانوں کی آمیزش سے جنم لیا دراصل یہ لشکر کی زبان تھی"۔

حافظ شیرانی کہتے ہیں "غوریوں کے عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے۔ اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بناء پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے"۔

سید سلیمان ندویؒ اپنی کتاب "نقوشِ سلیمان" میں یوں رقم طراز ہیں:

"سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گروہ ہے" جس کے پیچھے ان کی تحقیق کا یہ نقطہ کارفرما ہے کہ مسلم حملہ آوروں نے ہی اس زبان کی ابتداء کی۔ گو ہمارے سامنے ابھر کر آنے والی شخصیت محمد بن قاسم ہیں لیکن ان کے حملے سے قبل بھی کچھ مہمات ہندوستان بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ اموی دربار کا ایک سالار مہلب بن ابی صفرۃ تولاہور تک آن پہنچا تھا۔ لیکن یہ اور اسی نوع کی مہمات کسی سیاسی تدبیر ہی کا نتیجہ نہ تھیں محض حملے تھے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ راجہ داہر کو شکست دے

کر سندھ کو مسلم حکومت کا ایک صوبہ بنایا اور یوں شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد اور سکونت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مقامی بولی "وراچڈ" یا "براچڈ" اور عربی کی آمیزش شروع ہوئی۔ جس کے اثرات آج بھی سندھی زبان کے رسم الخط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بعد ازاں جب یعقوب بن لیث صفاوی متوفی ۸۷۶ء نے سندھ کو اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا تو عربی کے ساتھ فارسی زبان کا عمل دخل بھی شروع ہوگیا جو اس کے بعد بھی کسی نہ کسی طرف جاری ہی رہا۔ حتیٰ کہ محمود غزنوی نے جاٹوں کو شکست دے کر سندھ کو بھی پنجاب کی مانند اپنی قلمرو میں شامل کرلیا اور نتیجہ وہی دیگر صوبوں والا نکلا کہ ہندو مسلم تمدن ملاپ اور دیسی بدیسی زبانوں کے امتزاج نے جس نئی زبان کے ہیولیٰ کو جنم دیا وہ تھی ۰۰۰ اردو!

ڈاکٹر انعام الحق کوثر اردو زبان کی ابتدا میں خطہ بلوچستان کو اہمیت دیتے ہیں اور یہ نظریہ پیش کرتے ہیں "اردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی کیونکہ یہی بلوچستان ہے جو خلافتِ مشرقی کا صوبہ طوران ہوتا تھا اور محمد بن قاسم کی مہم کے بعد ایک زمانہ تک اس علاقہ میں عربی، فارسی اور سندھی زبانیں بولنے والے لشکریوں کا میل ملاپ ہوتا رہا اور ان کی بول چال سے ایک نئی زبان تشکیل پانے لگی"۔

ڈاکٹر سکینہ لکھتے ہیں "چونکہ فارسی زبان میں چاشنی زیادہ تھی اس لیے سنسکرت کی جگہ فارسی کے الفاظ شامل ہوگئے۔ ساتھ ساتھ عربی کا مزاج جو سنسکرت اور ہندی سے کہیں لذیذ تھا اس کے الفاظ بھی مقامی بولی میں گھل مل گئے"۔ وقت گزرتا رہا اور پھر ایک دن یہ لفظ جو مختلف شکلوں اور ترکیبوں میں استعمال ہو رہا تھا صرف "اردو" رہ گیا۔ چنانچہ بعد میں لکھی جانے والی تحریروں میں اس کو اردو ہی کے نام سے لکھا اور جانا گیا۔

مندرجہ بالا حوالے دینے کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اردو زبان کی ابتدا عساکر کے ہاتھوں ہوئی۔ اگر یہی بات میں تسلیم کروانا چاہتا تو شاید مخالفین اسے رد کر دیتے اس لیے چند ماہرین کی تحریروں کے حوالے دے کر مجھے یہ بات کہنی پڑی اور امید ہے کہ اس سے انہیں اس بات کا جواب مل گیا ہوگا کہ اردو زبان کی بنیاد سے افواج کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ مزید اطمینان کے لیے ہمیں تین، ساڑھے تین ہزار سال پیچھے کی طرف جانا پڑے گا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے یہاں کئی اقوام آئیں اور آباد ہوئیں۔ یہ بڑی وسیع تاریخ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت برصغیر جنوبی ایشیا میں بے شمار زبانیں بولی جاتی تھیں جو کہ مختلف علاقوں میں رائج تھیں۔ لیکن ان میں کوئی زبان ایسی نہ تھی جسے قومی زبان کہا جاسکتا۔ آریاؤں نے

جب برصغیر کو اپنا مسکن بنایا تو انہوں نے پہلی بار علاقائی زبانوں کی وقعت کو گھٹا کر اپنی زبان کو عام کیا اور حقیقت میں یہ ان کی فوجی برتری کے باعث ہوا۔ چونکہ اسی لڑاکا قوت سے ہی انہوں نے یہاں قدم جمایا تھا۔ اس لیے سنسکرت کو عزت دی۔ لیکن جب ان کی عسکری قوت کمزور ہو گئی اور آریاؤں کی حکومت پذیر ہونے لگی تو پھر سنسکرت پر علاقائی اثر بڑھ گیا۔

لسانیات کے محقق عین الحق فرید کوٹی جن کی کتاب "اردو کی قدیم تاریخ" کئی غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی ہے، کی تحقیق کے ڈانڈے بھی اردو زبان کے ماخذ میں آریاؤں کے دور سے جا ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جب آریا ہندوستان میں وارد ہوئے تو سندھ میں انہیں ایک بہتر تہذیب اور اعلیٰ تر تمدن کے حامل افراد سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے لوگ تھے جو دراوڑی زبان بولتے تھے۔ انہوں نے نووارد آریوں کی زبان کو بھی متاثر کیا اور یہی دراوڑی زبان وہ اساس قرار پائی جس پر بالآخر قصر اردو استوار ہوا"۔

ہاں! میں تو یہ بھول ہی گیا کہ اعتراض کرنے والے کوئی نہ کوئی بہانہ یا جواز تلاش کر ہی لیتے ہیں اور اس تحریر میں وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۔۔۔ جی! عین الحق فرید کوٹی کا تعلق تو پاک فوج سے تھا اس لیے وہ عسکری حوالے دیتا رہا۔

تو جناب! ڈاکٹر وزیر آغا میں تو کسی صورت بھی عسکریت نہیں آئی۔ پھر وہ کیوں کہتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جب آریا ہندوستان میں آئے تو انہیں ایک اپنے سے بہتر اور ترقی یافتہ تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک ایسی تہذیب جس کے پاس نہ صرف اپنی زبانیں موجود تھیں بلکہ جس نے اپنی زبانوں کے لیے رسم الخط بھی ایجاد کر لیا تھا۔ دوسری طرف آریاؤں کے ہاں زبان کا تصور تک موجود نہیں تھا"۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا:

"کہ آریاؤں نے کچھ عرصہ بعد ہندوستانی بھاشاؤں کو اس حد تک قبول کر لیا کہ خود ان کی باہر سے لائی ہوئی زبان ان بھاشاؤں میں ضم ہو گئی"۔ اور پھر وادیٔ سندھ کی تہذیب سے گزرتے ہوئے درمیانہ روی کا راستہ اپناتے ہوئے اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے وقت وادی سندھ میں ایک ایسی زبان موجود ہوگی جس میں لہجے کے اختلافات تو تھے مگر جس کا بنیادی ڈھانچہ دراصل ایک ہی تھا اس کو نووارد مسلمانوں نے ہندی کا نام دیا۔

دراصل ڈاکٹر وزیر آغا ایک نقاد ہیں ان کا میدان لسانیات نہیں اور یہی وجہ ہے کہ عین الحق فرید

کوئی نے جس سلسلے کی کڑیاں دراوڑی سے اردو تک ملائی ہیں، وزیر آغا اس پورے سلسلے کو نہیں جوڑ پائے اور بات کو شارٹ کٹ پر ختم کر دیا۰۰۰ اور اس سے آگے اردو کا ڈھانچہ کیسے بنا۔ رقم طراز ہیں

:

"جب اسی ہندی سے مسلمانوں کی اپنی زبان فارسی متصادم ہوئی تو اس کے نتیجے میں زبان کی جو تیسری صورت وجود میں آئی وہ ریختہ یا اردو تھی۔ چنانچہ اردو کا جسمانی ڈھانچہ تو ہندی نے عطا کیا۔ لیکن اس میں ابال اور تحرک فارسی کی وساطت سے آیا"۔

یہ ساری بحث میں نے کیوں چھیڑ لی؟ کیا یہ فضول نہیں ہے؟ کیا اس سے کوئی مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ قسم کے شاید کئی سوال آپ کے ذہن میں ابھر رہے ہوں گے۔ اور میں بھی سوچتا ہوں کہ شاید میں اس الجھن اور اتنے حوالوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑتا۔ اگر میری کم علمی کا مذاق نہ اڑایا جاتا یا میرے اس ادارے جسے فوج کہتے ہیں، جو میری روح ہے، کو تضحیک کا نشانہ نہ بنایا جاتا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو آج شاید نہ تو میں اتنا مطالعہ کر پاتا اور نہ ہی یہ کتاب منظرِ عام پر آتی۔

ہوا یوں کہ ایک مدت گزری ایک محفل میں اسی قسم کی بحث چھڑ گئی۔ میں اس وقت فوج میں سپاہی تھا اور مجھ پر یعنی میری روح پر حملہ کرنے والے کافی پڑھے لکھے اور اپنے آپ کو بڑا لکھاری سمجھتے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا اور اردو میں عسکری خدمات اور اردو کی بنیاد میں عسکری روح کو بالکل رد کر دیا۔ میں محمد بن قاسم اور سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ لہذا آج جب تھوڑا بہت مطالعہ کیا تو یہ جواب دے رہا ہوں۔ تاکہ اگر کوئی اور شخص میرے کسی عسکری بھائی پر اس جانب سے حملہ آور ہو تو وہ دفاع کر سکے۔ بہرحال ۰۰۰ وہ وقت گزر گیا۔ ایک عرصہ بیت گیا۔ اب میں اس بات کو پھر آگے بڑھاتے ہوئے "اردو" پر کچھ مزید روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

اردو جو نئی زبان کی صورت میں ابھری تھی پورے برصغیر کی زبان تھی لیکن آج برصغیر کے لوگ اسے صرف اس علاقے کے مسلمانوں کی زبان گردان رہے ہیں۔ اس خطے کے مختلف ممالک مثلاً برما (جہاں اسے مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے اور حلقۂ احمر جیسے اردو ادبی ادارے مسلمانوں ہی کے دم سے قائم ہیں) سری لنکا (یہاں اردو کم کم بولی جاتی ہے اور وہ بھی مسلمانوں میں) اور بھارت (جہاں اسے مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس کے ساتھ سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا جاتا ہے) میں یہ زبان صرف مسلمانوں کے دم سے قائم ہے۔ لیکن بدقسمتی کی انتہا ہے کہ رابطے کی یہ زبان بنگلہ دیش میں صرف بہاری مسلمانوں کی زبان سمجھی جا رہی ہے جنہیں وہ لوگ پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستان میں اسے صرف پنجابیوں اور مہاجروں کی زبان کہا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آج تک یہ دفتری زبان کا مقام بھی نہیں پا سکی

اور ہم لوگ غلامی کے اس دور سے آج بھی نہیں نکل سکے جب انگریز ہم پر حاکم تھا۔ آج بھی ہم انگریزی زبان کو اپنی زبان پر فوقیت دیتے ہیں۔

آیئے مختصراً دیکھتے ہیں کہ اردو (لشکری) زبان کیسے عالم وجود میں آئی۔ ابھی تک میں نے جو حوالے دیئے ان سے نکھر کر جو بات سامنے آتی ہے یہی ہے کہ محمد بن قاسم یا اس کے لشکری، سلطان محمود غزنوی یا اس کے لشکری، تیمور یا اس کے لشکری یا جو بھی نام آئے ان تمام کا تعلق فوج سے تھا، ہمیں ایسے حوالے بھی تاریخ سے ملتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں کچھ فوجی دستے موجودہ پاکستان میں داخل ہوئے۔ اور مکران میں اسلامی حکومت کی داغ بیل رکھی۔ غالباً یہ ساتویں صدی عیسوی کا نصف دور تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تاجر بھی ہندوستان میں آتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ لیکن ان کا رابطہ محدود لوگوں سے تھا۔ جو دستے دورِ فاروقی میں یہاں آئے ان کا رابطہ مختلف لوگوں سے ہوا اور انہوں نے یہاں عربی کے کچھ الفاظ چھوڑے۔ پھر یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت کسی نہ کسی لیول تک جاری رہا اور جب ولید بن عبدالملک کے دور میں محمد بن قاسم کی زیرِ کمان ایک لشکر دیبل کے راستے اس علاقے میں داخل ہوا تو کچھ ہی عرصے میں سندھ سے ہوتے ہوئے پنجاب کے کچھ علاقے بھی اس کی زد میں آگئے۔ جس کا اثر یہاں مقامی زبانوں پر ہوا اور یہاں عربی زبان اور مقامی زبانوں نے مل کر نئے لہجے اور نئے طرزِ زبان کو جنم دیا۔

بات آگے بڑھتی رہی ۔۔۔ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے نئی زبان کے وجود میں مد ثابت ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی اپنی فوج کے ہمراہ سترہ بار افغان علاقے سے خیبر کے راستے برصغیر پر حملہ آور ہوا۔ اس فوج میں زیادہ تر افغان، خلجی اور ترک جوان شامل تھے۔ یوں فارسی اور ترکی زبانوں کی آمیزش مقامی زبانوں کے لہجے کو بدل کر اور اپنے الفاظ بھی شامل کر کے انہیں نئی جہت کی طرف موڑ لے گئی۔ اب عربی اور فارسی یہاں کثرت سے بولی اور سمجھی جانے لگی اور پھر اس اختلاط نے ایک نئی زبان کو جنم دیا حتیٰ کہ اس نئی زبان کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر مسعود سعد سلیمان (وفات ۱۱۲۱ء) جسے شیرانی اور ڈاکٹر اسپرنگر وغیرہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی یا اس کے بیٹے کی فوج میں ہی شامل تھا۔

یہ یاد رہے کہ جس محقق نے بھی اردو کی تحقیق کی ہے اس نے مسعود سعد سلیمان کو ہی اردو کا پہلا شاعر لکھا ہے۔

جب مسلمانوں کی حکومتیں برصغیر میں بننا شروع ہوئیں تو فوج میں مقامی لوگوں کو بھی بھرتی کیا گیا اور یوں مسلمان فوجیوں اور علاقائی فوجیوں کے سماجی میل جول سے اس زبان کو بہت مدد ملی۔ چونکہ

ابھی تک اس زبان کو کوئی مخصوص نام نہیں دیا جا سکا تھا۔ لہذا یہ زبان مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے پہچانی جاتی رہی۔ اس کے بے نام ہونے کی وجہ سے اسے ہندی، ہندوی، ریختہ، برج بھاشا، پنجابی، دکھنی، گجراتی، مالوی غرضیکہ اپنے اپنے علاقوں کی نسبت سے بھی نام دیئے گئے۔ لیکن اس کی سرپرستی ہمیشہ حکمران کرتے رہے اور یہ حکمران اپنی افواج کے سالارِ اعلیٰ ہوتے تھے تو میدانِ جنگ میں کماندار بھی ہوتے تھے۔ اس لیے اردو کی جب بات ہوتی ہے تو ان سپہ سالاروں کے ساتھ بے شمار سپاہیوں اور عہدے داروں کے نام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت امیر خسرو، بابر، شاہ جہان، سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، سلطان عبداللہ قطب شاہ، تانا شاہ، ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ، شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، مرزا دارا بخت، بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ اختر، شیخ طالب علی طلب، مرزا فرخ علی فرخ، حسن علی شوق، خداوردی ظریف، مرزا مسیح اللہ بیگ، شیخ محمد نعیم دہلوی، میاں حاجی تجلی، شمس الدین سوزاں، عظمت اللہ، مرزا غفور اندوہ، امام الدین مظلوم، ناصر جنگ امیر، مرزا اسعد بخت، احمد بیگ قزلباش، ابوالمظفر مجاہدین شاہ، نواب یحیٰی خان آصف الدولہ، مرزا جواں بخت جہاندار، رضی خان صلابت جنگ، محمود بیگ شور، غالب جنگ بینا، مرزا کالے آرزو، جرار الدولہ حاجی آشفتہ، نواب محمود علی خان، مظفر علی اسیر، اقبال یار جنگ، محمد اسحاق انجام، بھورے خان آشفتہ، قلی خان شاہی، میر یحییٰ عاشق علی خان، میر احمد خان ناصر جنگ شہید، عارف الدین عاجز، صمصام الدولہ عاجز، شاہ محمد اعظم، مکرم الدولہ خان مستقیم جنگ، میر حمزہ علی رند، میر احسن شیون، میر امیر فرحت دہلوی، مرزا محمد حیدر آبادی، مرزا محمد اسماعیل امین، مرزا مجھو بیگ بسمل، بہادر علی میر، عوض علی تنہا، محتشم علی خان حشمت، غلام حیدر بیگ خاکی، خواجہ میر درد، سبحان قلی بیگ راغب، سعادت یار خان رنگین، بہادر بیگ خان زار، سلطان قلی بیگ، مرزا سودا، یادگار علی سید، محمد عیسیٰ تنہا، محمد بخش شوق، میرزا ابو طالب، شیخ غلام بنگالی عشرت، محمد عظیم شاہ جھولن، سید محمد علی فدا، مرزا قاصد دہلوی، غلام حیدر مجذوب، میر محسن، الہیٰ بخش معروف، نثار اکبر آبادی، ولایت دہلوی، عبدالوہاب یکرو، مرزا جان طپش، شاکر ناجی، فاضل بٹالوی اور ایسے ہی بے شمار نام گنے جاسکتے ہیں، جنہوں نے اردو ادب میں فوج میں رہتے ہوئے بڑا نام کمایا۔

یہ چند نام ان ہزاروں صاحبانِ سیف و قلم میں سے حوالے کے طور پر دیئے ہیں۔ اس بحث کو میں پھر کسی وقت کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔ زندگی ہوئی تو انشاء اللہ اس موضوع پر تفصیلاً قلم اٹھاؤں گا۔ فی الحال آپ جب عساکرِ پاکستان یا پاکستان میں فوجی لکھاریوں کے بارے پڑھیں گے تو آپ کو میرا دعویٰ خود بخود حقیقت دکھائی دے گا۔ البتہ! مجھے امید ہے کہ اوپر دیئے گئے پیرے سے معترضین کی ایک غلط فہمی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں دور ہو گئی ہو گی۔ اور ناقدین یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ فوج نے

اردو زبان کو جنم دیا۔ اسے پروان چڑھایا اور اسے ایک زبان سمجھتے ہوئے اس کی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

۴۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی پھر پہلی اور دوسری عالمی جنگ سے بات نکلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ کیونکہ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں حصہ لینے والے وہ عسکری جنہوں نے بعد میں اپنے لیے پاکستان کا انتخاب کیا۔ وہ (جن کے بارے مجھے علم ہو سکا) کتاب میں شامل ہیں۔ اب ہم داخل ہوتے ہیں پاکستان میں اردو اور فوج کے تعلقاتی دور میں۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ افواجِ پاکستان مرکزی حکومت کے ماتحت ہیں۔ جس میں ملک کے چاروں صوبوں کو نمائندگی حاصل ہے اور اس میں ملک کے دور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ پھر فوج کو ملک کے کسی بھی حصے میں ذمہ داریاں سونپی جا سکتی ہیں۔ اس ادارے کی افرادی قوت بھی باقی اداروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ فوج کو تربیت اردو زبان میں دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اردو نہ جانتا ہو خواہ وہ افسر ہی کیوں نہ ہو اسے اردو زبان کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے، جو ضروری ہے۔ فوج میں ہر شخص اس قومی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتا ہے۔ جب مقابلے میں بنگالی زبان ہوا کرتی تھی تب بھی فوج میں رابطے کی زبان اردو ہی تھی۔ بنگالیوں کے لیے بھی ضروری تھا کہ اردو لکھیں پڑھیں اور بولیں۔ علاقائی زبان یا مادری زبان میں بات کرنا ایک حد تک ممنوع ہے۔ پھر یہ بولی بھی کم ہی جاتی ہے یعنی کہ صرف اپنے علاقے کے لوگوں سے اپنی علاقائی زبان میں بات چیت کی جاتی ہے۔ ورنہ ایکدوسرے کی بات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اردو ہی ذریعۂ اظہار ہے۔ یہاں ایک اور شے جو اردو کے فروغ میں معاون ثابت ہوتی ہے وہ علاقائی لہجہ اور وہ الفاظ ہیں جو بار بار بولے جانے سے اردو میں شامل ہو جاتے ہیں اور آج میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ الفاظ جو کل ایک فوجی سپاہی گاؤں میں آکر بولا کرتا تھا یا گاؤں سے اپنے ساتھ لے جا کر فوج کی اردو میں شامل کیا کرتا تھا اور اسے لوگ گلابی اردو کہہ کر مذاق اڑایا کرتے تھے، اردو کے تخلیقی ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہاں میں ایسے الفاظ کی فہرست پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اگر آپ مختلف علاقوں میں تخلیق ہونے والے جدید اردو ادب کو دیکھیں تو آپ کو بے شمار ایسے الفاظ ملیں گے جو علاقائی زبانوں سے اردو میں ضم ہوئے ہیں۔

۵۔ تشکیلِ پاکستان بلکہ تحریکِ پاکستان کے آخری سالوں سے لے کر آج تک جو ادب تخلیق ہوا ہے اس میں عساکر کی علمی و ادبی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ فوجی لکھاریوں نے اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی بھی بہت خدمت کی (اردو ادب یہ چونکہ بات ہو رہی ہے اس لیے میں اردو ادب کے حوالے دے رہا ہوں۔ وگرنہ انگریزی ادب اور علاقائی ادب میں بھی بے شمار کتب ہماری

لائبریریوں میں موجود ہیں۔ جو ان بادر دی حضرات نے شب و روز کی محنت شاقہ سے اپنے خون جگر سے تحریر کیں) اور اپنے ارد گرد تیزی سے بدلتے حالات کا ہر طرح سے ساتھ دیا ہے۔ بلکہ افسانی ادب تخلیق کیا ہے۔ جو صرف انہی کا خاصا تھا۔ یہاں شاید کچھ حضرات افسانی ادب کے نام پر بپھر چکے ہیں جنہیں ہوں۔ تو اطلاعاً عرض ہے کہ افسانی ادب میں کئی اصناف یا پہلو شامل ہیں وہ ادب جو بریگیڈیئر گلزار اور جنرل اکبر خان رنگروٹ وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو کیپٹن پوشنی اور کرنل مرزا حسن وغیرہ کے قلم سے نکلا۔ وہ اب جو کرنل محمد خان اور جنرل شفیق وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو حوالدار رحیم گل اور کیپٹن ادریس وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو حوالدار عبدالرحیم خاکی اور سپاہی سید عبداللہ شاہ وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو کرنل صولت رضا اور کرنل اشفاق وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو صوبیدار خلش ہمدانی اور بریگیڈیئر صدیق سالک وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو صوبیدار میجر شفیع ضامن اور کرنل غلام جیلانی وغیرہ نے منتقل کیا۔ وہ ادب جو میجر امیر افضل اور کرنل مختار گیلانی وغیرہ نے تخلیق کیا۔ وہ ادب جو لانس نائیک شاہ سوار علی ناصر اور کیپٹن احسان دانش وغیرہ نے تخلیق کیا۔ ہر نام کے ساتھ وغیرہ استعمال کرنے سے میرا مطلب وہ بے شمار نام ہیں جن کو یہاں گنوانا میں بے وجہ طول کے مترادف سمجھتا ہوں۔ یہ سارے نام درجہ بدرجہ سامنے آتے جائیں گے اور جن افسانی اصنافِ ادب کا تذکرہ میں نے کیا ہے وہ بھی آپ دیکھ پائیں گے۔ ایسا ادب فوجی لکھاریوں کے علاوہ بہت کم لکھنے والوں نے پیش کیا ہے ایک کتاب میں تو وہ سب کا سب جمع کرنا ناممکن ہے۔ لیکن آپ ان حضرات کی کتب کے مطالعہ سے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ اس ادب میں کیا خوبی ہے جو اپنے ہم عصروں سے ان شخصیات کو منفرد ٹھہراتا ہے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

۶۔ بات سے بات نکلتی رہی اور بڑھتی رہی اب میں کچھ شکائتیں، کچھ معذرتیں، کچھ گزارشات اور کچھ اپنی باتیں کرنا چاہوں گا۔

الف۔ شکایات ان صاحبانِ سیف و قلم سے جن سے میں نے مختلف ذرائع سے رابطے قائم کئے فارم بھیج کر، خطوط لکھ کر، اشتہارات اور پیغامات کے ذریعے اور خود در پر حاضری دے کر۔ لیکن ان کی جانب سے کوئی ریسپانس نہ ملا۔ تو یوں انکی کنجوسی سے میں اردو ادب کا ایک اچھا ذخیرہ جمع کرنے سے محروم رہا۔

ب۔ معذرتیں ان حضرات سے جن کے پرانے عہدے بامر مجبوری مجھے ان کے ناموں کے ساتھ لکھنے پڑے یا احباب کے بتائے ہوئے عہدے تحریر کرنے پڑے۔ جن میں تبادلہ

بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی ہو سکتے ہیں ۔ ممکن ہے ان میں سے کئی صاحبان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوں یا رتبے پا کر ریٹائر ہو چکے ہوں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ قارئین مجھے میری خامیوں سے ضرور آگاہ کریں اور ایسی غلطیوں کی ضرور نشاندہی کریں جو کسی کے تعارف یا کلام میں سرزد ہوئی ہوں۔ تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ترامیم شائع کر سکوں۔

ج۔ گزارشات ان دوستوں سے جن کا تعلق اردو ادب اور فوج سے ہے یا رہا ہے۔ لیکن میری کم علمی کے باعث ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔ انہیں چاہئے کہ تعارف و تحریر سے ضرور نوازیں۔ یا قارئین کرام اگر ایسے اشخاص کو جانتے ہوں تو ان سے درخواست ہے کہ وہ ضرور مجھے آگاہ کریں۔

د۔ شکریہ ان دوستوں کا جنہوں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور مجھے اپنی تحریروں اور تعارف سے نوازا۔ خاص طور پر میں سید ضمیر جعفریؒ صاحب کا بہت ممنون ہوں جنہوں نے اپنے مصروف اور قیمتی وقت سے چند لمحے نکال کر "اردو ادب اور عساکر پاکستان" پر ایک جامع اور بھرپور تبصرہ لکھا اور جناب لطیف پریشان کا ان کی بھرپور مدد پر شکر گزار ہوں۔

ر۔ اپنی باتیں جو مجھے کہنی ہیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں:۔

(۱)۔ میرے خیال میں صاحبانِ سیف و قلم پر اس سے پہلے کوئی تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ یہ اس موضوع پر پہلی کاوش ہے۔ میں نے اس نازک سلسلے کو ایک فرض سمجھ کر چھیڑا ہے۔ خدا کرے کہ میں اس فرض کو باحسن ادا کر سکوں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ناقدین کی کچھ غلط فہمیاں دور ہونگی اور تنقید کے لیے کچھ مواد بھی فراہم ہو گا۔ پاکستان میں ایسے افراد کی کوئی کمی نہیں جنہوں نے قلم اور تلوار کو ساتھ ساتھ استعمال کیا اور ان دونوں کے وقار کو بحال رکھا۔ مجھے اس وقت بڑا دکھ ہوتا ہے جب لوگ فوجیؒ حضرات کو ادب سے نابلد سمجھتے ہوئے "منہ موڑتے" ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ فوج کا قانون اور ڈسپلن صرف ادب ہی تو سکھاتا ہے۔ انشاء اللہ اس سلسلے میں ہزاروں نام پیش کروں گا۔ جنہوں نے سیف و قلم دونوں کی عزت، عظمت اور حرمت قائم رکھی۔

(۲)۔ انتخاب میں میری کوشش رہی ہے کہ معیاری ہو، تہذیب کے دائرے میں۔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو۔ ہو سکے تو اسلامی ہو اور مثبت ہو۔ اور امید ہے کہ آپ ایسا ہی پائیں گے۔ البتہ جہاں میں بہت مجبور ہو گیا ہوں وہاں شاید وہ معیار برقرار نہ رہا ہو۔

(۳)۔ جیسے کہ آپ لوگوں کو علم ہے کہ تذکرے نہ حالات اور نہ ہی سوانح ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی مکمل تنقید یا تبصرہ ہوتے ہیں اور نہ ہی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔ بس نام، تخلص، مختصر سے حالات زندگی، چند الفاظ تنقید و تبصرہ کے اور آخر میں نمونۂ تخلیق۔ یہ سب کچھ کسی بڑے پیمانے پر کام کرنے والے کے لیے ایک گائیڈ لائن یعنی کہ رہنمائی ہو سکتی ہے یا تذکرے میں شامل افراد کی کارکردگی کا کسی مؤلف سے ہدیۂ خلوص ہو سکتا ہے۔ مزید کچھ نہیں۔ ان تخلیق کاروں میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جن سے عدم واقفیت اور بغیر کسی تعلق کے کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔

(۴)۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ جو لوگ فوجی حضرات کو صرف عسکری زندگی تک محدود سمجھتے ہیں۔ یا جو انہیں خشک مزاج سمجھتے ہیں۔ یا جن کے ذہنوں میں یہ بات سمائی ہے کہ بڑے بوٹ پہننے والے علم و حکمت کی باتیں نہیں جانتے وہ جان سکیں کہ یہ صرف اہلِ سنگ ہی نہیں اہلِ دل بھی ہیں۔ یہ لوگ جو دشمن کے لیے موت اور سیسہ پلائی دیوار ہیں، اپنوں کے لیے زندگی اور ریشم کی طرح نرم ہیں۔ بقول حضرت علامہ اقبالؒ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

علاوہ ازیں غلط سوچ رکھنے والے ذہن تھوڑی سی جگہ اس مثبت پہلو کو بھی دیں کہ فوج میں تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ بلکہ تربیت اور علم کے حصول سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ہر لمحہ پڑھائی اور لکھائی کی نذر ہوتا ہے۔ نئے نئے زاویے نئی نئی چیزیں اور علم و حکمت کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور پھر جیسے کہتے ہیں ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تلوار سے قلم کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ملکوں کی فتوحات اور انتظامات میں یہ دونوں ہتھیار پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں اور کامیابی کی راہیں آسان کرتے ہیں۔

(۵)۔ "اردو ادب اور عساکرِ پاکستان" شاید چند سال پہلے چھپ کر آپ کے ہاتھوں میں ہوتی۔ لیکن میں نے کوشش کی کہ سرکاری اوقات اور مصروفیات میں اس کام کو مخل نہ ہونے دیا جائے۔ گو کہ میری نگاہ میں یہ دونوں فرائض ہی تھے، مگر ان کی اہمیت میں تھوڑا فرق تھا۔ جو اوقاتِ کار کے باعث تھا۔ اس لیے میں نے دونوں فرائض کو ان کے اپنے اوقات میں سے وقت دیا۔ لہٰذا اس کتاب کی ترتیب و تحریر میں زیادہ تر میرے

"جگراتے" شامل ہیں۔ جو انشاء اللہ اس کی مقبولیت اور اہمیت کا حصہ بنیں گے۔ پھر تاخیر کی وجہ کچھ قانونی موشگافیاں، پبلشرز کی بے حسی اور تنگ نظری، میری ذاتی حیثیت و استطاعت بھی بنی۔

(۶)۔اس کتاب میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں ہیں۔ جو میرے انسان ہونے کا ثبوت ہیں۔ ترتیب میں بھی کمی رہ گئی ہوگی۔ میری معلومات، کم علمی اور کم فہمی بھی ان کا سبب بنی ہیں۔ زبان بھی مسجع اور مرصع نہیں۔ لہجہ بھی دلنشیں نہیں ہوگا۔ گرائمر اور اُسلوب میں کوتاہی ہوگی وہ روانی اور تسلسل جو ایک اچھی تحریر کا خاصا ہے وہ بھی ناپید ہے۔ کہیں سلسلہ اکھڑا اکھڑا کہیں دقیق الفاظ اور کہیں بہت سادہ انداز یہ سب تحریر کی روانی میں رکاوٹ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ناقدین کو مواد مہیا کریں گی۔ جس میں میری اصلاح ہونے کی توقع ہے۔ تو! اس سلسلے میں اپنی کوتاہیِ تحریر کے حوالے سے نقادانِ فن سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خامیوں اور غلطیوں سے آگاہ فرمانے کے لیے مجھے مثبت تنقید کا نشانہ ضرور بنائیں گے۔ (ممکن ہے یہ میری خوش فہمی ہو اور وہ حضرات ایسی بکھری بکھری اور اُلجھی اُلجھی تحریر کو پڑھنا بھی گوارہ نہ کریں) تاکہ اس کی روشنی میں اس راستے کا تعین کر سکوں۔ لیکن اگر بے وجہ، بے سود بلکہ صرف تنقیص ہی کریں گے تو ان کا حق ہے۔ بے شک جتنا چاہیں لکھیں لیکن ان کی بے جا قلم ماری کا انشاء اللہ مجھ پر یا اس کتاب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

میرے شعری مجموعے "آشوبِ زیست" کی تقریب رونمائی پر جناب فاروق روکھڑی نے یہ شعر پڑھا تھا۔ لہٰذا میں بھی اسی پر اپنی ان باتوں کو ختم کرنا چاہوں گا۔ ؎

تم اپنی بات کرتے ہو یہاں تو میں نے دیکھا ہے
خدا کی ذات پر بے رحم سی تنقید ہوتی ہے

(نعوذ باللہ۔ میں یہ شعر لکھتے ہوئے کانپ رہا ہوں۔ لیکن آپ اتفاق کریں گے کہ ہم لوگ اکثر اس کی ذاتِ پاک پر تنقید کرتے رہتے ہیں)

شاکر کنڈان

شاکر کنڈان
موضع کنڈان کلاں،
تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا

جنرل خالد محمود عارف

"میری اُردو شاعری کی ابتدا ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ اس وقت میری عمر چالیس سال تھی۔ شعر کے تصور نے مجھے ایک اندرونی بحث میں اُلجھا دیا۔ دو خیال دل میں اُبھرنے لگے" یہ دونوں خیال "ایک شاعر اور ایک سپاہی" تھے۔ جو آپس میں سمجھوتہ نہیں کر پا رہے تھے اور بالآخر "کشمکش کی یہ کیفیت جلد ہی اختتام کو پہنچی۔ فیصلہ ہوا کہ شعر تو کہے جائیں لیکن خاموشی کے ساتھ اور فرصت کے لمحات میں۔ یہ بھی طے پایا کہ فی الحال کلام کی اشاعت پر پابندی رہے گی۔ گاڑی چلنے لگی۔ شاعری کی ابتدا ہو گئی۔ اس عرصے میں مجھے فوجی رنگ و روپ میں تو دیکھا گیا لیکن شعر و ادب کے میدان میں میری حیثیت ایک گمنام سپاہی کی رہی"۔

یہ تھے جنرل کے۔ایم عارف کے الفاظ اپنی شاعری کے بارے میں اور واقعی جب "گردِ سفر" شائع ہو کر ادبی محفلوں میں پہنچی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک ایسا جرنیل جس کی زبان سے کبھی شاعری کی بات تک نہیں سنی گئی اتنا عمدہ شاعر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ اور الزامات بھی تراشے گئے۔ لیکن جب "ریگِ دریا" منظر عام پر آئی تو لوگوں کو کچھ کچھ یقین سا ہو گیا۔

کارزارِ جیش و شاعری کا یہ سپاہی ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء کو مالاکنڈ میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد کا نام شیخ اکبر حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم سرکی گیٹ پرائمری سکول پشاور سے حاصل کی۔ ورنیکلر بورڈ کا امتحان ۱۹۴۴ء میں اپنے آبائی گاؤں بٹالہ ضلع گورداسپور سے پاس کیا۔ اور آٹھ روپے وظیفہ پایا۔ میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ایڈورڈز کالج پشاور میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال آزادی کے حق میں جلوس نکالنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور جیل یاترا کی۔

آپ ابھی دسویں جماعت کے طالب علم تھے کہ افسانہ نویسی کا شوق پیدا ہوا۔ کالج کے زمانے میں یہ شوق جاری رہا۔ انگریزی زبان میں شاعری بھی کی جو کالج میگزین میں چھپتی رہی۔ ۱۹۴۹ء میں او ٹی ایس سے آرمرڈ کور میں کمشن حاصل کیا اور ترقی کرتے کرتے وائس چیف آف دی آرمی سٹاف کے عہدے پر پہنچے۔

ملازمت کے دوران تعلیمی سفر بھی جاری رہا۔ اور قائداعظم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ادبی تعلق ۱۹۷۰ء تک منقطع رہا لیکن جراثیم ذہن میں موجود تھے۔ انہوں نے اپنا اثر دکھایا اور آپ پھر اس بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ○○○

دوراہا

اس نے کہا کہ زیست کا ساماں چاہیے
میں نے کہا کہ تندیٔ طوفان چاہیے

اس نے کہا، کہ درد کو دیکھیں تو کس طرح
میں نے کہا، کہ دیدۂ انسان چاہیے

اس نے کہا، کہ حشر کے طوفاں سے کوئی بات
میں نے کہا، سفر ہے تو سامان چاہیے

اس نے کہا، کہ کون سی دولت عزیز ہے
میں نے کہا، کہ دولتِ ایمان چاہیے

اس نے کہا، زمانہ زمستاں کی برف ہے
میں نے کہا، کہ خون میں ہیجان چاہیے

اس نے کہا، کہ جنگ میں نصرت ثبات ہے
میں نے کہا، خدا پہ بھی ایمان چاہیے

اس نے کہا، کہ علم ہو کس طرح سُود مند
میں نے کہا، کہ گُن میں ذرا گیان چاہیے

عارفؔ نے پوچھا کون سا شاعر پسند ہے
بولے، ہمیں تو آپ کا دیوان چاہیے

آنسوؤں سے بات کرنے کا سماں بھی دیکھیے
چشمِ ساکن میں ذرا ابرِ رواں بھی دیکھیے

زندگی آتش بداماں بادلوں کا کھیل ہے
پھول دیکھے ہیں تو خاکِ آشیاں بھی دیکھیے

لالہ و گل کے سراب اور وہ بھی تا حدِ چمن
درد سے پامال غمگیں وادیاں بھی دیکھیے

روح کو رنگوں کی اک برسات کا موسم ملے
ان کو جب بھی دیکھیے ان کو جہاں بھی دیکھیے

عاشقوں کی منزلیں عارفؔ کبھی آساں نہ تھیں
چلتے چلتے ان کا رقصِ جسم و جاں بھی دیکھیے

لیفٹننٹ جنرل محمودالحسن

لیفٹننٹ جنرل محمودالحسن ۱۷ جولائی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا ادبی ذوق رکھتے تھے اور فارسی کے فاضل تھے۔ جن کی گود میں بیٹھ کر آپ نے ادبی رموز سیکھے اور فارسی پڑھی۔ جب تعلیمی میدان میں اترے تو باوجود اس کے کہ آپ کو آرٹ سے لگاؤ تھا، سائنس کی تعلیم دلائی گئی۔ آپ نے ہر امتحان عمدہ نمبروں سے پاس کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کچھ بننے اور کرنے کے لیے ایک شخص میں ہونی چاہئیں۔ پنجاب سے آپ نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا اور ڈاکٹر بن گئے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ء کو آپ نے آرمی میڈیکل کور میں کمیشن پایا۔ بعد میں وقتاً فوقتاً کئی ایک پیشہ ورانہ کورسز کئے، FRCS, MS, FCPS وغیرہ امتحانات پاس کئے اور ایک کامیاب سرجن کی حیثیت سے وقت گزارا۔ طویل عرصے تک فوج میں خدمات انجام دینے کے بعد سرجن جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اپنی پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ فوج نے آپ کو اعلیٰ خدمات کے صلے میں ہلالِ امتیاز (ملٹری) اور ستارۂ بسالت سے بھی نوازا۔

ادبی ذوق بچپن میں دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے تو شعر موزوں کرنے لگے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو رسائل اور اخبارات میں اپنا نام دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور آپ محمود ایمن آبادی کے ادبی نام سے روزنامہ "احسان"، روزنامہ "شہباز"، ہفت روزہ "خیام" اور "حمایت الاسلام" میں چھپنے لگے۔

جناب محمودالحسن نے ڈاکٹر بن کر اپنے پیشے، عسکری فرائض اور شاعری تینوں کے ساتھ انصاف کیا۔ خدا جانے آپ نے جدول کیسے ترتیب دے رکھا تھا۔ آپ نے جہاں ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم جاری رکھی۔ وہاں ترقی کے منازل بھی طے کئے اور شاعری کے سفر میں بھی اسی رفتار سے چلے۔ ایک طرف آپ کے نشتر میں زندگی کا پیغام ہے تو دوسری طرف آپ کے کلام میں دلنواز سلاست کے ساتھ مکارمِ اخلاق کی روشنی اور حبُ الوطنی کی چاندنی دکھائی دیتی ہے۔ فارسی کی چاشنی اس میں مزید لذت پیدا کرتی ہے۔ آپ کی شاعری کا بنیادی موضوع انسان اور کائنات ہے۔ آپ کے خیالات میں پاکیزگی وطہارت بھرپور طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آپ کے کئی مجموعہ ہائے کلام چھپ کر ادبی حلقوں سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ○○○

عرب کا چاندؐ

جس وقت نمودار ہوا چاندؐ عرب کا
باقی نہ رہا نام بھی تاریکیِ شب کا

یہ عین حقیقت ہے وہؐ سردار ہے سب کا
آدمؑ ہو کہ داؤدؑ ہو موسیٰؑ ہو کہ عیسیٰؑ

اللہ کا ہے فیض یہ انعام ہے رب کا
اُمّی تھا مگر سارے زمانے کا معلّم

نازاں تھا فقیری پہ شہنشاہؐ عرب کا
یہ فقر بھی دیکھا ہے زمانے میں کسی نے

محمودؔ پہ بھی ایک نظر شافعِؐ عالم
اب تیرے سوا کون ہے اس جان بلب کا

غزل

رند تو رند ہیں پی پی کے کئی بار گرے
جانے کیوں شیخ بایں جبہ و دستار گرے

اُس کو زنجیرِ شبِ غم سے رہائی نہ ملی
جس پہ اک بار ترے گیسوئے خمدار گرے

ہم تو برسائیں گے گلہائے محبت! شاید
ہو کے شرمندہ ترے ہاتھ سے تلوار گرے

آہِ مظلوم سے ہیں عرش کے پائے لرزاں
شاید اب قصرِ ستم کی کوئی دیوار گرے

بھولنے والوں کو بخشش کی نوید آئی ہے
سجدۂ سہو میں اب کیوں نہ گنہگار گرے

لاکھ دشوار سہی راہِ محبت محمودؔ
اب تو بالکل سرِ منزل ہو، خبردار، گرے

میجر جنرل عسکری رضا ملک

عسکری رضا ملک اگر شاعر نہ بھی ہوتے تو اس نام میں ایک ایسا اَدبی پن ہے کہ اس نام کو سننے یا پڑھنے والا ہر شخص انہیں شاعر اور ادیب ہی سمجھتا۔ جب غور سے دیکھا جائے تو عسکری میں سے جہاں عسکریت جھلکتی ہے وہاں اس لفظ میں سے ایک نثر نگار بھی جھانکتا ہوا ملتا ہے۔ اور جب رضا کے لفظ کو ادا کریں تو اس میں سے ایک شاعر کی شبیہہ نظر آتی ہے۔ اور جب عسکری رضا ملک پورا نام لیا جائے تو ایک بھرپور نثر نگار اور شاعر کا گمان ہوتا ہے۔

میں ایک مدت سے وقفے وقفے کے بعد پروفیشنل اور اَدبی رسائل میں یہ نام پڑھ رہا ہوں۔ پہلی دفعہ یہ نام کیپٹن کے سابقہ کے ساتھ میری نظر سے گزرا تھا اور پھر میجر، کرنل، بریگیڈیئر یعنی سابقے تبدیل ہوتے رہے۔ آپ شاعری کے علاوہ انگریزی اور اردو میں ہلکے پھلکے مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔

عسکری رضا ملک یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۶۵ء کو آپ نے آرمی سپلائی کور میں کمیشن پایا۔ چند ہی ماہ بعد آپ کو دشمن سے سامنا کرنا پڑا۔ اس ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں آپ زندگی کے ایک نئے تجربے سے گزرے جس کی آپ کو اکیڈمی میں سخت تربیت دی گئی تھی۔ عسکری زندگی کی ایسی ابتدائی سچوایشن نے آپ کے لئے مستقبل کی راہیں کافی آسان کر دیں۔ جس سے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں آپ کو سپلائی کے سلسلے میں اور خدمات کی بحالی میں بڑی مدد ملی۔

میجر جنرل عسکری رضا ملک ایک پروفیشنل شخصیت ہیں۔ شعر وادب کا یہ شغف اضافی ہے۔ آپ نے اپنی سروس کے دوران آرمی اور انٹر سروسز کے تقریباً ایک درجن کورسز کئے اور بہت اچھے ریزلٹ لئے جن میں کمانڈ اینڈ سٹاف اور آرمڈ فورسز وار کورس بھی شامل ہیں۔ اور یہ آپ کے مکمل عسکری ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ شعر وادب آپ کا اضافی شغف ہے۔ شاعری میں آپ نے زیادہ تر غزل کہی ہے۔ جو سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ روایتی اور اپنے اندر محرومی اور ناداری کا ایک احساس لئے ہے۔ یہ محرومی و ناداری میرے خیال میں ان کی انفرادی نہیں بلکہ گردوپیش کی ایک تصویر ہے۔ جو آپ حساس ہونے کی وجہ سے اکثر دیکھتے اور انہیں خوبصورت لفظوں کی صورت میں قاری کے ذہن تک پہنچاتے ہیں۔ ○○○

غزل

رسمِ وفا سمجھتے رہے ہیں جفا کو ہم
کیا بے وفا پکارتے اس بے وفا کو ہم

ہر رہگزر پہ یاس کی صورت بنی ہوئی
حسرت سے دیکھتے ہیں ترے نقشِ پا کو ہم

سوچوں کی بھول تھی کہ حقیقت کی جستجو
اصلِ حیات سمجھے تھے تیری صدا کو ہم

رُخ خانۂ خدا سے ترے گھر کو ہو گیا
بھولے ہیں تیری یاد میں یادِ خدا کو ہم

جذبوں کا پائمال ہوا دیکھتے رہے
اس کے ستم کو دیکھتے یا اس بلا کو ہم

منت تمہارے دل کی تو پوری نہ ہو سکی
رسماً تمام کرتے ہیں اب ہر دعا کو ہم

اک عام سا نظارہ تھا بے حال کر گیا
آئینہ دیکھتے ہیں کہ دستِ گدا کو ہم

کیا منزلیں نصیب میں ہوتیں مرے رضاؔ
منزل ہی جان بیٹھے تھے اک ناخدا کو ہم

یاد تیری دل کی محفل میں سجا لیتا ہوں میں
چار آنسو ہی سہی اکثر بہا لیتا ہوں میں

ان کی الفت میں سلیقہ زندگی کا پا لیا
کوئی بھی غم ہو غمِ جاناں بنا لیتا ہوں میں

دور ان سے کیا کرے گی بندشِ زنداں مجھے
دل کا دھڑکن میں پیامِ یار پا لیتا ہوں میں

ذکرِ غم بھی ہوں میں کچھ کشتۂ تقدیر بھی
جو بھی غم ہو بڑھ کے سینے سے لگا لیتا ہوں میں

موسمِ گل میں بھی اکثر میری وضع سے نمی
آنکھ کے آنسو میں خونِ دل ملا لیتا ہوں میں

آج تک یوں تو وفائے حُسن سے محروم ہوں
ہر نئی صورت کو پھر بھی آزما لیتا ہوں میں

جب متاعِ درد ہو کم اس دلِ ویران میں
تیری یادوں کے دیئے پھر سے جلا لیتا ہوں میں

تیرگیِ ہجر کے سایوں سے بھی سرخوش رہا
ہر روش پہ عکسِ زلفِ یار پا لیتا ہوں میں

میں سخنور ہوں نہ شاعر مدعا ہے ذکرِ یار
دوستوں میں داستانِ غم سنا لیتا ہوں میں

خوب چرچا ہو گیا وحشت کا اپنی اے رضا
شہر کے ہر چاک دامن کی دعا لیتا ہوں میں

بریگیڈیئر منظور احمد غوری

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء کا سورج اپنے رنگ بکھیرتا ہوا دور کہیں مغربی سمت روپوش ہو چکا تھا۔ کوہاٹ شہر کے وسط میں سارا دن سگنلز ٹریننگ سنٹر کے سپاہی اور رنگروٹ سنٹر میدان میں ایک منظم طریقے سے عہدیداروں کی سپرویژن میں کام کرتے رہے۔ کھانے کے لیے میزیں اور بینچیں اور کہیں کہیں کرسیاں رکھی جاتی رہیں۔ کچھ چہروں پر بشاشت تھی اور کچھ چہروں پر افسردگی ۰۰۰ عشائیہ ہوا ۰۰۰ کھانے میں لوگوں نے دن بھر کی تھکن دور کی ۰۰۰ یہ تقریب میجر جنرل عبید الرحمان ڈائریکٹر جنرل سگنلز کے اعزاز میں تھی۔ جو اپنی مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو رہے تھے۔ ایک سینئر افسر تشریف لائے اور سٹیج پر آکر بڑی گونج دار آواز میں کچھ اشعار سنانے لگے۔

آج کی رات عجب رات ہے اضداد کی رات ارتباطِ غم و فرحت کے ہے ارشاد کی رات

انبساطِ مئے الفت کی ہے ایزاد کی رات قلبِ ناشاد کی، بیداد کی، فریاد کی رات

بزمِ پُرنور ہے، سج دھج بھی ہے دونی امشب ورلے احمدؔ یہ فضا پھر بھی سونی امشب

نظم تقریباً چھ بندوں کی تھی۔ جس کے ہر لفظ سے یہ ظاہر ہوتا کہ بہت ہی عزیز اور مقبول ہستی کو الوداع کہنے کیلئے جذب و احترام میں ڈوب کر لکھی گئی ہے۔ پھر کلامِ شاعر بزبانِ شاعر نے ایک سماں باندھ دیا اور واقعی وہ کیفیت طاری ہو گئی جو ایسے لمحے ہونی چاہیئے تھی۔

ماحول پر ایک جمود سا طاری تھا۔ ایک خاموشی تھی اور ہر طرف یہی دعائیہ کلمات گونج رہے تھے۔ پتہ چلا کہ نظم سرا شخصیت بریگیڈیئر منظور احمد غوری ہیں۔

جناب غوری، احمدؔ تخلص کرتے ہیں اور ایک مدت سے شاعری کے میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ لیکن عسکری مصروفیات کی وجہ سے کچھ زیادہ ایکٹو نہیں۔

آپ یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو سگنلز کور میں کمشن پانے کے بعد دورانِ ملازمت مختلف مقامات پر مختلف عہدوں پر کام کیا۔ اور آخری عرصے میں سنٹر کمانڈنٹ بنائے گئے۔

اردو شاعری میں میری نظر سے آپ کی نظمیں ہی گزری ہیں۔ بلکہ اس میں بھی زیادہ تعداد نعتِ نبی ﷺ کی ہے جو آپ بہت خوبصورت کہتے ہیں اور جذبات و عقیدت میں ڈوب کر لفظوں کو انتخاب کرتے ہیں بلکہ آپ کی نظم میں غزل کی سی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ ○○○

حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

اے سرورِ جہاں ، تو ہے راکبِ زماں — آغازِ کن فکاں ہے تو ہی سرِ کن فکاں
لاکھوں برس تھا نور تیرا حیرتِ سردش — تیری حیات ازل سے ہوئی اس کا امتحاں
آدم تھا مثلِ خشت تو اک نیرِ بلند — اے آخر الزماں ہے توؐ ہی اول الزماں
عیسیٰ ہوں یا خلیل سبھی ڈھونڈتے رہے — اللہ کو پا کے تیرا نشانِ عظیم شاں
توؐ ہم کنار اس سے کہ ہے بحرِ بیکراں — اے جوئے نور ! لامتناہی ہے بے گماں
ظلمت کدہ تھا ، تیریؐ نظر کا یہ فیض ہے — مانندِ رودِ نور ہوا ہے یہ خاکداں
انبارِ خاک و خار و خسِ تفتہ تھی زمین — تیرےؐ قدم سے پل میں بنی رشکِ جناں
ہر مردہ قوم زندہ ہوئی انقلاب سے — تھا موجبِ کمال تراؐ حرف زر فشاں
خورشیدِ عشق، نقش گرِ زندگی ہے توؐ — ذرات تیرے انجم و ماہتاب و کہکشاں
توؐ لامکان و کون و مکاں کا ہے حکمراں — اے ذاتِ لایزال کا شہکارؐ و ترجماںؐ
آیا ہوں تیرےؐ در پہ طلب فقر کی لئے — سرکارِ عاشقاں توؐ ہے دلدارِ عاشقاں
وہ فقر جو ہے ولولۂ حق سے مستنیر — وہ فقر جو ہے رشکِ معفوریٔ شہاں
مضطر ہوں، مضطرب ہوں بڑا بے سکوں ہوں میں — مجھ پر نظر کرم کی ہو اے رحمتِ جہاں
یاں گر کے خالی ہاتھ ترے در سے گر اٹھا — اس جا ہی مر مٹوں گا میں ، جانا ہے پھر کہاں
وہ جرعہ مجھ کو ساقی کوثر ہو اب عطا — جل اٹھیں جس سے عشق میں دل ہو کہ روح و جاں

احمدؔ پہ فیضِ خاص ہو اے احمدِؐ زماں
آیا کشاں کشاں ہے یہ جائے کشاں کشاں

بریگیڈیئر ایس کے ملک

ایس کے (S.K) انگریزی حروف ہی سہی لیکن ان میں ایک چارم ہے ایک دلکشی ہے۔۔۔ بلکہ ایک دلربائی ہے دوسرا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ملک صاحب کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں ہاں البتہ ایک چیز جو مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ بریگیڈیئر صاحب کو ایس کے ملک بننے تک نجانے کتنی تگ و دو کرنی پڑی ہوگی۔

آپ یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ میری اطلاع کے مطابق والدین نے آپ کا نام سوندھا خان رکھا۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ ناموں پر کوئی دھیان نہ دیتے تھے۔ بلکہ ایسے نام اکثر رکھے جاتے تھے جن سے قطب علی خان اور بلند علی خان بننے کے لئے حساس بچے بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔

جناب ایس کے ملک نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۳ء کو بلوچ رجمنٹ میں کمشن حاصل کیا۔ فوج میں لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتے رہے۔ مختلف عہدوں پر کام کیا اور ۲۷ سال کا عرصہ اس منظم ادارے میں گزار کر ۱۹۸۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں حصہ لیا اور بہت کچھ سیکھا جس سے حکمتِ عملی میں تھیوریٹکل اور پریکٹیکل تجربہ ہوا۔ ریٹائرمنٹ لیتے ہی آپ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں ڈیفنس اینڈ سٹریٹیجک سٹڈیز کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ نے چونکہ وار سٹڈیز میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور پھر پولیٹکل سائنس میں پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ عسکری ملازمت کے دوران بھی آپ کو لکھنے کا شوق رہا اور آپ فوجی معاملات پر اکثر رسالوں میں لکھتے رہتے تھے۔ فوج سے آنے کے بعد اس شوق میں اضافہ ہوا اور وقت بھی ملا جس کے نتیجے میں "خالد بن ولید"۔

"Generals of Islam"- "The Quranic Concept of War"

"Quranic Concept of Power"

"The Muslim Conquest Of Central Asia"

"Deterrance in the Quranic Perspective"

جیسی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

اُردو اور انگریزی نثر نگاری کے ساتھ ساتھ آپ کی توجہ اُردو شاعری کی طرف بھی رہی۔ شاعری میں آپ نے نعت گوئی کو ترجیح دی جس میں آپ عقیدت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اور اخلاق کی تعلیم بھی دے رہے ہیں ○○○

شافعِؐ روزِ جزا

حشر کے دن قہر کا عالم جوں ہی چھا جائے گا — فکر اپنی ذات کا ہر ایک کو پڑ جائے گا
ہر نبی اس قہر کے دن کو پکارے گا یہی — اے الٰہ العالمیں تو بخش دینا جاں مری
اے مسلماں غور سے سن آرہی ہے اک صدا — ایک پیاری سی صدا اور اک نرالی سی صدا
اللہ اللہ حشر کا یہ روز--- یہ قہرِ خدا — پھر بھی کہتا جارہا ہے ایک محبوبؐ خدا
اے الٰہ العالمین اے خالقِ ارض و سما — اے رحیم و اے کریم و اے محمدؐ کے خدا
سب سے اعلیٰ سب سے برتر ذات ہے برحق تری — صدقے اپنی ذات کے تو بخش دے امت مری
اے مسلماں تیری خاطر کر رہا ہے یہ دعا — وہ ترا پیارا نبیؐ، احمدؐ، محمدؐ، مصطفیٰؐ
کس قدر ہے مونس و غم خوار وہ آقاؐ ترا — کس قدر مخلوق سے یکتا ہے وہؐ مولیٰ ترا
کس کی جانب تک رہے ہیں آج سب شاہ و گدا — کس بلندی پر کھڑا ہے وہ شہؐ ہر دو سرا
کیوں نہ ہم اس شاہؐ مدنی پر کریں قربان جاں — جس کی خاطر ہیں بنائے حق نے یہ دونوں جہاں
کیوں نہ اس کی ذات پر بھیجیں درود ہم صبح و شام — کیوں نہ پائیں قدرتِ حق سے صلہ اس کے غلام
کیوں نہ اس سے دست بستہ التجا مل کر کریں — ہم فدائی ہیں ترے اور تیرے ہی ہر دم رہیں
نام پر تیرے جئیں ہم، نام پر تیرے مریں — نام پر تیرے ہمارے خون کی ندیاں بہیں

ہو وظیفہ دائماً اپنا پس از ذکرِ خدا
مصطفیٰؐ المصطفیٰؐ المصطفیٰؐ المصطفیٰؐ

فریاد اے آقاؐ

انبار گناہوں کے اٹھائے ہوئے سر پر — آ پہنچا ہوں اے رحمتِ کل آپؐ کے در پر
عاصی ہوں، گنہگار ہوں، بدکار ہوں آقاؐ — شرمندہ ہوں، نادم ہوں، شرمسار ہوں آقاؐ
اے بحرِ کرمؐ شاہِ اممؐ رحمتِؐ باری — منزل ہے کٹھن، بار گناہوں کا ہے بھاری
اک سیل ندامت ہے کہ ہے آنکھوں سے جاری — اک عالم ہو ہے کہ مرے دل پہ ہے طاری
اے ختمِ رسلؐ مولائے کلؐ شافعِ محشرؐ — محبوبِؐ خدا جود و عنایت کے سمندر

بن تیرےؐ کرم بستی یہ برباد ہے آقاؐ
فریاد ہے، فریاد ہے، فریاد ہے آقاؐ

بریگیڈیئر ظفر محمود (ایم بی ظفر)

میری فطرت میں نہ تھا کچھ بھی محبت کے سوا
میں رہا سادہ کا سادہ تو زمانہ ساز تھا
میں عدو سے کیوں ڈروں میرا بھروسہ ہے خدا
غم نہ تھا مجھ کو ظفر اللہ چارہ ساز تھا

اتنے سادہ اور سچے شعر جن میں کوئی ڈپلومیسی نہیں، کوئی سیاست نہیں، ایک سیدھا سادا فوجی اور دیہاتی شخص ہی کہہ سکتا ہے اور یہ شخص ہیں فوج اور دیہات سے تعلق رکھنے والے بریگیڈیئر محمد بخش۔ جو اس کے ملک کی طرح ایم بی ظفر اور بعد میں ظفر محمود بن گئے۔

جناب ایم بی ظفر، احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کی طرح انہیں کے علاقے ضلع سرگودھا کے ایک دور دراز گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چند سال گاؤں ہی کے سکول میں ٹاٹ پر بیٹھ کر اب پ ت پڑھی اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک پاس کیا۔ ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے ایم بی بی ایس کیا۔ اور پھر ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کو فوج میں کمیشن لیا۔

آپ بتاتے ہیں کہ "فنی زندگی دراصل فوج سے ہی شروع کی اور آج تک وردی میں ملبوس ہوں اس لئے" شاعری کچھ ذریعہ عزت نہیں مجھے "۔ فنی طور پر اپنے مضمون میں آخری منازل طے کئے ہیں اور فن سے متعلق ۵ کتب کے مصنف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس سے قوم کے نئے ڈاکٹر مستفید ہو رہے ہیں۔

اردو میں ایک ناول "خزاں نصیب" بھی چھپ چکا ہے۔ دو اور ناول عنقریب منظر عام پر آجائیں گے۔ فنی مجبوریوں کی وجہ سے کبھی کبھار ہی مشق سخن کر سکتا ہوں کہ چکی کی مشقت بھی ساتھ نہیں چھوڑتی پس مشق سخن کیسی؟"۔

بریگیڈیئر ظفر محمود فوجی ملازمت اور ڈاکٹری جیسے فل ٹائم جاب کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ نثر میں تو آپ اپنا لوہا منوا ہی چکے ہیں۔ شاعری میں بھی کوئی کمی نہیں رہنے دی۔ لیکن شاعری کو گو آپ زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ کیونکہ پیشہ ورانہ کتب کی اشاعت کے بعد آپ نے ناول پر توجہ دی۔ اس کے باوجود بھی آپ شعر کہتے ہیں۔ جن سے آپ کا خلوص اور جذبہ صاف جھلکتا ہے ○○○

غزلیات

سر کوئی سجدہ میں کوئی دار پر اچھا لگا
تیرے سنگِ در پہ لیکن اپنا سر اچھا لگا

پُر تعیش کوٹھیوں کے یوں تو وا تھے در ہزار
مجھ کو تیری نیم وا آنکھوں کا در اچھا لگا

آج کل کی نغمگی بھی ہے سماعت پر گراں
چھڑ گیا نغمہ جو دل کے ساز پر اچھا لگا

کھول کر دیکھا نہ تھا میں نے ترے خط کو ابھی
لانے والا خوبرو پیغام بر اچھا لگا

اک منافق دوست نے جب بارہا مجھ کو ڈسا
ایسے میں اک دشمنِ جاں بے ضرر اچھا لگا

جس میں اخلاص و وفا کی بو نہ ہو وہ پھول کیا
جس سے پھوٹیں پیار کی شاخیں شجر اچھا لگا

میری مظلومی پہ رحم اس کو بھی اب آنے لگا
آج مجھ کو میرا دشمن بھی ظفر اچھا لگا

جنونِ شوق میں اپنے کمی نہیں آئی
یہ اور بات فضا راس ہی نہیں آئی

ہزار چاہا عدو نے حصار کو توڑے
جبینِ غازی پہ لیکن نمی نہیں آئی

یہ جان تو ہے امانت وطن کی مٹی کی
وطن نے لی ہے تو دل میں غمی نہیں آئی

مری سپاہ کے ارادے ہیں آہن و فولاد
یہ محو دل سے ہوں ایسی گھڑی نہیں آئی

ہمارے سر ہیں امانت وطن کی اے ہمدم
کبھی ہمارے جنوں میں کمی نہیں آئی

مرے وطن پہ ہے قربان میرا ہر ذرہ
عدو کے ذہن میں یہ بات ہی نہیں آئی

یہ روکتا رہا ہر وار اپنے سینے پر
ظفر کی پشت کو دیکھو کٹی نہیں آئی

بریگیڈیئر اللہ بخش ملک

یہ دنیا مقامِ فنا ہے۔ یہاں کوئی شے بھی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ اس دنیا کے غم اور خوشیاں سب عارضی ہیں۔ جب موت آئے گی تو سب کا سب دھرا رہ جائے گا "تیرا" اور "میرا" ختم ہو جائے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ عمارات، عالی شان محلات، یہ کاروبارِ حیات سب ڈھیر ہو جائے گا۔ اس سرسبزی و شادابی پر خزاں چھا جائے گی۔۔۔ اگر یہاں کچھ رہے گا اگر کسی کو بقا ہے یا کسی کو دوام ہے تو وہ وحدہ لاشریک، مالکِ کل، اللہ رب العزت کی ذات پاک ہے۔ یہ احساس ہر شخص کو ہے۔ ہر ذی روح اس حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ہم جانتے بوجھتے غفلت کا شکار ہیں اور تنزلی کے گڑھے میں نیچے سے نیچے جا رہے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ انجام کیا ہے۔ کیا کریں گے تو انجام بخیر ہوگا اور کس بد عمل سے سزا کے مستحق ٹھہرائے جائیں گے۔ ہمیں کیسے رہنا ہے اور معاشرے کو کس انداز کا بنانا اور کیسے چلانا ہے۔

جناب ملک اللہ بخش اپنی اردو اور انگریزی لکھتوں سے اکثر ایسی ہی سچائیوں اور ایسے ہی اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ آپ کی نثر کے علاوہ نظم بھی ایسے ہی پرتو کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے اور سوچ کا ایک عمل دے جاتی ہے۔ درج ذیل نظم میں بھی ایسی ہی حقیقت سے روشناس کرایا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جب ایسی بات شاعری میں کہی جائے تو اس کی تاثیر کچھ اور ہوتی ہے۔ ملک صاحب نے یونہی شاعری کی زبان میں ہماری برائیوں سے ہمیں آگاہ کیا ہے اور ایک مثبت راستہ بتایا ہے۔۔۔ آپ ملت کی خستہ حالی پر دکھ خود بھی محسوس کرتے ہیں اور اس کسک کو دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ عوامی الجھنوں اور بے قاعدگیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور بے خبری انسان کے حوالے سے کسی مسیحا اور مہدی کے منتظر بھی ہیں۔

بریگیڈیئر اللہ بخش ملک ۱۶ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے ماسٹرز کی ڈگری کے ساتھ پاک فوج میں آئے جہاں ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی سے کمیشن پایا اور آپ کو آرمی ایجوکیشن کور میں فرائض سونپے گئے۔ آپ نے تعلیمی سلسلے کو آگے لے جاتے ہوئے Phd کیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے مجلّے "قیادت" کے مدیر بھی رہے۔ مختلف سٹاف ڈیوٹیز پر دورانِ سروس آپ نے کام کیا۔ کئی ذمہ دار عہدوں پر بھی رہ چکے ہیں۔ لکھنے کا فرض تو آپ ادا کر ہی رہے ہیں۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ مطالعے کا شوق بھی بے انتہا ہوگا۔ بلکہ ہے آپ کا تخیل، سوچ اور اندازِ فکر کی رسائی بڑی مثبت اور با تدبر ہے۔ آپ کے تصور کی پرواز کافی اونچی ہے۔

○○○

خود آگہی

ہماری بستی یہ کیسی بستی، خدا کی بستی سے دور تر ہے
ہوس کا قلزم محیط ہستی کہانی انساں کی مختصر ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی، نئے مسیحا کی منتظر ہے

نوائے ملت نحیف تر ہے، سرودِ ہستی خفیف تر ہے
فضائے ملی مہیب تر ہے، خدا کی خلقت صلیب پر ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی، نئے مسیحا کی منتظر ہے

خرد کے موتی دلوں کے نغمے، متاع ارزاں، گران زر ہے
رفاقتوں کی تپش سے عاری اداس نسلوں کا یہ ثمر ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی نئے مسیحا کی منتظر ہے

ہماری بستی کا آج انساں، خلیفۃ اللہ سے دور تر ہے
نگاہِ انساں ہوس کی رسیا مآل انساں سے بے خبر ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی، نئے مسیحا کی منتظر ہے

مزاجِ انساں بگڑ چکا ہے، انا کی بھٹی میں نوحہ گر ہے
ضمیرِ انساں کدورتوں پہ، ملمع سازی سے بہرہ ور ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی، نئے مسیحا کی منتظر ہے

انائے ملت بکھر چکی ہے، فسادِ دنیا فزون تر ہے
دلوں کے رشتے عدم ہوئے ہیں، وفا کے مٹنے کا آج ڈر ہے
ہماری بستی ہے کیسی بستی، نئے مسیحا کی منتظر ہے

نگاہِ بینا جو ہو میسر، صداقتوں پہ اگر نظر ہو
خدا کے احکام سے تعارف، نبیؐ کی دعوت کی بھی خبر ہو
ہماری بستی ہو ایسی بستی، نئے مسیحا سے بالا تر ہو

وفا کی قوت ہو جذبِ باہم، اسی سے عظمت ہو کروفر ہو
مآلِ انساں فقط یہی ہو، بنائے ہستی عظیم تر ہو
ہماری بستی ہو ایسی بستی، خدا کی بستی سے نزد تر ہو

بریگیڈیئر طلعت امتیاز نقوی

جدہ میں مقیم کوہاٹ کی ایک علمی و ادبی شخصیت جناب شجاعت علی راہی کا نام اُردو شاعری میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ مدت ہوئی جب ان کے ساتھ ہی ایک اور شخص اُردو ادب کی محفلوں کی زینت بنا لیکن جلد ہی انہیں چھوڑ گیا۔ یہ شخص راہی کا بڑا بھائی طلعت امتیاز تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی ادبی سفر شروع کیا ایک آج بھی رواں دواں ہے لیکن دوسرا اپنے فرائض کی انجام دہی میں پس پردہ چلا گیا۔

جناب طلعت امتیاز نقوی ۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ کوہاٹ میں ہی تعلیم پائی کالج سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ محکمہ تعلیم سے منسلک رہے اور درس و تدریس کو اپنایا یہی وہ دور تھا جب آپ ایک لکھاری کی حیثیت سے اُبھرے۔ لیکن نثر کی نسبت نظم سے زیادہ لگاؤ تھا آپ اس پیشے سے نباہ نہ کر سکے اور فوج کو ترجیح دی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۶۴ء کو کور آف آرٹلری میں آپ کو کمشن ملا۔ عسکری ذمہ داریوں نے ایک شاعر کو روپوش کردیا اور ایک سپاہی کو لاکھڑا کیا۔ آپ نے پیشہ ورانہ مہارت حاصل کی اور ترقی کرتے کرتے موجودہ مقام پر پہنچے یہاں ایک اور وضاحت کردوں کہ آپ نے ادب سے بالکل کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ کچھ عرصہ کے لئے عسکری مصروفیت کی بنا پر توجہ نہیں دے سکے تھے۔ لیکن اب کہیں نہ کہیں آپ کی کوئی تحریر اُردو نظم و نثر یا انگریزی زبان میں دکھائی دے جاتی ہے۔

بریگیڈیئر طلعت امتیاز نقوی اپنے شعروں کی طرح بڑے ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج ہیں آپ کے جونیئرز آپ سے بہت خوش ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "نقوی صاحب ہمارے ساتھ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے ہیں"۔ طبقاتی رکھ رکھاؤ کے باوجود آپ ہمیشہ محبت و یگانگت کا پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کی شاعری سے محبت اور حیات کا پرتو ابھرتا ہے۔ فارسی کی خوشگوار تراکیب کھنکتے ہوئے ساغروں کے افسانے اور رنگینئ بیان آپ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ آپ میں وطن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس کا اظہار اکثر آپ کی تحریروں میں نمایاں ہوتا ہے۔ آپ پیارنی سرزمین سے چاہت کا فرض گنوں اور گولوں (GUNS & ROUNDS) کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی ادا کر رہے ہیں ○○○

غزلیں

حسنِ کافر تو ہمیشہ ہمیں شاداں ہی ملا　　مسکراہٹ سے مگر عشق گریزاں ہی ملا
دل کی وسعت پہ نظر ڈال کے دیکھا جب بھی　　ہم کو تاحدِ نظر ایک بیاباں ہی ملا
پُرسکوں سمجھے تھے ہم بحرِ محبت کو مگر　　تہہ میں اترے تو امنڈتا ہوا طوفاں ہی ملا
زخم بھی کھائے ہیں صدمے بھی اٹھائے ہیں بہت　　دل کی کیا بات ہے ہر حال میں شاداں ہی ملا
ہم نے جس راہیِ الفت کو بھی دیکھا یارو　　دربدر خاک بسر، چاک گریباں ہی ملا
ہم نے مائل بہ کرم اُس کو نہیں دیکھا ہے　　جب بھی وہ ہم کو ملا شعلہ بداماں ہی ملا
وہ سکوں جس کی طلب دل میں لئے پھرتے تھے　　وہ سکوں ہم کو سرِ حلقۂ زنداں ہی ملا
اُس طرف واعظِ مسجد بھی خفا ہے ہم سے　　اس طرف ساقیٔ مے خانہ بھی نالاں ہی ملا

جانے کیا روگ لگا بیٹھا ہے دل کو طلعتؔ
ہم کو یہ شخص سدا سر بگریباں ہی ملا

اور حربے تو ہوگئے ناکام　　موت ہی دے گی اب ہمیں آرام
جب سے آئے ہیں شہرِ عشق میں ہم　　کر چکے ہیں مسرتیں نیلام
اے غمِ عشق کچھ سہارا دے　　اے غمِ یار گر رہا ہوں تھام
درد، آلام، ٹھوکریں، آنسو　　زندگی ہیں تمہارے کتنے نام
عشق کا یہ کرم بھی کافی ہے　　چکھ تو لی لذتِ غم و آلام
مہوشو دل مرا خرید و گے؟　　ایک ترچھی نظر ہے اس کا دام
صبحِ امید کو کہاں ڈھونڈیں　　چھا گئی یاس کی گھنیری شام

غم میں ہم کو قبول ہے طلعتؔ
زہر کا جام ہو کہ مے کا جام

بریگیڈیئر سید سعد الہادی (ایس ایس ہادی)

ایک سپاہی کی زندگی جن معمولات سے عبارت ہے ان میں سراسر مشقت، محنت، ہمت، مردانگی اور تگ و دو کے عوامل شامل ہیں اور ایسے معمولات میں سے چند گھڑیاں نکال کر علم و ادب کے خزینے بانٹنا اور وہ بھی مسکراہٹوں اور خوشیوں کے روپ میں بظاہر ایک دقت طلب کام ہے۔ لیکن درحقیقت اگر آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ افواجِ پاکستان نے قوم کو بے شمار ایسے لکھاری دیئے ہیں جن کا کام مصروفیت کے لمحات میں بھی مسکراہٹیں بکھیرنا اور زندہ دلی کا درس دینا ہے۔ ایسے ہی مزاح نگاروں میں ایک نام ایس ایس ہادی بھی ہے۔ آپ نے جہاں انگریزی اور اردو میں سنجیدہ مضامین دیئے ہیں وہاں اُردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایات کو بھی زندہ رکھا ہے۔ آپ کا کلام پڑھ کر دن بھر کے تھکے ماندے عزم و ہمت کے پہاڑ محظوظ ہوتے ہیں۔ آپ نے رسائل و جرائد کے ذریعے "ساس کا شکوہ"، "بہو کا شکوہ"، "باس کا شکوہ"، "ماتحت کا شکوہ"، "مزاحیہ شاعری"، "افسر تو فقط اس کو دبانے کے لئے ہے"، "ساس بہو"، "نوکری کے لیے" اور "ٹائی" جیسی نجانے کتنی تحریروں سے افسردہ دلوں کو تبسم ریز کیا۔ لیکن اس انداز میں آپ نے صرف مزاح کو ہی نہیں اپنایا بلکہ کھری کھری باتیں کی ہیں اور انہی کھری باتوں سے ایک مزاح کا رنگ پیدا کیا ہے۔

بریگیڈیئر سید سعد الہادی ۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج پشاور اور پھر قائدِ اعظم کالج پشاور سے بی کام کیا۔ ۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو آرٹلری میں کمشن لیا۔ ۱۹۷۱ء میں عمر کوٹ سیکٹر پر نئے تجربات سے ہمکنار ہوئے۔

آپ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک پیشہ ور فوجی بھی ہیں اور اس کا ثبوت آپ کے پیشہ ورانہ کورسز کی فہرست ہے۔ جو صرف پاکستان یعنی سکول آف آرٹلری، کمانڈ اینڈ سٹاف کالج، پی اے ایف ایئر وار کالج تک ہی محدود نہیں بلکہ امریکہ جیسے دور دراز اور ترقی یافتہ ملک کا نام بھی اس میں شامل ہے۔ آپ آرمی فٹ بال ٹیم میں بھی رہے۔ گالف کے بڑے اچھے کھلاڑی ہیں۔ کمپیئرنگ بہت خوب کرتے ہیں۔ موسیقی سے کافی حد تک دلچسپی ہے۔ گلوکاری کا شوق ہے اور جب غزل گاتے ہیں تو سماں باندھ دیتے ہیں۔ شعر و شاعری سے عشق ہے اچھی صحت اور خوشی کے متلاشی ہیں اور اچھے دوستوں کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں ○○○

غریب و سادہ

ہر شہر ہر جگہ کی زمینوں کی خیر ہو
اور ان پہ لگنے والی جبینوں کی خیر ہو

سب خیر مانگتے ہیں شریفوں کے واسطے
مولا کبھی کبھی تو کمینوں کی خیر ہو

اکثر جو ڈولتی ہے دسمبر کے ماہ میں
ایسی ترقیوں کے سفینوں کی خیر ہو

بیگم کو اپنے گھر سے جو میکے کو لے چلے
ہر سال چند ایسے مہینوں کی خیر ہو

جو باس اور ساس میں تفریق کر سکے
ماتحت تیرے ایسے قرینوں کی خیر ہو

میک اپ میں جو پری لگیں اور ویسے اک چڑیل
ایسے غریب و سادہ حسینوں کی خیر ہو

نوکری کا اصول

مرے مقدر کی فکر چھوڑو تم اپنے گھر کو سنبھال رکھنا
جو شادی کی ہے تو زائچہ پھر مآل کا بھی نکال رکھنا

ہماری بیگم کا سارے دن میں فقط یہ اک کام رہ گیا ہے
ہماری غلطی پکڑ کے رکھنا، پھر اس کو تھوڑا اچھال رکھنا

ہم اپنے سسرالیوں کے ڈر سے ہمیشہ رکھتے ہیں گھر میں راشن
کہ شاید آجائے کوئی مہماں ضروری ہے گھر میں دال رکھنا

ہر ایک بندے پہ ہے یہ لازم ترقی کرنے کا راز سمجھے
ہے نوکری کا اصول سیدھا کہ باس کا بس خیال رکھنا

بہت سے دیکھے ہیں باس ایسے کہ دورخی ان کی پالسی ہے
کہ گھر میں بلی سے بھی پریشاں، پہ دفتروں میں جلال رکھنا

اب ایک ہی رستہ رہ گیا ہے کہ بچ سکیں اپنے دشمنوں سے
حفاظتاً کوئی سانپ چھوٹا سا آستینوں میں پال رکھنا

بریگیڈیئر محمد ذاکر

کرم حیدری، شاکر شمیم کی کتاب "نغمہ و سنگ" کے دیباچے کی ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں "پتھر اور اہلِ کوہستان کا روزِ اوّل سے ساتھ ہے۔ پہاڑ پتھروں اور چٹانوں سے بنے ہوئے ہیں اور انہی پتھروں اور چٹانوں کا سینہ چیر کر اہلِ کوہستان زندگی کا راستہ بناتے ہیں"۔
محمد اظہار الحق، شاکر شمیم کے بارے لکھتے ہیں "آپ کا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جو اقتصادی چمک دمک اور تعلیمی سہولیات سے محروم ہے اگرچہ علم و ادب آپ کو ورثے میں ملے ہیں لیکن یہ بات بہر طور واضح ہو جاتی ہے کہ جوہرِ قابل ہر جگہ موجود ہے اور صرف چند بڑے شہر یا چند مراعات یافتہ لوگ ہی صلاحیت اور لیاقت کے اجارہ دار نہیں"۔

آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ بریگیڈیئر ذاکر کی بجائے شاکر شمیم کا تذکرہ، چہ معنی دارد؟ تو جناب بتاتا چلوں کہ بریگیڈیئر محمد ذاکر، جناب شاکر شمیم کے بھائی ہیں اور یہی تبصرہ بریگیڈیئر صاحب کی شخصیت پر بھی فِٹ آتا ہے اور ہاں جناب شمیم بلتستانی جو کہ اُردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں ان دونوں حضرات کے والد ہیں شاکر شمیم بھی صاحب کتب ہیں اور اب محمد ذاکر نے بھی "اُردو بلتی بول چال" اور "سیاچن گلیشیئر" لکھ کر اپنا نام اس صف میں درج کرا دیا ہے بلکہ "یادِ رفتگان" اور "خشتِ اوّل" بہترین اضافہ ہوگا۔

جناب محمد ذاکر ۱۰ فروری ۱۹۴۶ء کو بلتستان میں پیدا ہوئے۔ علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں پاکستانیت اور وطن سے محبت آپ کی گھٹی میں پڑی ہیں اسی جذبے کے تحت تعلیم مکمل کر کے آپ نے فوج کو ترجیح دی اور ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو کمشن حاصل کیا۔ ۱۹۷۱ء میں آپ سابقہ مشرقی پاکستان میں سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے المناک حادثے سے گزرے اور پھر رہائی پر ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ واپس وطن لوٹے۔ آپ نثر اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزماتے ہیں خوب لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں حقائق سے چشم پوشی کبھی نہیں کی اندازِ بیان سادہ اور دلکش ہوتا ہے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے ہیں سنجیدگی میں کبھی کبھی مزاح کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے آپ فوج اور قلم کے رشتے سے صحیح انصاف برت رہے ہیں ○○○

سرمایۂ زندگی

آرزو مند ہوں پوری میری حسرت کردے
میری قسمت میں مدینے کی زیارت کردے

میں گنہ گار و خطا کار و تہی دامن ہوں
میری جانب نظرِ شفقت و رحمت کردے

ہے مری زیست کا سرمایہ محبت میری
یہی سرمایہ شفاعت کی ضمانت کردے

دل میں ہو خوفِ خدا لب پہ ترا ذکرِ جمیل
کچھ نہ دے مجھ کو، عطا بس یہی دولت کردے

جب بھی میں بات کروں حق و صداقت کی کروں
اپنی رحمت سے عطا مجھ کو یہ جرأت کردے

ہے بُرا وقت پڑا ماننے والوں پہ تیرے
نام لیوا ہیں ترے ہم پہ عنایت کردے

مجھے دولت کی ضرورت ہے نہ شہرت کی طلب
اک فقط نانِ جویں میری ضرورت کردے

درگزر کر میری بے چارگیٔ فکر و نظر
ذکر تیرا ہو سدا میری یہ عادت کردے

جہاں ہو پیار کی خوشبو

نظر وہ جو شبِ دیجور میں سحر ڈھونڈے
سحر وہ جس سے اندھیرے کی آنکھ روشن ہو

خزاں بھی جس کی بہاروں میں تازگی بھر دے
جہاں ہو پیار کی خوشبو وہ میرا گلشن ہو

خموشی اور حیا ہم کو چاہیئے ایسی
عروسِ نو کی لجاجت سے جیسے تن من ہو

خودی وہ جو نہ دبے خواہشوں کے بوجھ تلے
کسی کے آگے نہ پھیلے وہ میرا دامن ہو

بھٹک رہے ہیں تلاشِ سحر میں اہلِ بصر
کہ جیسے عمر رسیدہ بشر کا بچپن ہو

بریگیڈیئر ضرغام حیدر نقوی

غنچے چٹک چٹک کر کیا مسکرا رہے ہیں طائر چمن کے میٹھے نغمے سنا رہے ہیں
ظلمت جہاں جہاں تھی کافور ہوگئی ہے پیاری زمیں ہماری پُرنور ہوگئی ہے

ہمارے ہاں گو اردو شاعری میں یہ Descriptive طرز معدوم ہوتی جارہی ہے لیکن چند ایک شعراء ابھی بھی ہیں جنہوں نے اسماعیل میرٹھی اور نظیر اکبر آبادی جیسے شعراء کی روایات اپنائی ہوئی ہیں۔ ایسے ہی خوش کن سپنوں، حسین تعبیروں، محبت و یگانگت کے پرنور رشتوں، مسکراتے غنچوں، چہچہاتے پرندوں، سپیدۂ سحری سے کافور ہوتی ظلمت اور پُرنور ہوتی زمین کے مناظرِ فطرت اور حسین نظاروں سے مزّین مسکراتی تحریروں کا دلکش سندیسہ قارئین کو پیش کرنے والے سید ضرغام حیدر نقوی نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو علم و حکمت کا چمچہ منہ میں لے کر اس دنیائے رنگ و بو میں جنم لیا۔ عمر کے لحاظ سے آپ اس پاک ملک سے ایک سال (تقریباً) پہلے اس دنیا میں آئے اور میرے خیال میں، یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ آپ نے جب شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنے آپ کو پاکستانی پایا اور یہی پاکستانیت آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچپن، لڑکپن اور آغازِ جوانی تعلیم کی نذر ہوگیا۔ جب امنگوں اور جذبوں کی عمر کو پہنچے تو فوج کے اصولوں اور پابندیوں کو اپنے لیے پسند کیا۔ یکم دسمبر ۱۹۶۸ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن پایا۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا اور پھر قائداعظم یونیورسٹی سے ایم فل کیا۔

فوج میں آنے کے بعد آپ مختلف سٹاف اور انتظامی عہدوں پر تعینات رہے اور کئی اداروں میں بحیثیت انسٹرکٹر اور چیف انسٹرکٹر فرائض ادا کئے۔ جن میں جونیئر کیڈٹ بٹالین، پی ایم اے، آرمی ایجوکیشن کالج، ملٹری کالج جہلم اور جونیئر کیڈٹ اکیڈمی منگلا میں ڈائریکٹر آف سٹڈیز بھی رہے۔ اب بھی آپ بڑی لگن، محنت اور شفقت سے عساکرِ پاکستان میں علم و حکمت کی شمع روشن کئے ہیں۔

بریگیڈیئر سید ضرغام حیدر نقوی نثر اور نظم، انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں اپنے اظہارِ بیان کا فن خوب جانتے ہیں۔ لیکن آپ اس فن کو محض تفننِ طبع یا نمودِ ذات کا نہیں بلکہ تکمیلِ ذات کا باعث گردانتے ہیں۔ آپ کے نزدیک معاشرے میں خیر و صداقت کو فروغ دینا فن کا مقصد اور زیست کا مدعا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں سے ہمیشہ سچائی اور خلوص کا درس دینے کی کوشش کی ہے۔ حقیقتوں کی ترجمانی اور چاہت و الفت کا تقدس آپ کا مطمعِ نظر رہا ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

ہماری جوش پر کیوں آج پھر فکرِ رسا آئی — یہ کس کے وصفِ عالی میں ہے شوقِ خامہ فرسائی
یہ کس گُل کی ثنا مدِنظر ہے بلبلِ دل کو — نسیمِ خلد کیوں آکر مرے گلشن میں اِترائی
جہاں میں کون ہے وہ صاحبِ لولاک بتلاؤ — پئے تعظیم جس کی خود جُھکا ہے چرخِ مینائی
یہ کس کے ہے غلاموں کا شرف افضالِ خالق سے — نہ یہ جمشید کی شوکت، نہ یہ دارا کی دارائی
نہیں معلوم کس کا شوقِ مدحت ہے ترقی پر — میں حیراں تھا نہایت جو یہ ہاتف کی ندا آئی
ارے غافل مہینہ کون سا ہے تو نہیں واقف — ہیں جس کے جان و دل سے جملہ اہلِ دین شیدائی
ربیع اوّلِ ذیشاں کی ذیشاں بارھویں آئی — خدا نے جس کی فرمائی ہے بے حد عزت افزائی
ہوا ہے آج وہ پیدا جہاں میں سرورِ عالمؐ — ہیں جملہ انبیاء جس کے دل و جاں سے تولائی
نہ کیوں گھر گھر جہاں میں آپؐ کے جشنِ ولادت ہو — یہ پھر تاریخ فرخندہ ہمیں خالق نے دکھلائی
مئے حُب سے شہِ لولاکؐ کی مخمور ہے ہر شے — فضائی ، بحری و بری ہو یا کوہی و صحرائی
بجز احمدؐ نہیں ہے دو سرا میں دُوسرا ایسا — اسی گل سے تو یہ گلزارِ وحدت نے فضا پائی
حسیں اب تک کوئی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوئے گا — خدا روزِ ازل سے ہی محمدؐ کا ہے شیدائی
خیالِ حُسنِ یوسفؑ پھر نہ ہوتا اس کو عالم میں — زلیخا دیکھ لیتی گر رُخِ زیبا کی زیبائی
مراتب کو وہی بس جانتا ہے ان کے عالم میں — جسے بخشی ہے خالق نے کرم سے اپنے دانائی
انہیں سے معرفت حق کی ہمیں حاصل ہوئی بیشک — جسے بخشی ہے خالق نے کرم ست اپنے دانائی
حبیبِ کبریاؐ کی صرف مدحت کا یہ صدقہ ہے — ہمارے واسطے جو مژدۂ جنت صبا لائی

مدینہ میں بلا لو جلد اب ضرغامِ حیدر کو
تمہارے ہجر میں حضرتؐ نہیں تابِ شکیبائی

ایئر کموڈور محمد حسن صفدرؔ (ایم ایچ صفدرؔ)

جناب محمد حسن صفدرؔ اپنے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں "میری زندگی کے بہت سے پہلو ہیں یعنی سپاہی، استاد، شاعر، ادیب، موّرخ اور ماہرِ نظم و نسق۔ پیشہ کے اعتبار سے اُستاد ہوں اور شاعر خودرو۔ آپ ہی آپ لڑکپن میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ فارسی میں بھی شعر کہتا ہوں جب موڈ ہوتا ہے جی بھر کر نغمہ سرائی کر لیتا ہوں ورنہ برسوں اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ شعر کہنے کے لئے کسی خاص ماحول یا مخصوص کیفیت کی شرط نہیں۔ خندق میں بیٹھے شعر کہے ہیں گولہ باری کے دوران چلتے پھرتے سوتے جاگتے بھی شعر کہے ہیں۔ ان کی شانِ نزول کچھ بھی نہیں جب آتے ہیں تو آتے چلے جاتے ہیں اور جی ہلکا کر جاتے ہیں"۔

یہاں دو پہلو اور بتاتا چلوں۔ آپ محقق اور مترجم بھی ہیں جن کا تذکرہ آپ نے نہیں کیا یا پھر ضروری نہیں سمجھا۔ ایم ایچ صفدرؔ جو ہشت پہلو شخصیت ہیں ۱۹۵۰ء میں ایئر فورس میں ایک کمشنڈ آفیسر کی حیثیت سے داخل ہوئے کئی پیشہ وارانہ کورسز کئے۔ بیرونِ ملک میں بھی آپ کو خدمات کی انجام دہی کا موقع ملا۔ کچھ عرصہ آئی ایس ایس بی میں بھی رہے اور پاکستان ایئر فورس اکیڈمی میں ڈائریکٹر آف سٹڈیز بھی رہے۔

ایئر کموڈور محمد حسن صفدرؔ نے عسکری زندگی کے ساتھ ساتھ ادبی سفر بھی جاری رکھا ۱۹۵۷ء میں نذرالاسلام اکادمی کے اصرار پر آپ نے بنگالی کے عظیم شاعر نذر الاسلام کی رزمیہ نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جو نہایت مقبول ہوا۔ آپ کی بے لوث خدمات کے صلے میں انجمنِ ترقیِ اردو لاہور نے ۱۹۷۰ء میں آپ کو سندِ اعتراف سے نوازا جو ایک اعزاز ہے۔

اب تک آپ ایک درجن سے زائد کتب اسلام، تصوف، نظم و نسق، قیادت اور اُردو ادب پر لکھ چکے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

"تصوف ہماری نظر میں"، "پیکرِ خیال سے فیصلوں تک"، "ہماری زندگی سیرت پاک کے آئینہ میں"، "کوہاٹ کا قلمی جہاد"، "ہم، تم اور وہ"، "ضیغم"، "قیادت کے تقاضے"، "پاک فضائیہ"، "پاک افواج"، "قدم قدم پر کتنے چہرے" وغیرہ ○○○

حمد

روزِ محشر ہے جبیں خوف سے گھبرائی ہے
میرے سجدوں کو یہ کیا سوچ کے نیند آئی ہے

دشتِ عصیاں کے اندھیروں میں سہارا تُو تھا
میں تصدق ترے، چاہت تری کام آئی ہے

ابر کے سینے میں چمکا ہے وہ روئے تاباں
کالی کملی کو لپیٹے ہوئے رعنائی ہے

جی میں آتا ہے کہ یہ جان تصدق کردوں
فردِ عصیاں کو مگر دیکھ کے شرم آئی ہے

اتنے پر تو ہیں ترے حسن کے یارب، میں کیا
فہمِ انساں بھی انہیں دیکھ کے گھبرائی ہے

ہر کلی ایک نئی شکل دکھانے آئی
کثرتِ شوق میں کس درجہ کی یکتائی ہے

ہاتھ صفدرؔ جو اٹھائے تو دعا کیا مانگے
کیا کروں عرض کہ تو محرمِ دانائی ہے

غزل

گرجتے بادل، برستی پلکیں، الجھتے گیسو، لبوں پہ نالے
عجیب سازش ہے کار فرما بڑھے ہیں نشتر، جگر بچا لے

یہ رعد و باراں کی بھیگی راتیں، وہ آس کا کھولنا دریچے
ہر ایک کروٹ پہ چبھتی یادیں، فغاں کے بادل گھنیرے کالے

گلوں کی رنجش بڑھے نہ زیادہ، صبا کے ہاتھوں میں دم ابھی ہے
پڑے ہیں تکتے ہزاروں چہرے، نظر میں حسرت کوئی اٹھا لے

نجانے کس موڑ پر ہوں راہزن نجانے کس جا کھڑے لٹیرے
سنبھل کے دل راہ ہے اندھیری، مطاعِ الفت کوئی چرا لے

گراتا نظروں سے عام دیکھا، فلک سے تارے ہزار ٹوٹے
کوئی ہے جو قصرِ آرزو کے ستون گرتے ہوئے اٹھا لے

بڑا ہے رستہ، شکستہ ہمت، گھٹائیں گہری ڈراؤنی ہیں
کوئی تو ساتھی ہو دل بڑھائے، کدھر ہے صفدرؔ اسے بلا لے

کرنل مرزا حسن خان ملٹری کراس۔ فخرِ کشمیر

مرزا حسن خان ۱۹۱۹ء کے ماہ فروری کی ایک جمعرات کو گلگت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرزا تاج محمد خان ایک راجپوت خاندان سے متعلق تھے۔ آپ ابتداء ہی سے تعلیم میں بڑے اچھے تھے اور ہر جماعت میں پہلی پوزیشن لیا کرتے تھے ابھی آپ کم عمر ہی تھے کہ آپ کی والدہ فوت ہو گئیں لہذا آپ کے والد نے ۱۹۳۲ء میں تعلیم کے حصول کے لئے آپ کو سرینگر بھیج دیا۔ سری پرتاپ ہائی سکول میں چند ماہ ہی گزرے تھے کہ والد بھی رحلت فرما گئے۔ یہاں سے آپ پونچھ آ گئے اور دی جے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ جہاں مارچ ۱۹۳۴ء میں پونچھ کے چاروں سکولوں میں اول آئے۔ ۱۹۳۷ء میں تھرڈ ایئر پاس کر کے فورتھ ایئر میں قدم رکھا ہی تھا کہ فوجی بننے کا شوق ذہن میں سما گیا اور یوں کمیشن لے کر ۱۹۴۰ء میں سیکنڈ کشمیر رائفلز میں آ گئے۔ اسی عرصہ میں آپ نے رائل آرمی میں کمشن حاصل کر لیا اور ترقی کرتے کرتے کرنل بن گئے جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو آپ نے کشمیر کی آزادی کے لئے جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ حصہ قولاً نہیں بلکہ فعلاً تھا پھر حالات نے پلٹا کھایا اور آپ پنڈی سازش کیس کی زد میں آ گئے اور چار سال قید بامشقت اور ۲۵۰ روپے جرمانہ کی سزا پائی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید چھ ماہ قید بامشقت نیز ملازمت سے برطرفی کی شق آپ کی سزا میں اضافی درج تھی لیکن آپ مقررہ مدت سے پہلے رہا ہو گئے اور پھر جب ع

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

اب آپ سول حکومت میں شامل ہو گئے اور پاک و ہند کی دونوں سابقہ جنگوں میں آزاد کشمیر کے محکمہ دفاع کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

چونکہ جیل کی زندگی میں آپ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا جیسے کمیونسٹ لوگوں کے ساتھ رہے تو ان کے خیالات سے کافی حد تک متاثر ہوئے جس سے آپ کی شاعری بھی انہی جہتوں پر چل نکلی لیکن ماضی کے تجربات نے آپ کی تحریروں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نثر میں آپ کی کتاب "شمشیر سے زنجیر تک" سوانح عمریوں کی صف میں ایک معتبر تحریر ہے ○○○

غزلیں

ہے شہیدانِ وفا میں پہلے پروانے کا نام
آج کیوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

چند ہی لمحاتِ شیریں، تلخ باقی تجربے
داستانِ عشق کیا ہے ایک افسانے کا نام

سب کے سب الجھے مسائل خود بخود ہوتے ہیں حل
دور تک اب جاچکا ہے زلف اور شانے کا نام

چھوڑ دینا ہم سے سیکھو عین مستی میں شراب
بھول کر بھی اب نہیں لیتے ہیں میخانے کا نام

لوگ کہتے ہیں حسنؔ خاں میں ہیں آثارِ جنوں
یہ اکیلے بیٹھ کر ہے دل کو سمجھانے کا نام

پھر انتظارِ دعوتِ مژگاں ہے ان دنوں
اس چارہ گر کی نذر دل و جاں ہے ان دنوں

کیا اوج پر ستارۂ خاناں ہے ان دنوں
کہنے کو یوں حکومتِ عاماں ہے ان دنوں

ہے دل میں کچھ زباں پہ کچھ دلبری کا نام
عجز و نیاز وعدہ و پیماں ہے ان دنوں

پھر دل جلوں پہ تنگ ہوا عرصہ حیات
کچھ خستہ خستہ سا رخِ تاباں ہے ان دنوں

غنچہ دہن کشادہ کرے گر تو گل جھکیں
لب بستہ ہے وہی جو سخنداں ہے ان دنوں

اس سیم تن کی حسرتِ دیدار تو نہیں؟
اک جلوہ پھر سے دل میں فروزاں ہے ان دنوں

اپنے کئے پہ آج بھی نادم نہیں حسنؔ
جو کر سکا نہ اس پہ پشیماں ہے ان دنوں

کرنل شمیم محمود بشارت علوی (شمیم علوی)

اَدبی حلقوں میں یہ سنا جاتا ہے کہ شاعروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جس سے معیار گرتا جارہا ہے حالانکہ یہ بات نہیں۔ دل کا غبار نکالنے کے لئے اور اظہارِ خیال کے لئے ہر شخص کوئی ذریعہ تلاش کرتا ہے اب اگر ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے اور پھر وہ یہ مشکل طرز اختیار کرتا ہے تو اس میں ایسی کون سی بُری بات ہے۔ آخر وہ اپنی بات ہی تو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی کل وقتی کام تو ہے نہیں جو کاروبارِ حیات پر اثر انداز ہو شعر کہنے اور شعر پڑھنے کے لئے چند دقائق ہی کافی ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے جسے کرنل شمیم جیسے مصروف انجینئر بھی فرصت کے لمحات میں اختیار کرتے ہیں اور لوگوں تک دل کی بات پہنچاتے ہیں۔

جناب شمیم علوی ۲۹ فروری ۱۹۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے حصول پر فوج میں آگئے اور انجینئرنگ کور میں خدمات سرانجام دیتے رہے اور آخر کرنیلی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اس کے بعد واپڈا اکیڈمی تربیلا میں پرنسپل کی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی۔ ان کے دو صاحبزادے ہیں ڈاکٹر سید حسن محمود حسین راولپنڈی میں پریکٹس کر رہے ہیں جبکہ سید حامد حسن امریکہ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔ ایک صاحبزادی برلن اور دوسری امریکہ میں مقیم ہے۔

کرنل شمیم محمود بشارت علوی کی شاعری بقول سرور انبالوی "انسانی رویوں اور ان کے دلی جذبات کی عکاس ہے ان کی غزل میں عدم، جگر، حسرت، فیض، مصطفیٰ زیدی اور فراز کے رنگ کا پرتو اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ان شعراء سے خصوصی طور پر متاثر ہوئے"۔ ان کی غزل میں بعض بعض اشعار چونکا دینے والے ہیں اور حساس طبیعتوں کو بالخصوص متاثر کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں جذبوں نے سادگی اور استعاراتی روپ ظاہر کئے ہیں۔ دل کی بات کبھی کھلی ڈلی اور کبھی تشبیہوں کی آڑ میں کرتے ہیں۔ "جفاکم کن" آپ کی شاعری کو قاری کے دل تک پہنچانے کا خوب اور بہتر ذریعہ ہے۔ اس کتاب میں آپ نے شاعری کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دِلی کیفیات کو دنیاوی کیفیات سے ہم آہنگ کر دیا ہے اور پڑھنے والے کو یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے ہی فن میں ڈوبا جارہا ہے ○○○

غزلیات

اشک ساون کی جھڑی ہو جیسے
دور تو مجھ سے کھڑی ہو جیسے

سانس یوں دُکھتی ہوئی آتی ہے
سولی سینے میں گڑی ہو جیسے

ہم گلے لگ کے ترے یوں روئے
یہ جدائی کی گھڑی ہو جیسے

پاؤں اُٹھتے نہیں در سے تیرے
لاکھ زنجیر پڑی ہو جیسے

ہم نے اس عمر میں یوں عشق کیا
آنکھ بس تجھ سے لڑی ہو جیسے

اشک شعروں میں پروئے ہیں شمیمؔ
ایک موتیؔ کی لڑی ہو جیسے

زخمی دل اور درد سویرا تیرے نام
بہتے آنسو آگ کا دریا تیرے نام

نام ہیں تیرے جھلمل کرتے تارے سب
چاند کا دھندلا پڑتا چہرا تیرے نام

شامِ گرما کی پُر رونق یاد کا درد
صبحِ سرما کا سناٹا تیرے نام

تیرے نام برستے دن کی خنک ہوا
لمبی رات کی قاتل پُروا تیرے نام

توڑنے والوں نے جو توڑا وہ رشتہ
اور جو بندھن ہم نے باندھا تیرے نام

تیرے قرب میں جو کچھ ہارا وہ قسمت
تیری دوری میں جو جیتا تیرے نام

وقت نے روز و شب کی بساط پہ مات تو دی
وقت سے ارفع دل کا ناتا تیرے نام

کرنل طلا محمد نازؔ سرحدی

۱۹۳۷ء کے پہلے دن کا سورج ایک سرحدی خاندان میں نئی روشنیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ کرنوں کی چمک کے ساتھ محلے کے لوگوں نے ایک نومولود بچے کے رونے کی آواز بھی سنی جس کا نام طلا محمد خان رکھا گیا۔ یہی بچہ بعد میں ادبی حلقوں میں ناز سرحدی کے نام سے مشہور ہوا۔

جناب طلا محمد خان نے سکول اور کالج کی تعلیم کے بعد فوج کو اپنے مستقبل کے لئے چنا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی سے کمشن حاصل کیا۔ آرڈیننس کور میں آپ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں ڈپٹی اتاشی دفاع بھی رہے۔ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کے ڈپٹی پریذیڈنٹ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں اور میرے خیال میں یہی وہ دور تھا جب آپ ادبی حوالے سے پہچانے جانے لگے۔ آپ نے نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا جس نے آپ کی کافی رہنمائی کی۔ تیس سال تک فوج میں فرائض کی ادائیگی کے بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو آپ ریٹائر ہو گئے۔

۱۹۸۶ء میں آپ کا مجموعۂ کلام "دریچۂ دل" چھپ کر منظر عام پر آیا تو آپ کو ادبی حلقوں میں مزید روشناس کرا گیا۔ گو کہ اس سے پہلے آپ مختلف جرائد و رسائل میں چھپتے رہتے تھے اور لوگ آپ کی سوچ اور فکر سے آگاہ تھے۔

نازؔ سرحدی اپنی عسکری مصروفیات سے تھوڑا بہت وقت شعر و سخن کے لئے ضرور نکالتے رہے۔ اہل ذوق نے آپ کے کلام کو پڑھ کر ایک بار پھر کلاسیکل انداز کی غزل سے لطف اندوز ہو کر روحانی و وجدانی تسکین حاصل کی اور بقول یوسف رجا چشتی "آپ کا کلام جہاں سادہ اور پر خلوص ہے وہاں اسے تجربے، تجزیئے اور قوتِ بیان سے مرصع کر دینا بھی ناز کا حصہ ہے"۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کرنل طلا محمد ناز سرحدی نے نئی سوچ اور فکر دی بلکہ یہ بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا کہ آپ نے شاعری میں سچی اور کھری باتوں کو کلاسیکل انداز میں کہنے کو فروغ دیا۔ آپ نے صرف غزل ہی نہیں کہی بلکہ نظم میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ جس میں حمد اور نعت بھی ادب و احترام کے تمام ملفوظات کو سامنے رکھ کر پیش کی ہے ○○○

اے وطن

تو جو آیا بھی تو دو صدیاں ٹھہر کر آیا
اپنے دشمن کو مگر خاک بسر کر آیا

کتنے سفاک تھپیڑوں میں سفر کر آیا
کتنی منہ زور ہواؤں سے گزر کر آیا

تجھ پہ لاکھوں ہوئے قربان میرے پیارے وطن
اب کروڑوں کی ہے تو آن میرے پیارے وطن

تیری عظمت کے نگہبان میرے پیارے وطن
ہم بڑھائیں گے تری شان میرے پیارے وطن

تجھ کو ہر دور میں آفات نے گھیرے رکھا
ہم نے روشن در و دیوار کو تیرے رکھا

تیرے اغیار کا منہ الٹا ہی پھیرے رکھا
نور سفاک اندھیروں میں بکھیرے رکھا

ہے دعا تا بہ ابد تو یوں ہی آزاد رہے
صحنِ گلشن ترا مہکے یوں ہی آباد رہے

غزل

کتنا مشکل ہے خدوخال کو منظر کرنا
پھر اُنہیں رنگ کے جادو سے مصوّر کرنا

پہلے رہنا کسی تاریک سی تنہائی میں
پھر کسی نور سے سوچوں کو منوّر کرنا

تیرا جانا بھی صباؤں کی طرح نرم و لطیف
تیرا آنا بھی فضاؤں کو معطر کرنا

ہے تری زلف کا شانے پہ پریشاں ہونا
لہر کو موج کے کاندھے پہ سمندر کرنا

کون رہتا ہے تری آنکھ میں پتلی کی طرح
کس نے جانا ہے ترے دل کو مسخّر کرنا

آخرِ کار تجھے وقت نے سکھلا ہی دیا
اپنے چہرے پہ مرے غم کو اجاگر کرنا

نازؔ صدیوں کی رفاقت سے یہ سیکھا ہم نے
پاس رہ کر بھی جدائی کو مقدر کرنا

کرنل سید آغا نواب عالم بارہوی

۱۹۳۸ء کا سن اس لحاظ سے بھی ہمارے ذہنوں پر نقش ہے کہ ہمارے عظیم رہنما حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہمیں ایک منزل کی جانب رواں کرکے بلکہ کشتی کو بھنور سے نکال کر خود موت کے بھنور میں ڈوب گئے۔ وہ کشتی ساحل پر بڑے طمطراق کے ساتھ لگی لیکن افسوس کہ آپ اپنی زندہ آنکھوں سے اسے نہ دیکھ پائے۔ اسی سال ۲۰ جون کی شب کو سید نواب عالم پیدا ہوئے۔ غلامی کی تلوار ابھی تک ہمارے سروں پر لٹک رہی تھی۔ لیکن کاروانِ آزادی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ انہی حالات میں آپ نے شعور و آگہی کی دنیا میں قدم رکھا۔ گو بچپن کا دور تھا، لیکن کشیدہ حالات اور آزادی کی تحریک نے آپ کے گوشۂ ذہن میں جگہ پالی۔

جناب سید آغا نواب عالم بارہوی نے تعلیم کی ابتداء غلامی کے دور میں اور اختتام حصول آزادی کے بعد کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد درس و تدریس کو بطور پیشہ اپنایا اور دس سال تک ایچی سن کالج لاہور، ایف سی کالج لاہور اور کوہاٹ کالج میں علم و حکمت کے موتی بکھیرتے رہے۔ آپ قوم کے اس سرمائے کو منظم دیکھنا چاہتے تھے جس کو آپ پروان چڑھا رہے تھے۔ لیکن کچھ مایوسی کے احساس نے آپ کو فوج کی جانب راغب کیا اور آپ اس منظم ادارے میں شامل ہوگئے۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۶۸ء کو آپ نے آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن حاصل کیا اور اپنے ذوق و شوق کی تکمیل یعنی درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ ذہن کو یہاں کا ڈسپلن، فیتھ اور یونٹی (تنظیم، یقینِ محکم، اتحاد) اتنا پسند آیا کہ یہیں کے ہو کے رہے اور تب گئے جب آپ کی مدتِ ملازمت پوری ہو چکی تھی۔

بچپن کے مشاہدات نے آپ کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا، عملی زندگی میں آتے ہی انہیں لفظوں کی زبان دینے لگے۔ آپ نے نظم اور نثر دونوں اصناف کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۳۸ء کی لاج رکھتے ہوئے آپ نے "بصیرتِ اقبال" لکھی اور فوج کی پسندیدگی کا اظہار آپ نے "سیاچن کے ہیرو" کی صورت میں کیا۔

آپ کے قلم میں ایک نمایاں قسم کی خوشبو پائی جاتی ہے جو آپ کے اشعار سے نکل کر پھیلتی ہے تو ذہنوں کو معطر کر دیتی ہے۔ ○○○

آج اور کل

کیوں یہ کہتے ہو کہ کل جشنِ بہاراں ہوگا
تم میں دم خم ہے تو اس آج کو روشن کردو
کچھ بھی تم سے نہیں ممکن تو پھر اتنا تو کرو
کل کے وعدوں پہ ہی عائد کوئی قدغن کردو

تم نے مستقبلِ روشن کا بہانہ کرکے
حال کو مفلس و تاریک بنا رکھا ہے
جو نہ اب تک کبھی آیا ہے نہ آئے گا کبھی
تم نے ہر شوق کو اس کل پہ اٹھا رکھا ہے

نیکیاں ٹال کے کل پر اکثر
آج ہر عیب کو سینے سے لگا لیتے ہو
ہائے اس عیب کی لذت میں جو شب کشتی ہے
اس میں تم دن کے اجالے بھی چھپا لیتے ہو

غزل

تُو یوں تو ازل سے ہی مسلمان رہا ہے　　کیا عقل سے اب بھی اسے پہچان رہا ہے
مذہب ترا ایمان تری جان رہا ہے　　پر اتنا بتا تو کبھی انسان رہا ہے
سب خواب بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے ہیں　　جب ہاتھ میں سچائی کا میزان رہا ہے
حسرت ہے نگاہِ غلط انداز کی یارو　　اک سر نہ جھکانے کا یہ نقصان رہا ہے
اس شیخ کو معلوم نہیں تیرا ٹھکانہ　　بیچارہ حرم کو ہی خدا جان رہا ہے
اک شوخ کے ہونٹوں پہ ترے حسن کا چرچا　　اب خاک مرے عشق کا امکان رہا ہے
پہلو میں حسینوں کو بٹھا رکھا ہے تو نے　　اے حسنِ ازل میرا بھی کچھ دھیان رہا ہے

میں جھانکتا ہوں روزنِ دیوارِ حرم سے
تجھ کو بھی کبھی ملنے کا امکان رہا ہے

کرنل افتخار حسین نقوی (افتخار اسیر)

سادات خاندان کے اس چشم و چراغ کا نام آپ کے والد سید تعظیم حسین نقوی نے افتخار حسین رکھا جوان ہوئے تو جذبوں نے افتخار اسیر بنا دیا لیکن پھر ۰۰۰ خاندانی اثرات کے باعث (ہر شے اپنی اصل کو لوٹتی ہے) واپس سید افتخار حسین نقوی کی جانب لوٹ آئے۔ آپ کی اسیری کا زمانہ محبتوں کی آغوش اور نفرتوں کے انگاروں پر گزرا۔ یعنی کہ آپ کی اسیری کے دو دور ہیں ایک تو وہ جب آپ کسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر افتخار اسیر بن گئے تھے اور دوسرا دور وہ جب آپ دیارِ عدو میں دشمنِ وطنِ پاک کے اسیر رہے یہ دونوں زمانے بڑے صبر آزما تھے اور ان دونوں ادوار کی یادیں ایک مدت گزرنے کے بعد آج بھی آپ کو کبھی کبھی تڑپا دیتی ہیں۔

جناب سید افتخار حسین نقوی جون ۱۹۴۵ء میں مالیر کوٹلہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اوکاڑہ سے حاصل کی۔ اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ہوتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی تک جا پہنچے جہاں سے آپ ماسٹر کی ڈگری لے کر نکلے۔ یہ دور ایسا ہوتا ہے جب امنگیں جوان ہوتی ہیں اور آرزوئیں دامن گیر، چاہتیں اور محبتیں قدم قدم پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ آپ بھی انہی اداؤں کی گرفت میں آگئے اور پھر یادوں کو سمیٹے جون ۱۹۶۷ء میں فوج میں آگئے۔ کمشنڈ افسر بنے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ "اسیرِ غم" کو محاصلِ زندگی کے نام انتساب کر دیا۔ یہ آپ کی پہلی قلمی کاوش تھی۔ جو آپ کے یونیورسٹی کے زمانے کی کہی ہوئی غزلوں اور نظموں پر مشتمل تھی۔ ۱۹۷۱ء میں سابقہ مشرقی پاکستان میں تھے کہ پھر اسیر ہو گئے۔ اس قید سے رہائی ملی تو "غمِ جاناں" کے رنگ میں نئی تخلیق سامنے آئی اور پھر یوں چپ لگی کہ آج تک ایک شعر بھی نہیں کہا۔

آپ کی شاعری کا اندازہ آپ کی دونوں کتب کے عنوانات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے غموں اور کیسے دکھوں کا مجموعہ ہو گی۔ یہی دکھ درد آپ کی زندگی کا حاصل ہیں۔ لیکن آپ کسی کو دکھ دیتے نہیں دوسروں کے درد سمیٹتے ہیں۔ یہی محاصل، سوز و گداز، درد و غم اور محرومی کی تصویر آپ کے آئینۂ شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ "شاعری میرا پیشہ نہیں یہ اشعار زندگی کے خاص ادوار سے متعلق ہیں جو کہ بہت گراں بار گزرے ہیں ان اشعار کو میں محاصلِ زندگی سمجھتا ہوں" ○○○

غزلیں

ان کو زلفیں سنوارتے دیکھا ہاتھ سے مار مارتے دیکھا
اپنی ہستی پہ زُعم تھا جن کو ان کو رسموں سے ہارتے دیکھا
ہم نے اصنام کو مصیبت میں اللہ اللہ پکارتے دیکھا
کیسے کیسے حسین لوگوں کو عمر تنہا گزارتے دیکھا
وقت کے آہنی تھپیڑوں سے
ہم نے ہمت کو ہارتے دیکھا

رات آنکھوں میں بسر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں در پہ بے تاب نظر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
جس پہ ہو تیرا گزر، ساتھ رقیبوں کے مرے وہ مری رہگزر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
میرا ہر شعر مرے دل کے لہو کا قطرہ تیری نظروں میں نشر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
تیری نظریں، تیرا انداز، یہ گفتار، صنم تیرا ناوک بھی ادھر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں
مے جو پیتا ہوں تو یادوں کو بھلا دیتا ہوں
یہ ہی پینے کا عذر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں

کرنل اظہر حسین نقوی

شاعری میں نظم کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ شاعر اپنی ہر سوچ کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ پھر آزاد نظم اور اب نثری نظم نے اس کو بہت زیادہ وسعت دے دی ہے اور تمام پابندی کی الجھنوں اور مجبوریوں سے پاک کر دیا ہے۔ یوں شاعر کے فکر و بیان میں کوئی ایسی دیوار حائل نہیں رہی جسے ناپانہ جاسکے۔ اس میدان میں ن م راشد، مجید امجد اور اختر الایمان جیسے کئی شعراء نے بڑا مقام پایا ہے۔ اور شاعری کے کینوس پر نظم کے وہ رنگ بکھیرے ہیں کہ یہ ایک تجریدی آرٹ دکھائی دینے لگ گیا ہے۔

یوں تو جناب اظہر حسین نقوی بھی اسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آزاد نظم کی ہیئت میں دلی کیفیات کو عام آدمی تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن آپ بالکل ن م راشد بن کر نہیں رہ گئے۔ بلکہ کبھی مجید امجد کے نقش قدم پر چلے ہیں اور کبھی احمد شمیم کے۔ یعنی کہ آپ نے پابند نظم بھی کہی ہے اور بڑی پیاری مثلاً آپ کی نظم "آئیڈیل" ہے۔

اے مری ماہ کی مانند درخشاں تصویر
اے مری روح مرے خواب کی زندہ تصویر

اے مری جانِ غزل، اے مری صبحِ تنویر
میری عذرا، میری لیلیٰ، میری شیریں، میری ہیر

تجھ کو دیکھا ہے تو محسوس ہوا ہے ایسے
جیسے مفلس کو دو عالم کا خزانہ مل جائے

جیسے بھٹکے ہوئے راہی کو ملے منزلِ شوق
یا اچانک کسی مجنوں کو لیلیٰ مل جائے

تیرے چہرے کی ضیاء تیرے تبسم کا غرور
میرے افکارِ پریشاں کو ملے جیسے شعور

میری موہوم تمناؤں کا حاصل تو ہے
سچ تو یہ ہے کہ مرے شوق کی منزل تو ہے

کرنل اظہر حسین نقوی کا شمار بھی پاکستان آرمی کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا۔ یعنی پڑھے لکھے ہوؤں میں جو پڑھے لکھے گنے جاتے ہیں۔ جنہیں ہم ایجوکیشن کور کے نمائندہ کہتے ہیں۔ آپ ۵ مارچ ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ سول میں سیٹ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ذہنی موافقت نہ ہو پائی اور آپ فوج میں آگئے۔ ۲ نومبر ۱۹۶۹ء کو آپ نے کمشن حاصل کیا اور اپنے آپ کو اس ادارے کے لیے وقف کر دیا۔ ○○○

پودا

میں ہوں ایک تناور پودا
میری شاخیں مشرق مغرب
دور افق تک پھیلی ہیں
دیس بدیس کو آتے جاتے سارے راہی
میرے پھل سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں
آندھی، بارش، جھکڑ آئیں
آ، آکر مجھ سے ٹکرائیں
میرا سینہ سب کچھ سہہ کر
اور بھی چوڑا ہو جاتا ہے
میرے دیس کے اپنے باسی، میرے ساتھی
اوروں کو بھی ساتھ ملا کر
آج نجانے کیسے میری شاخیں کاٹنے آئے ہیں
غیروں کا افسوس نہیں کچھ
غیروں کا تو دوش نہیں کچھ
ان کی تو للچائی نظریں میرے پھل پر رہتی ہیں
میری شاخیں کاٹنے والے
تیری اپنی سوچ نہیں کیوں؟
میرا جیون تیری خاطر
تیرا جیون کس کی خاطر؟
تجھ کو اپنا ہوش نہیں کیوں؟

گروپ کیپٹن نیاز احمد (این اے صوفی)

بزم فکر وفن کے تحت مشاعرہ تھا۔ سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ "اب اپنا کلام سنانے کے لئے تشریف لاتے ہیں جناب این اے صوفی" میں نے سوچا کہ کوئی بزرگ شخصیت ہونگی بڑی بڑی داڑھی، ہاتھ میں تسبیح، اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے آئیں گے اور نعتیہ کلام سے نواز کر تسبیح گھماتے چلے جائیں گے لیکن جب صوفی صاحب تشریف لائے تو بہترین سوٹ میں ملبوس، بے ریش یعنی کلین شیو، چال میں تمکنت، وجیہہ و شکیل، خالصتاً فوجیوں والا رعب داب، سارا تصور دھڑام سے ٹوٹ گیا۔ مشاعرے کے بعد جب مصافحہ و معانقہ ہوا اور گفتگو ہوئی تو یوں لگا کہ حضرت کے اندر واقعی ایک صوفی "پتھلز" مارے بیٹھا ہے۔

جناب این اے صوفی نے ۷ا اپریل ۱۹۴۲ء کو پنجاب کی مردم خیز دھرتی سیالکوٹ میں جنم لیا آپ کے والد کا نام صوفی محمد یعقوب تھا۔ جو آج اس دنیا میں نہیں۔ آپ کے آباؤاجداد تقریباً سو سال پہلے کشمیر سے ہجرت کرکے سیالکوٹ آکر آباد ہوئے تھے۔

گروپ کیپٹن نیاز احمد نے سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کی اور مرے کالج سے بی اے کیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۵ء کو آپ نے ایئر فورس میں پائلٹ افسر کی حیثیت سے کمشن لیا اور چند ہی دن بعد رن کچھ کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دشمن سے دو دو ہاتھ کئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں بدین، سکیسر اور سرگودھا کے مقامات پر بڑے دلیرانہ فرائض انجام دیئے۔ چونکہ آپ ایم اے کی کلاسز سے اٹھ کر فوج میں آئے تھے لہذا اس کمی کو علوم حرب میں بی ایس سی کرکے پورا کیا۔

آپ کی شاعری موضوعاتی شاعری ہے جس میں دھرتی، دریا، کناروں کے استعارے اور محبت و نفرت کی تفسیر بھی ملتی ہے۔ آپ کے ہاں رسم و رواج کی چھوٹی چھوٹی جذباتی اور پرکشش فصیلیں جابجا ملتی ہیں۔ آپ کا لہجہ آپ کی گفتگو اور آپ کی تحریر آپ کے احساسات اور آپ کی ذات کی سچی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ کی غزل اور نظم فکر کی بلندی خیالات کی وسعت اور جذبات کی گہرائی کی امین ہے۔ آپ شہرت کے خواہاں نہیں ورنہ کسی نہ کسی رسالے یا جریدے میں آپ کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور مل جاتی۔ ہاں ••• آپ نے اپنا مجموعہ کلام "روپ، دھوپ اور صحرا" منظر عام پر لاکر اہل علم وادب میں عزت و شہرت ضرور پائی ہے اور یہی مجموعہ آپ کی پہچان بن کر ابھرا ہے ○○○

غزلیں

آنسوؤ شام کی پلکوں پہ لرزتے رہنا ڈوب جائے جو یہ منظر تو برستے رہنا
اس کی عادت تھی ہر اک بات ادھوری کرنا اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا
آگ سے سیکھ لیا ہے یہ قرینہ ہم نے بجھ بھی جانا تو بڑی دیر سلگتے رہنا
دل میرا اب بھی دھڑکتا جو یہ ممکن ہوتا کسی ٹوٹے ہوئے برتن کا کھنکتے رہنا
وہ ہنسی چھوٹ نہ جائے جو چھپا رکھی ہے میں مناؤں تو مرا ہاتھ جھٹکتے رہنا
رات باقی ہے ابھی جاگتے رہنا صوفی
اپنے سوئے ہوئے خوابوں کو تھپکتے رہنا

میرے جرموں کی سزا مجھ کو سنا دی جائے پر مرے گھر میں لگی آگ بجھا دی جائے
گر کوئی بات ہو اپنوں کی جو اچھی نہ لگے یہی اچھا ہے کہ وہ بات بھلا دی جائے
جو مرا دشمنِ جاں ہے مرا دلدار بھی ہے کیوں نہ جاں اُس پہ مروّت میں لٹا دی جائے
دل تو پتھر ہے مگر دیکھ رہا ہوں منظر اب میری آنکھ بھی پتھر کی بنا دی جائے
ایک دیوارِ شکستہ پہ جو باقی ہے ابھی لوگ کہتے ہیں وہ تختی بھی ہٹا دی جائے
مفلسی اس لئے دیتی ہے مسلسل پہرہ
تاکہ جو آرزو جاگے وہ سلا دی جائے

لیفٹننٹ کرنل فیض احمد فیض

فیض احمد فیض کے بارے اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ مزید کچھ تبصرہ کرنا میرے بس کا روگ نہیں
فیض نے خود بھی اردو، پنجابی، انگریزی اور فارسی میں شاعری، تنقید اور تحقیق میں صفحات کے ڈھیر لگا
دیئے۔ جس کا منہ بولتا ثبوت (اُردو میں) "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا"، "زندان نامہ"، "دستِ تہِ
سنگ"، "صلیبیں مرے دریچے کی"، "سرِ وادیِ سینا"، "میزان"، "متاعِ لوح و قلم" اور "شامِ شہرِ
یاراں" وغیرہ جیسی روشن کتابیں ہیں۔ اسی طرح فیض پر لکھنے والوں نے بھی ہر زبان میں طبع آزمائی
ہے۔

جاٹ قوم کے تتلہ قبیلے کے سلطان احمد خان اور سلطان فاطمہ کے گھر کالا قادر تحصیل نارووال
ضلع سیالکوٹ میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہونے والے اس بچے کے بارے کون جانتا تھا کہ بڑا ہو کر یہ آسمانِ
ادب کا درخشندہ ستارہ بنے گا۔ ابتدائی تعلیم میں عربی، اردو اور فارسی کے علاوہ قرآن مجید حفظ کیا اور
۱۹۲۱ء میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں میٹرک ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ ۱۹۳۱ء
میں بی اے اور پھر عربی میں آنرز کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم اے فرسٹ ڈویژن
میں پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں عملی زندگی کا آغاز ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت
سے کیا۔ ۱۹۴۲ء میں اسے خدا حافظ کہہ کر فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں کیپٹن کے عہدے پر کمشن
لے لیا۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں لیفٹننٹ کرنل بنا دیئے گئے اور پھر کچھ ہی عرصے بعد
ریٹائرمنٹ لے لی۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد "ڈیلی پاکستان ٹائمز"، "روزنامہ امروز" اور ہفت
روزہ، "لیل و نہار" کے مدیر رہے۔ فوج میں آنے سے پہلے ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء میں ماہنامہ "اَدبِ
لطیف" کے مدیر رہ چکے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں پہلی بار سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور راولپنڈی
سازش کیس میں چار سال ایک ماہ اور گیارہ دن تک سرگودھا، ساہیوال، حیدر آباد، کراچی اور لاہور کی
جیلوں میں قید رہے۔ ۱۹۵۹ء میں فیض پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔
۱۹۶۲ء میں آپ لندن چلے گئے اسی سال آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں روس کا مشہور ترین
لینن ایوارڈ دیا گیا۔ دو سال لندن میں رہنے کے بعد واپس لوٹے اور سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل
مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں اسے چھوڑ دیا اور بیروت میں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے ترجمان رسالے
LOTAS کے ایڈیٹر بنے۔ کچھ عرصہ فلمی صنعت سے بھی وابستہ رہے۔ اور پھر ۷۴ سال کی عمر میں
۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے○○○

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیِٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخیِٔ یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

غزل

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

لیفٹیننٹ کرنل شیر محمد شاد

پنڈی گھیب کی "سیل ندی" کا پانی گدلا گدلا ہوا
نام تھا شیر محمد اس کا "شاد" تخلص کرتا تھا

"دندی" گاؤں کے بام و در کا رنگ اداس سلیٹی ہے
مہر و خلوص کی وہ مورت اس مٹی میں آلیٹی ہے

(سید ضمیر جعفری)

وہ یاقوت موتی وہ ہیرا وہ پنا
وہ تھا اک دہاتی وہ دندی کا شہری
وہ مخلص تھا انساں وہ شاعر تھا سائل

وہ کانِ محبت کی جانِ وفا تھی
کبھی اس کی گونجوں سے گونجی فضا تھی
وہ کرنل تھا اور اس کی عظمت جدا تھی

(محمد توکل سائل)

لارڈ آف دندی جناب شیر محمد شاد ولد عبداللہ خان ۱۹۱۵ء میں موضع دندی تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پنڈی گھیب سے حاصل کی۔ پھر اٹک، راولپنڈی اور لاہور میں کالجز کی تعلیم حاصل کی۔ اور دوسری جنگِ عظیم جب چھڑی تو فوج میں آگئے۔ میری نظروں سے تین مختلف حوالے گزرے ہیں۔ ایک حوالہ تو یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء میں جب آپ مصر گئے تو صوبیدار تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جب پونا آئے تو لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ دوسرا حوالہ یہ ہے کہ آپ نے سرداری کمشن لیا اور شمالی افریقہ چلے گئے۔ لیکن بقول آپ کے داماد بابو شیر محمد آپ نے آرڈننس کور میں بحیثیت سیکنڈ لیفٹیننٹ کمشن حاصل کیا۔ آپ کی تعلیم کے بارے بھی ان کا کہنا ہے کہ لارڈ صاحب نے ایم اے اور ایل ایل بی امریکہ سے کیا۔ بہرحال ملازمت کے دوران نگر نگر کی سیاحی کی۔ آزادی کے بعد پاکستان آرمی میں منتقل ہو گئے۔ ۳۲ سال تک عسکری خدمات ادا کیں۔ ریٹائرمنٹ پر کوکا کولا فیکٹری سیالکوٹ میں مینجنگ ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں کو اپنا مسکن بنایا اور اس کی حالت کی بہتری کے لیے سرگرم ہو گئے۔ بجلی لگوائی، سڑک کی کوشش میں تھے کہ ۲۴ جون ۱۹۸۰ء کو آپ رحلت فرما گئے۔

آپ اپنی زندگی میں ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ایک رسالہ "قیادت" بھی جاری کیا تھا۔ لیکن اپنی تحریریں یکجا کر کے شائع نہیں کرا سکے۔ آپ کے احباب نے آپ کی وفات کے بعد آپ کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب "تذکارِ شاد" شائع کی اور پنڈی گھیب میں "حلقۂ اربابِ شاد" قائم کیا جو کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ○○○

غزل

محبت جو روحِ رواں ہو گئی ہے یہی زندگی جاوداں ہو گئی ہے
جہاں بھی تری زلف کی چھاؤں لپکی وہاں کی زمیں آسماں ہو گئی ہے
میری ریشماں کی جوانی سے کہنا ترے ساتھ ہر شے جواں ہو گئی ہے
مرے شوق کی حسرتِ خود نمائی چمن در چمن نغمہ خواں ہو گئی ہے
کبھی سنگ بھی برگِ گل بن گیا ہے کبھی چاندنی بھی گراں ہو گئی ہے
بہر گام اک تجربہ منتظر تھا ہر اک سانس اک داستاں ہو گئی ہے
تری یاد کی روشنی جب بھی چمکی یہ ساری زمیں گلفشاں ہو گئی ہے
عقائد بھی تلنے لگے جنس بن کر محبت بھی سود و زیاں ہو گئی ہے
وہیں شادؔ نبضِ جہاں تھم گئی ہے
ملاقات ان سے جہاں ہو گئی ہے

محسوسات

کیا حسن ہے جو زندہ کرامات نہیں ہے یہ بات نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ہے
بدذوقیٔ ساقی کی کریں کس سے شکایت محفل میں کوئی پیرِ خرابات نہیں ہے
اے شمع جواں سال سرِ شام یہ رونا؟ یہ روگ ہے اک عمر کا، اک رات نہیں ہے
وابستہ نہیں رُت سے غمِ دل کی بہاریں اشکوں کا کوئی موسمِ برسات نہیں ہے
اے چشمِ جواں بخش دے ویرانیٔ دل کو وہ درد کہ آلودۂ حالات نہیں ہے
اسباب کے اخلاص کا ممنون ہوں کہ اب
اندیشۂ پامالیٔ جذبات نہیں ہے

لیفٹننٹ کرنل مشتاق احمد

ایک زمانہ تھا کہ بچوں کو گھر پر یا مدرسے میں عربی اور فارسی تعلیم مذہبی فریضہ اور قومی تشخص کے لئے دلائی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم نصف صدی سے پہلے کی بات کرتے ہیں تو اس دور کے اہل علم و ادب کے ساتھ یہ تتمہ لگا دیتے ہیں کہ موصوف نے عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر یا فلاں مدرسے میں فلاں مولانا سے حاصل کی۔

لیفٹننٹ کرنل مشتاق احمد کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو گھر سے بہت کچھ پڑھ لکھ کر سکول کا رخ کرتے ہیں۔ آج کل کے بچوں کی طرح نہیں کہ استاد ہی پڑھائیں تو پڑھائیں والدین کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا ۔۔۔ چونکہ آپ کے والد میاں عبدالحمید باعلم اور علم دوست آدمی تھے لہذا انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت روائتی انداز میں کی اور تعلیم ماحول کے مطابق دلوائی۔

جناب مشتاق احمد نے آزادی سے پہلے متحدہ ہندوستان میں کمشن حاصل کیا کچھ ہی عرصے کے بعد جب اللہ رب العزت نے مسلمانان برصغیر کو اپنے علیحدہ وطن سے نوازا تو آپ بھی پاکستان آرمی میں آ گئے اور ایک مدت تک عسکری خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا تھا اور ماحول نے آپ کو ادب شناسی کے ساتھ شاعری بھی دی۔ آپ نے شاعری کی تمام اصناف میں کچھ نہ کچھ کہا ہاں البتہ ہائیکو اور سانیٹ کے بارے مجھے شک ہے کہ اسے آپ نے آزمایا یا نہیں ۔۔۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کو ساتھ لے کر چلے اور صحیح صحیح انصاف کیا بلکہ میرے خیال کے مطابق آپ نے فارسی پر کچھ زیادہ توجہ دی جس کا ثبوت "زیستم" ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس زبان کو اس لئے اہمیت دی کہ شاید یہ کچھ ہی عرصہ بعد ختم ہونے والی ہے ۔۔۔ صرف ہمارے ہاں۔

ترا گویم فقیرِ بے نوائم
نے سازم کسے را آشنائم
ہزاروں درد دارم در دلِ خویش
ولے ہر درد را من خود دوائم
نہ من ساقی نہ مے خانہ پرستم
نہ مے خوردم نہ پیمانہ شکستم
بیاں کردم بتو افسانہ خویش
ز شوقِ تو ز خود بیگانہ ہستم

ooo

رمزِ کن فکاں

ستاروں کا جہاں میرا جہاں ہے کہ رمزِ کن فکاں مجھ پر عیاں ہے
نہیں محدود پروازِ تخیل مری دنیا فضائے بیکراں ہے

حُبِّ وطن

کسی کو لعل و گوہر کی لگن ہے کوئی بس خود پرستی میں مگن ہے
مبارک سیم و زر اہلِ وطن کو مری دولت مری حبِّ وطن ہے

حسنِ لایزل

یہ حسنِ لایزل کی دلکشی ہے مجھے حاصل سرودِ سرمدی ہے
فضائے حسن پروازِ تخیل بہت پُرکیف میری زندگی ہے

بخشش

ستارے بھی قمر بھی آسماں بھی نظر بھی دل بھی اندازِ بیاں بھی
مجھے بخشا مرے ذوقِ نظر نے مکاں بھی، لامکاں بھی اور زماں بھی

اسیرِ ذرہ

حکیمِ عہدِ حاضر نے کیا فاش دلِ ذرہ کو اسرارِ نہاں کو
پلٹ دی کائناتِ فکر و دانش اسیرِ ذرہ کر ڈالا جہاں کو

مدعائے زیست

سن اے ناآشنائے زندگانی توجہ سے نوائے زندگانی
مسلسل کشمکش پیہم تجسس یہی ہے مدعائے زندگانی

★

لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب

اربابوں کے اس چشم و چراغ کو اگر ارباب خاندان کی نسل نو کا بانی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ پاکستان بننے کے بعد آپ نے اتنی شہرت پائی اور خانوادے کو ایسی بنیاد مہیا کی کہ ارباب آج اس پر قائم ہیں آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں شمولیت کی۔ جب پنڈی سازش کیس میں ملک کی کچھ ممتاز شخصیات اسیر ہوئیں تو آپ اس وقت 1/1 پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ پنڈی سازش کیس میں آپ کو بھی دو سال قید بامشقت اور ۵ سو روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ۶ ماہ قید بامشقت کی سزا کاٹنا تھی۔ نیز ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ لیکن دو ہی سال بعد یعنی ۲۴ مارچ ۱۹۵۵ء کو رہا کر دیئے گئے۔

پھر جب جنرل محمد ضیاء الحق کا دور آیا تو آپ کو وزارت کا عہدہ تفویض ہوا۔ جسے آپ نے باحسن ادا کیا اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

آپ کے اندر ایک شاعر جو موجود تھا وہ جیل کے دوران کھل کر سامنے آیا۔ اور آپ نے احباب اور ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرصت کے لمحات کو بہتر استعمال کیا۔ ○○○

غزل

کون لیتا ہے جہاں میں آج فرزانے کا نام
اب تو بس مشہور ہے بھینگے[1] یا کانے کا نام

اہل کاروں کی عنایت ہے کہ اب ملتا نہیں
خطۂ زرخیز میں گندم کے اک دانے کا نام

بھوک اور افلاس کا شکوہ نہیں واجب تمہیں
گھیر لیں گے "سیفٹی"[2] میں گر لیا کھانے کا نام

حامئ جبر و تشدد ہو گئے اہلِ حکم
چھا رہا ہے آج سارے دیس میں تھانے کا نام

ہم تو اٹھ بھاگیں گے ملکِ پاک سے پیارے ندیم
شرع کی رو سے ہوا ممنوع جب گانے کا نام

آباؤ اجداد کی باتوں کو چھوڑو اے نیازؔ
کس کو دلچسپی ہے کیا تھا آپ کے نانے کا نام

★

۱۔ روئے سخن غالباً استغاثہ کے وکیل اے کے بروہی کی طرف ہے جن کی آنکھ میں کچھ نقص تھا۔
۲۔ سیفٹی ایکٹ جس کے تحت آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔

لیفٹیننٹ کرنل راجہ ظہور اختر کیانی

کرنل جنرل ہو کے اختر کیتی کیہہ کمائی
بڑے بڑے جرنیلاں اپنے نام کی لُٹ ای لائی
ایہہ دنیا دی عزت دولت رہ جاسی آ ایتھے
اگلی دی کجھ سوچ کری کہن جانا آخر جتھے
اوہ جرنیل ای ایس دنیا ناں راتیں سجدے مہنا
داتا نے اوہ نیڑے ہو کے اگلے رتبے لینا

اس صوفیانہ کلام میں کرنل ظہور اختر نے بڑی پیاری اور سچی بات کی ہے۔ بلکہ آپ کی پوری شاعری پڑھ کر آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی ایک سخت گیر فوجی افسر کی یہ سوچ ہو سکتی ہے؟ بلکہ یہ کسی ولی اللہ کا فکر و خیال لگتا ہے لیکن میری طرح اگر آپ کو بھی یقین نہ آئے تو "ڈوہنگے سمندر" پڑھ کر دیکھ لیں۔ ایک ایک شعر سے تصوف کی جھلک آپ کو دکھائی دے گی اور اس پر طرہ یہ کہ آپ نے شاعری اپنی مادری زبان پوٹھوہاری میں کی ہے۔

آپ ایک تاریخی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سلطان مقرب خان (والی پوٹھوہار) ایک زیرک اور بہادر حکمران تھے اور اسی وراثت کو سلسلہ بہ سلسلہ سنبھالتے ہوئے آپ کے چھوٹے بھائی میجر مسعود اختر نے ۱۹۶۵ء میں معرکۂ چونڈہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

شاعری آپ کو باپ کی طرف سے ورثے میں ملی۔ راجہ حسن اختر (آپ کے والد) ایک شاعر تھے۔ آپ کے دوسرے بھائی محمود اختر کیانی اردو کے ایک خوش گو شاعر تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

جناب سلطان ظہور اختر نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد پہلے محکمہ انہار اور پھر فوج سے اپنا مستقبل وابستہ کر لیا۔ سندھ وادی کی سڑک شاہراہِ قراقرم کی ابتدا آپ کی قیادت میں فوجی جوانوں نے کی ۱۹۶۴ء میں آپ کے والد صاحب فوت ہوئے تو آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی اور گھر کو سنبھالا دیا ویسے تو آپ علاقائی زبان میں شاعری کرتے ہیں لیکن عسکری ملازمت کے دوران آپ نے اردو شاعری بھی کی اور اس رسم کو نبھایا۔ ○○○

غازی کے نام

اللہ کی شمشیر تو ایمان کی تنویر تو
قرآن کی تفسیر تو باطل شکن تعبیر تو
غازی قدم بڑھائے جا

پیکر ہے تو ایمان کا حافظ ہے پاکستان کا
کیا کہنا تیری شان کا تو پیشرو طوفان کا
غازی قدم بڑھائے جا

لبیک ہے تیری صدا ہے اپنی ملت پر فدا
حامی ہے تیرا کبریا تو رونقِ ارضِ خدا
غازی قدم بڑھائے جا

تو ہے امیرِ کارواں تو تیغ ہے تو ہے سناں
تو ہے وطن کا نوجواں تو عزم کا کوہِ گراں
غازی قدم بڑھائے جا

تو ہے وطن کی آبرو تو ہے شہیدِ جستجو
تو ہے حدیثِ جاھدو تو ہے متاعِ رنگ و بو
غازی قدم بڑھائے جا

تو ہی تو ہے جانِ وطن تو ہی تو ہے آنِ وطن
تو ہی تو ہے شانِ وطن ہر دم ہے قربانِ وطن
غازی قدم بڑھائے جا

تو عزم کی دیوار ہے تو قوم کی تلوار ہے
تو قوتِ کرار ؓ ہے تو ہر گھڑی تیار ہے
غازی قدم بڑھائے جا
غازی قدم بڑھائے جا

لیفٹننٹ کرنل رشید احمد کیانی ستارۂ جرأت

War is a life and death struggle and a very serious business which quite often culminates into freedom or slavery in the case of nations. War brings out the best or the worst out of an individual, a group of people-be they sub units, units, formations or a nation as a whole.

یہ فلسفہ اس شخصیت کا ہے جس نے اپنی ہمت و مردانگی کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جناب رشید احمد کیانی ۱۴ نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ایک سپاہی کی حیثیت سے آرٹلری میں بھرتی ہوگئے اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۵ جون ۱۹۴۹ء کو آپ نے اسی توپ خانے میں کمشن حاصل کیا۔ آپ ایک پروفیشنل گنر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد پہلی جنگ عظیم میں گنر کی حیثیت سے شامل تھے۔ آپ کے بھائی نے دوسری عالمی جنگ میں حصہ لیا وہ بھی گنر تھے۔ آپ کے بعد آپ کے دو بیٹوں نے آرٹلری میں ہی کمشن پایا۔

لیفٹننٹ کرنل رشید احمد نے ۱۹۶۵ء میں چونڈہ کے محاذ پر خوب جوہر دکھائے۔ آپ کی بے مثال جرأت کے اعتراف میں آپ کو ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں آپ کو خیبر رائفلز کی کمان سونپی گئی۔۔۔ اور یوں ۳۱ سال کا عرصہ مختلف عہدوں پر گزارنے کے بعد آپ ۱۹۷۴ء میں فوج سے سبکدوش ہوئے۔

آپ کی نثر اردو اور انگریزی میں چونڈہ کے حوالے سے کافی معتبر سمجھی جاتی ہے اور آپ کی شاعری اخلاقیات، اسباق اور عین جرأت و دلیری کے پیغامات سے مزین ہوتی ہے۔ بلکہ آپ نے اپنی یادوں کو ہی لفظوں کی زبان دی ہے۔ وہ یادیں جو عسکری زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ OOO

اللہ کی رسی

کفر و الحاد کے ہر بت کو گرایا جائے | ایسا قانون کوئی جلد بنایا جائے
کانپ جاتے تھے در و بام شہنشاہوں کے | پھر وہی نعرہ تکبیر لگایا جائے
آؤ مضبوطی سے اللہ کی رسی پکڑیں | چھوڑ کر ظلم و ستم پیار بڑھایا جائے
یہ خداداد وطن، پاک وطن، پاک زمیں | اس میں قرآن کا دستور چلایا جائے
تو مسلمان، تو غازی، تو مجاہد، تو شہید | کفر کے سامنے سر کو نہ جھکایا جائے

یاد رکھنا یہ بزرگوں کی کہی بات رشید
دشمن دین سے نہ رابطہ بڑھایا جائے

مقصودِ حیات

تصادمِ حق و باطل ہے میرے سینے میں | قرار اب تو نہ مرنے میں ہے نہ جینے میں
نظامِ مصطفویؐ کو نہ بھول اے مسلم | تری حیات کا مقصود ہے مدینے میں
نئے ہے ازم کا دلدادہ اے مسلماں کیوں؟ | منافقت کی یہ موجیں "ترے سفینے میں"
امینِ سنت و قرآں ہیں کب تری باتیں | ہیں آئے دن نئی تبدیلیاں قرینے میں
مٹا کے ظلمتِ باطل فضائیں روشن کر | جمالِ حق رہے دل کے حسیں نگینے میں
طلب جو ہو تو مدینے کی ہو طلب تجھ کو | مزا ہے ساقیِؐ کوثر سے جام پینے میں

رشید دین کی دنیا کی ہر خوشی ہے نہاں
کمی ہے کون سی قرآن کے خزینے میں

لیفٹننٹ کرنل حامد خان (حامد شگفتہ)

۱۹۷۱ء کا سال ہماری تاریخ میں قیامت سے کم نہیں۔ جو کچھ ہوا کوئی بھی محب وطن اور باشعور پاکستانی اسے فراموش نہیں کر سکتا ہمارے کئی اہلِ دل افراد نے دشمن کی قید و بند میں رہتے ہوئے اپنی یادوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کاغذی خزانے میں محفوظ کر دیا ہے۔ انہی حضرات میں جناب حامد شگفتہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی یادیں شاعری میں یکجا کر رکھی ہیں۔ (آپ کیمپ نمبر ۹۹ الہ آباد میں تھے)۔

"صحنِ قفس رقصِ لہو نقشِ وفا ہے"، "زلف کی زنجیر کی جھنکار"، "سنگِ ملامت بھی مرا پاش پاش ہے"۔

بظاہر تو آپ کے مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ لیکن اگر صرف انہیں عنوانات کو ہی بغور دیکھیں تو "صحنِ قفس"، "رقصِ لہو"، "نقشِ وفا"، "زنجیر کی جھنکار"، "سنگِ ملامت"، "پاش پاش" یہ سب ایسے استعارے ہیں جن میں ہمارے ماضی کے دکھ اور غم پوشیدہ ہی نہیں بلکہ جھلک رہے ہیں۔ یہ وہ اذیت ناک درد ہے جو پوری قوم کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ رہا ہے۔

جناب حامد شگفتہ شاعری تو اس سانحے سے پہلے بھی کرتے تھے لیکن وہ صرف طرحی مشاعروں اور روایتی غزل تک محدود تھی۔ مگر اسیری نے آپ کی شاعری کو ایک نیا رنگ دیا۔ قفس میں رہ کر انہوں نے ذہن کی تقدیس اور جسم کی تذلیل کی بات کی ہے۔ ان کی شاعری میں رنگ و گل کے تذکروں کا رنگ اگر ملتا بھی ہے تو وہ صرف طنز اور تعریف کی محدود حدوں تک ہی نظر آتا ہے۔ آپ کے کلام کو پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے اشعار پابندِ سلاسل ذہن کی تخلیق ہیں۔ لیکن یہ قاری یا سامع کے ذہن پر بوجھل یا ناگوار نہیں گزرتے۔ آپ اظہارِ شعر میں اپنے احباب اور قارئین سے مخاطب دکھائی دیتے ہیں۔

لیفٹننٹ کرنل حامد خان شگفتہ اور بمطابق آپ کے مجموعہ کلام میجر حامد شاہ گفتہ ۵ اپریل ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج کا رخ کیا اور ۱۰ فروری ۱۹۵۱ء کو فرنٹیئر فورس رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ ۲۷ سال تک مختلف عہدوں اور سٹاف ڈیوٹیوں پر خدمات انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور بالآخر ۱۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو فوج سے سبکدوش ہو گئے۔○○○

سنگِ ملامت

عبرت گہِ افسانہ، انہیں بھول گیا ہے؟ — یادوں میں سجا نقشِ وفا ذہن رسا ہے
یہ شوق گریزی ہی تو آغازِ وفا ہے — ادراک کے پردوں کو ذرا پھاڑ دیا ہے
پھر شدتِ احساس، یہ ناکردہ گناہی — غیروں نے نہیں، اپنوں نے یہ زخم دیا ہے
کیا کم ہے یہ آتش نہ جلائے نہ دھواں ہو — یہ سایۂ دیوارِ قفس تنگ بنا ہے
پھر زلف کی زنجیر کی جھنکار کی باتیں — صحنِ قفس رقصِ لہو نقشِ وفا ہے
یہ سنگِ لہو رنگ پسِ مرگ ہے میرا — یہ سنگِ لہو رنگ "نظر گاہِ حیا" ہے
اے چشمِ حیا زلفِ سیہ ایک نظر اب — اب سنگِ ملامت بھی مرا پاس ہوا ہے
غیروں کو بتانا ہے محبت کا مری کیا — احساس وفاؤں کا مجھے آج ہوا ہے

پھر زیرِ زمیں توبہ یہ حامدؔ کی اسیری
نادم ہے اسیری میں خدا یاد کیا ہے

رنگ لہو قفس میں

ستم گر سے ایسی محبت ہوئی ہے — کہ مشہور اپنی حکایت ہوئی ہے
چھپایا تھا اپنی وفاؤں کو میں نے — وفاؤں سے پیماں قیامت ہوئی ہے
دیئے رنگِ گل نے جو دھوکے مجھے تو — بس آنکھوں سے اپنی شکایت ہوئی ہے
فصیلوں پہ رنگِ لہو یہ قفس میں — اسیروں پہ تہمت، بغاوت ہوئی ہے
پسِ مرگ آئے ہو آنسو لئے تم — کبھی اس سے پہلے عنایت ہوئی ہے

مجھے آج حامدؔ شگفتہ کہا ہے
گلوں کو بھی خاروں سے الفت ہوئی ہے

لیفٹننٹ کرنل انصار احمد زبیری مظفر

علم دیتا ہے خودی کو پیچ و تاب جہل ہر انسان کو کرتا ہے خراب
جہل سے شاید خرد پائے سکوں علم کو چاہیئے مظفر اضطراب

علم اور جہل آپس میں متضاد ہیں اور یہ حسین تقابل جو ایک قطعے میں پیش کر دیا گیا ہے۔ تفصیل کے بغیر بھی اپنے اندر ایک طویل بحث اور تذکرے کو سموئے ہوئے ہے۔

یہ اشعار مظفر زبیری کے ہیں۔ جو علم رکھتے ہوئے اور اس کی عظمت کو پہچانتے ہوئے قلم اور تلوار دونوں کی حرمت کے پاسبان ہیں۔ جیسا کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ قلم کی عظمت اور قتال کے حکم کے بعد یہ دونوں آلات لازم و ملزوم بن گئے۔ علم کے حصول میں جہاد کے طریقوں کو سیکھنا۔ میدانِ جنگ کی چالوں کو سمجھنا اور نئے نئے حربی آلات وغیرہ کے بارے معلومات بھی ایک حصہ بن گئیں۔ اور صاحبانِ سیف و قلم میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قلم، ذہنوں میں علم کے خزینے اور زبان و دل پر اخلاقیات کی پُراثر باتیں، دشمنوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں مدد ثابت ہوئیں۔

جناب انصار زبیری ایسے ہی حضرات میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے یہ سب عناصر اپنی ذات کا حصہ سمجھے۔ آپ ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کی۔ سائنس آپ کا مضمون تھا۔ جوان ہوئے تو فوج میں آگئے۔ ۱۹۵۱ء کو الیکٹریکل مکینکل انجینئرنگ میں کمشن پایا۔ یوں آپ نے تلوار کا انتخاب کیا۔ علم کے حصول کو آپ نے اپنا مقصد بنائے رکھا اور اسی حاصل کردہ علم کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے آپ نے قلم کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ آپ نے نثر اور نظم دونوں میں نصیحت بھی کی اور تبلیغ بھی۔ آپ نے خامیوں اور خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا اور ان کے حل کے بتانے میں بھی بغض سے کام نہیں لیا۔ لیکن ذہنوں کو سوچنے کا موقع بھی دیا۔

فوج میں آنے کے بعد آپ نے انجینئرنگ کی مزید تعلیم انگلینڈ سے حاصل کی اور پھر آرمی ایوی ایشن کے لیے آپ کی خدمات وقف ہوگئیں جہاں آپ اپنی مدت ملازمت میں کئی اہم عہدوں پر کام کرتے رہے۔ OOO

نمونہ کلام

نہیں ہیں کچھ ذریعے قوم کو آگے بڑھانے کے
بجز محنت کشوں کو محنتوں کا پھل کھلانے کے
انہی کی محنتوں سے ملک سب گلزار بنتے ہیں
سمجھ لیں خادمان قوم یہ گر آگے جانے کے

کھولا انساں نے راز ذروں کا
توڑ ڈالا فسون کون و مکاں
عقل نے اس کو دی ہے کیا طاقت
یہ چلاتا ہے مہر و مہ پہ کماں
پانے والا ہے راز موجودات
جانتا ہے اٹھانا بار گراں
عقل پر تابع دل کے ہو نہ سکی
اور نہ پہچانا نفع و نقصان
پا گیا ہے نہ جانے کیا کیا کچھ
اس نے جانا نہ یہ ہے کیا انسان
ہوس انسان کو کر دیتی ہے اندھا
مٹا دیتی ہے دل سے خوف عقبیٰ
نہیں ہے چھوڑتی دانا کو
تم اس کے جال میں ہرگز نہ آنا

لیفٹننٹ کرنل چوہدری دل نواز (دلنواز دلؔ)

جناب دل نواز دلؔ، کرنل گل نواز چیمہ کے ہاں ۱۹۳۴ ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول گجرات سے حاصل کی میٹرک ڈینیز ہائی سکول راولپنڈی سے اور ایف ایس سی (نان میڈیکل) کا امتحان گارڈن کالج راولپنڈی سے پاس کیا۔ ۱۹۵۲ ء میں پاکستان آرمی میں کمشن کے امتحانی مقابلے میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۵۵ ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے ریگولر کمشن حاصل کر کے ای ایم ای کور میں سیکنڈ لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔

پھر پنجاب (اب گورنمنٹ) کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی مغلپورہ لاہور میں پاک آرمی کے امیدوار کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ بی ایس سی (فزکس کیمسٹری) اور بی ایس سی مکینیکل انجینئرنگ کرنے کے بعد اعلیٰ فنی تعلیم کے لئے آسٹریلیا چلے گئے اور ۱۹۶۲ ء میں فارغ التحصیل ہو کر لوٹے۔ ۱۹۷۴ ء میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز پاکستان کے فیلو چنے گئے۔ سپورٹس مین اور ایتھلیٹ بھی رہ چکے ہیں۔ دو سال آسٹریلین آرمی کی الیون میں بھی رہ چکے ہیں۔

لیفٹننٹ کرنل دل نواز دلؔ نے سازِ حرفت کے ساتھ ساتھ محبتوں اور چاہتوں کا سفر بھی جاری رکھا آپ کا پہلا مجموعۂ کلام "داغ داغ دل" اور دوسرا "سخنِ دلنواز" کے نام سے شائع ہوا۔ آپ پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ آپ کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے کرنل غلام سرور لکھتے ہیں:

"دلنواز دلؔ کی غزلوں میں موضوعات کا حیرت انگیز تنوع ہے زندگی کے بے شمار پہلو بے شمار کیفیتیں اور بے شمار صورتیں دلؔ کی غزل میں اتنی خوبصورتی سے منتقل ہوئی ہیں کہ غزل پُرمایہ، مزید ثروت مند ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے جدت اور روایت کو اپنی منفرد غزل کی قوسِ قزح سے آمنے سامنے کر دیا ہے انہوں نے نئے نئے استعاروں، تازہ بہ تازہ تشبیہات اور شگفتہ تلمیحات سے غزل کے انگ انگ کو نکھارا ہے۔ ان کی غزل زمان و مکان کی قید سے آزاد دکھائی دیتی ہے" ○○○

غزلیں

جلتے بجھتے چولہے تو ہی میری بوجھ سہیلی کیسے جل بجھتی ہے دلہن روز اک نئی نویلی

خونی دل ہیں وحشی نظریں شہر بنے ہیں جنگل کیسے نکلے گھر سے کوئی عورت آج اکیلی

کر کے بند آنکھیں جب تو نے کھولے ہاتھ حنائی دل کو دیکھ چرانے آئی اس دم چور ہتھیلی

صاف اور سیدھی بات کریں جو بانس پہ چڑھتے ہیں وہ الٹی باتیں کر کے جائیں الٹے بانس بریلی

دیکھ شفق کا جوڑا پہنے زلفوں کے جنگل میں شام سویرے مل کر مہکیں چمپا اور چنبیلی

سر سے پاؤں تک جب دیکھا اس نے مڑ کے مجھ کو میرے سارے تن پر آئی ٹھنڈی ٹھار تریلی

کون لکڑ ہارا تھا اور وہ کس بن کی ہے سندری سوچ رہی ہے کب سے دریا دریا بہتی گیلی

بھولے بسرے گاؤں سے جو صاف نظر آتی تھی مجھ کو اب بھی یاد آئے وہ ندیا پار حویلی

آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں دنیا سے میں چھپ کر
میرا دل ہے ساتھی میرا میری آنکھ سہیلی

اپنے آپ سے باتیں کرنا، کرتے رہنا سب سے چھپ کر آہیں بھرنا، بھرتے رہنا

آتے جاتے سانسوں کا ہر وار بچا کر ساری عمر ہوا سے لڑنا، لڑتے رہنا

چاہت کے دن رات بساط بچھانا اور پھر ہر اک جیتی بازی ہرنا، ہرتے رہنا

ایسے جینے پر کیا ہم کو ناز نہ ہو گا ان کی ایک ادا پر مرنا، مرتے رہنا

خوف نہیں جب دل کی دھڑکن سے تو پھر کیوں
نظروں کی حرکت سے ڈرنا، ڈرتے رہنا

لیفٹننٹ کرنل نثار احمد خان ترین جاذب

ترین خاندان کے یہ چشم و چراغ ۲۷ مارچ ۱۹۴۱ء میں عبدالرحیم خان ترین کے ہاں پیدا ہوئے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور دسمبر ۱۹۶۴ء کو آرمی میڈیکل کور میں شارٹ سروس کمشن حاصل کیا۔ آپ کو آرمی میڈیکل کور کا ترانہ "نوید شفا" تحریر کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے ؂

اے ایم سی، اے ایم سی ہے مسیحا　　　اے ایم سی ہے مسیحا
موت کے مقابلے میں زندگی کی موج ہیں　　　درد کے سمندروں میں ہم سکوں کی موج ہیں
ہم سکوں کی موج ہیں اے ایم سی　　　اے ایم سی ہے مسیحا

جو آپ نے ۱۹۶۹ء میں لکھا اور جس کی دھن اے ایم سی کے ہی ایک صوبیدار جن کا نام محمد یونس تھا، نے ترتیب دی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت آپ مشرقی پاکستان میں متعین آرمڈ کور کی واحد یونٹ کے میڈیکل افسر تھے۔ وہیں آپ میجر پروموٹ ہوئے۔ جنگی قیدی ہوئے اور وطن واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو لیفٹننٹ کرنل بنا دیا گیا۔ لیکن کمانڈ کا مزا بہت تھوڑی مدت تک ہی لینے پائے تھے کہ ۳۵ سال کی عمر میں بروز جمعہ ایک مبارک گھڑی میں درود شریف کا ورد کرتے ہوئے آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

جناب نثار جاذب کی شاعری کے تین ادوار شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے پہلے ایک نوعمر، جذباتی اور رومانی شاعر کی حیثیت سے۔ اس کے بعد ملی جذبہ لاوے کی طرح پھٹا "جو کھیم کرن کے میدان" "گلوٹیاں کیمپ" اور روہی وال" میں نکھرا اور بکھرا اور تیسرا دورِ اسیری اور ان ایام کے دکھوں اور غموں کو سمیٹے واپس آکر۔

اکرام اعظم لکھتے ہیں " جاذب ایک شکیل نوجوان، خوش گفتار، خوش نوا شاعر، محبت نواز اور باغ و بہار شخصیت کا مالک، صاف ستھری اور مطمئن نجی زندگی میں بچوں کا متوالا، بیوی کا معبود، باپ کا عصائے پیری، بہن کا پرستار بھائی، اپنے پرائے کا غمخوار، دوسروں کے دلوں کو ڈھارس دینے والا شخص تھا"۔

" آشوبِ وطن" لکھ کر آپ نے اردو ادب پر اتنی کم عمری میں ایک بڑا احسان کیا اور ۵۴ بند کی نظم "شکوہ آشوبِ وطن" پڑھ کر انسان کو رونا آتا ہے اور سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

غزلیں

چاند کے نقشِ قدم پر تو چلا ہے سورج
دامنِ شب سے مگر دور رہا ہے سورج
زندگی ان کی بھی اک رات سے آگے نہ بڑھی
جن چراغوں کے لئے بھینٹ چڑھا ہے سورج
کتنے لوگوں نے اسے آگ کا شعلہ جانا
کتنے لوگوں کا مگر اب بھی خدا ہے سورج
صبح کے ہوتے ہی کھلتے ہیں دریچے لاکھوں
کس دریچے پہ مگر آکے رکا ہے سورج
کس نے چہرے سے سرِشام الٹ دی ہے نقاب
کس سے شرما کے یہ اب چھپنے لگا ہے سورج
ہم نے اس شوخ کی آنکھوں میں بھی دیکھے آنسو
سنتے آئے تھے کہ شبنم کی قضا ہے سورج
ہر طرف دھوپ ہے پھیلی ہوئی میخانے میں
میرے ساغر سے یہ کیوں دور رہا ہے سورج؟
اپنی قسمت تو بدلتی رہی سائے کی طرح
لیکن امید کا روشن ہی رہا ہے سورج
ہم نے تو اس سے کبھی حرفِ شکایت نہ سنا
عمر بھر آگ میں اپنی ہی جلا ہے سورج
ان کے جلوؤں کی تجھے تاب ہو کیونکر جاذبؔ
کھول کر آنکھ کوئی دیکھ سکا ہے سورج

شب بھر بڑے سکون سے جلتے رہے چراغ
سورج کی روشنی میں مگر لٹ گئے چراغ
کچھ اور بڑھ گئی ہے مرے گھر کی تیرگی
کچھ اور آگئے ہیں ترے گھر بنے چراغ
پہنچی نہ زیرِ خاک چراغوں کی روشنی
کیا فائدہ جو قبر کے باہر جلے چراغ؟
تو کیا گیا کہ دنیا ہی تاریک ہو گئی
تیرے بغیر آنکھ میں چبھنے لگے چراغ
کٹ جائیں تیز دھار ہوا سے نہ گردنیں
آندھی کی راہ میں کبھی حائل ہوئے چراغ؟
دامن ہوا ہے چاک اندھیروں کا اور بھی
جس دن سے قمقموں میں مقیّد ہوئے چراغ
ہر چند جانتا ہوں کہ وعدہ شکن ہے تو
لیکن یہ دل کی ضد ہے کہ شب بھر جلے چراغ
آتی ہیں زندگی میں کچھ ایسی بھی ساعتیں
جب کوئی خود ہی گھر کے بجھانے لگے چراغ
ہم اپنے گھر میں روشنی کو بھی ترس گئے
گلیوں میں ساری رات چمکتے رہے چراغ
جاذبؔ اس انتظار میں کاٹی ہے ہم نے عمر
شاید ہمارے گھر میں بھی اک دن جلے چراغ

لیفٹننٹ کرنل فضل اکبر کمال

کور آف سگنلز نے اُردو ادب کو نکھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور اس فیلڈ کو بڑے اچھے لکھاریوں سے نوازا ہے۔ صرف شعرا کی ایک طویل فہرست بنتی ہے جن میں کرنل جمیل اطہر، بریگیڈیئر منظور احمد غوری، میجر فضل حسین، میجر عبدالحمید، صوبیدار مقرب آفندی، سگنل مین غضنفر دکھی اور لیفٹننٹ کرنل فضل اکبر کمال وغیرہ شامل ہیں۔

زیرِ تبصرہ شخصیت جناب فضل اکبر کمال ۱۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کو خوشحالہ ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول بفہ سے ۱۹۵۹ء میں میٹرک کیا اور پی ایم اے جونیئر کیڈٹ سکیم میں آ گئے۔ انٹرمیڈیٹ کے ساتھ کمشن بھی حاصل کیا۔ پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء میں مکار دشمن سے دو دو ہاتھ ہوئے تو زندگی ایک نئے تجربے سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر دشمن سے آمنا سامنا ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کیا۔

آپ کو پیشہ ورانہ تعلیم سے ہٹ کر ہومیو پیتھی اور قانون سے بھی دلچسپی رہی ہے آپ ان دونوں مضامین کے مطالعے کو بھی کافی وقت دیتے ہیں اس کے علاوہ آپ کو تصوف سے بھی گہرا لگاؤ ہے اور اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ سے ہے۔ حضرت مولانا احمد یار خانؒ (میانوالی) آپ کے استاد ہیں۔ آپ نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

شاعری میں بھی آپ بے استاد نہیں بلکہ رموزِ شاعری سیکھنے کے لئے باقاعدہ رشید انجم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ قیام کوئٹہ کے دوران میرا جتنی بار بھی ان استاد جی سے سامنا ہوا انہوں نے اپنے اس ہونہار شاگرد کا ضرور تذکرہ کیا۔ جس سے میں یہی سمجھا کہ استاد رشید انجم نے ساری زندگی میں شاید ایک ہی شاگرد بنایا ہے۔

آپ نے ہر صنف مثلاً حمد، نعت، منقبت، عبدیت، غزل، رباعی، قطعہ بلکہ خود ساختہ اصناف مزاحیات اور فوجیات پر کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ابتدا میں آپ عشقیہ اور مزاحیہ شاعری کرتے تھے لیکن اب آپ کا رجحان تصوف کی طرف ہے "حریم و حجاب" آپ کا پہلا مجموعہ کلام ہے ○○○

حمد

جدھر جاتا ہوں ملتا ہے اشارا تیری رحمت کا   میری ہستی کو حاصل ہے سہارا تیری رحمت کا

جو بینائی لئے دل میں کسی جانب بھی ہم دیکھیں   سرورِ مے سے کیفِ عشق پیدا تیری رحمت کا

جھلسنے لگ گیا تھا دشتِ جاں میں روح کا پودا   بشکلِ اسمِ اعظم ابر برسا تیری رحمت کا

اگر ہو دیدۂ بینا تو بحرِ بیکراں ہے دل   ہر اک قطرہ لہو کا ہے کرشما تیری رحمت کا

جو تیری ذات واحد کے کبھی قائل نہیں ہوتے   میسر ان کو بھی یارب ہے سایہ تیری رحمت کا

خرد نے لاکھ بت خانے سجائے راہِ ہستی میں   مگر دل نے کبھی داماں نہ چھوڑا تیری رحمت کا

چمن میں نرگسِ سرشار نے خود یہ گواہی دی
طلسمِ رنگ و بو سب ہے کرشما تیری رحمت کا

خالق و تخلیق

رخِ زیبا سے صنم خانوں کی تخلیق ہوئی   چشمِ ہرجائی سے پیمانوں کی تخلیق ہوئی

کس کے احساسِ مجسم کے ہیں انداز لطیف   ساتھ شہروں کے بیابانوں کی تخلیق ہوئی

مصطفائیؐ ہو ، کلیمیؑ ہو ، براہیمیؑ ہو   خاک سے نور کے ایوانوں کی تخلیق ہوئی

بے بسی پر میرے ہنسا ہی تھا شاید مقصود   لامکاں کی کہیں ، زندانوں کی تخلیق ہوئی

دیکھتے دیکھتے اپنے بنے بیگانے کئی   پھر انہی اپنوں سے بیگانوں کی تخلیق ہوئی

عقل اور عشق کے سانچوں کی نمائش کے لئے   کتنے فرزانوں کی ، دیوانوں کی تخلیق ہوئی

کُن تو اس نے کہا ، کیونکر کہا سوچو تو کمالؔ
کیسی مجبوری میں انسانوں کی تخلیق ہوئی

★

لیفٹننٹ کرنل مجیب الحسن انجم (ایم ایچ انجم)

لارڈ میکالے کا کہنا ہے کہ "شاعری ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی، اور ناٹک سے مشابہ ہے" لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاعری کا میدان ان تینوں سے وسیع ہے۔ مصوری، بت تراشی اور ناٹک میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ فنکار سستانے کی فکر کرتا ہے۔ لیکن شاعری کا سلسلہ رکتا نہیں۔ اس کی فوقیت ان تینوں پر ہے کہ ان کی روحانی واردات شاعری ہی کی قلمرو میں ہے۔ جہاں نہ مصور کی رسائی ہے اور نہ بت تراش کی۔

یہی روحانی واردات جب ایم ایچ انجم کی قلم سے ظاہر ہوئی تو اس نے ہمیں رقص کی تان پر آزادی کے جشن منانے، ہجر و درد کے قصے سنانے، قد و رخسار کے چرچے کرنے اور بیتے لمحوں کا ماتم کرنے سے منع کر دیا۔ بلکہ اس کا حل یہ بتایا کہ وقت کو ضائع نہ ہونے دو ۰۰۰ لیکن یہی نہیں۔ کبھی کبھار محبت کے نغمے بھی لکھے اور شکوے شکایت سے بھی کام لیا اور غالباً یہی شاعر کی پہچان ہے کہ وہ ہر دل میں بسنے اور دماغ میں جنم لینے والے خیال کو شعر کا روپ دے ۰۰۰ اسی کا نام شاعری ہے۔ جہاں آپ لکھتے ہیں ؎

رقص کی تان پہ آزادی کا کب تک جشن مناؤ گے
کب تک وصل کی رات کے قصے ہجر کا درد سناؤ گے
زلف و قد و رخسار کے چرچے کب تک ہونگے ہونٹوں پر
کب تک خالی باتیں کرکے اپنا وقت گنواؤ گے
بیتے لمحوں کی یادوں کا ماتم کرنے والو سنو
ملک کی بربادی پر ٹھنڈی آہیں بھرنے والو سنو
عہد کرو تم عصبیت کے قصر گرا کر دم لو گے
عہد کرو نفرت کی تم دیواریں ڈھا کر دم لو گے

وہیں آپ نے غزل کی روایات کو بھی برقرار رکھا۔

جناب مجیب الحسن انجم ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن حاصل کیا اور زندگی کو تعلیم و تدریس سے منسلک کر دیا۔ آپ کئی اہم سٹاف اور انتظامی عہدوں پر کام کرنے کے علاوہ کچھ عرصے تک آرمی ایجوکیشن کور کے مجلے "تعلیم" کے ایڈیٹر بھی رہے اور اسے ادبی نہج پر چلا کر خوب تر بنا دیا۔ ○○○

غزلیات

روش روش ہے جہانِ تازہ قدم قدم موجِ زندگی ہے
مگر مسرت جو اجنبی تھی ہجوم گل میں بھی اجنبی ہے
قریب رہ کر ہے دور کوئی ہم ایسی قربت کو کیا کریں گے
وہ چاند نکلا ہوا ہے لیکن بجھی بجھی دل کی چاندنی ہے
ہر ایک جادے کے پیچ و خم سے ہر ایک منزل کے بام و در سے
مجھے جنوں کی صبا خرامی جہان بھر میں لئے پھری ہے
ہزاروں جلوے ہیں بکھرے لیکن ہے دل کی بستی اداس پھر بھی
کوئی کرن تو کہیں سے پھوٹے کہ تیرگی مجھ کو ڈس رہی ہے
چمکتے تاروں سے پوچھتی ہے پلک پلک جھلملاتی شبنم
یہ کس مقامِ سفر پہ انجم حیات آ کر ٹھہر گئی ہے

جوہر شناسِ جاں ہو تو اپنا دکھائی دے — رنگِ حنا بھی خونِ جگر سا دکھائی دے
دشتِ بلا میں اور ہے منزل رسی کی شرط — دل سے ہٹے غبار تو رستہ دکھائی دے
کیا وقت آ پڑا ہے کہ اپنا وجود بھی — خنجر سا ایک سر پہ لٹکتا دکھائی دے
ہر شخص پارہ پارہ ہے لمحوں کی ضرب سے — چہرا دکھائی دے تو سراپا دکھائی دے
نام اپنا تم بھی لکھ لو سرِ لوحِ زندگی — خالی اگر کہیں کوئی گوشہ دکھائی دے
انجم وہ دھوپ ہے کہ بیابانِ درد میں
انسان اپنے جسم کا سایہ دکھائی دے

غزل

پھر روشنی کے دوستو ساماں ہوئے تو ہیں
آثار کچھ سحر کے نمایاں ہوئے تو ہیں

پھر قافلے چلے ہیں نئے حوصلوں کے ساتھ
بیدار پھر دلوں میں کچھ ارماں ہوئے تو ہیں

گلہائے رنگ رنگ کھلیں گے پھر ایک بار
گلشن میں پھر بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

یارب نئی سحر، نئی خوشیوں کا دور ہو
کل رات پھر وطن میں چراغاں ہوئے تو ہیں

شاید نشانِ راہ ملے اب ضیاء ہمیں
راہوں میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

کون کہتا ہے کہ دشمن نے ہرایا ہے ہمیں

آج ہر شخص کو صدمہ ہے کہ ہم ہار گئے
آج اس ہار پہ ہر آنکھ سے آنسو ہیں رواں
پر یہ آنسو کہ ہزیمت کا مداوا تو نہیں
اور یہ احساس تو اس زخم کا مرہم ہی نہیں
کون کہتا ہے کہ دشمن نے ہرایا ہے ہمیں
ہم نے خود اپنی ہزیمت کو لگایا ہے گلے
ہم نے خود اپنے مقدر میں سیاہی گھولی
ہم نے خود اپنے سفینے کو بھنور میں ڈالا
ہم کہ دولت کے پجاری ہیں وفا کے دشمن
ہم کہ منصب کے بھکاری ہیں غرض کے بندے
مصلحت ذات کی ہم سب کی وفاؤں کا اصول
نام و ناموس کے اصنام ہمارے ساجن
ہم نے خود اپنے ہی جسموں سے لہو کھینچ لیا
ہم نے خود اپنے ہی چہرے سے ضیاء نوچی ہے
ہم نے خود اپنی ہی عظمت کا گلا گھونٹ دیا
ہم نے خود اپنے نشیمن کو جلایا یارو
اپنی خودداری کو مٹنے سے بچانے کے لئے
اپنی نیا کو ڈبونے سے بچانے کے لئے
اپنے گلشن کو خزاؤں سے بچانے کے لئے
اجڑی دنیا کو پھر اک بار بسانے کے لئے
وقت ہے اب بھی سنبھل جائیں نئے عزم کے ساتھ
ذات کے فرق کو اور خود کو مٹا کر یکسر
آؤ! ہم فرض کی آواز پہ لبیک کہیں!
رات دن کام کریں اور فقط کام کریں

✡ ✡

لیفٹننٹ کرنل محمد جمیل اطہرؔ

انوکھا ہے سگنل میں لڑنے کا ڈھنگ
نہ نیزہ نہ بھالا نہ تیر و تفنگ

بغیر نیزے، بھالے اور تیر و تفنگ سے لڑنے والے سگنلز کور سے متعلق محمد جمیل اطہر ۱۲ اگست ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ سکول سے فارغ ہوئے تو اپنے لیے مستقبل کا فیصلہ خود کیا اور فوج میں شمولیت اختیار کی۔ مکمل تربیت کے بعد ۱۹۶۵ء میں آپ کو بغیر تیر و تفنگ سے لڑنے والی اس کور میں کمشن ملا۔ آپ پیشہ ورانہ زندگی میں ہمیشہ اپنے کام اور ملازمت سے مخلص رہے، کئی کورسز کیے۔ سٹاف اینڈ کمانڈ کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کیا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں اپنے اس شعر کے مصداق سگنل کے اسی انوکھے ڈھنگ کو عمل میں لاتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کیا۔ یعنی مواصلاتی نظام کو فیل نہیں ہونے دیا۔

لیفٹننٹ کرنل محمد جمیل جو اطہرؔ تخلص کرتے ہیں، نے عسکری مصروفیات، پروفیشنل ذمہ داریوں اور نظم و ضبط کی الجھنوں کے باوجود اپنے ادبی ذوق کو وقت دیا۔ فرصت کے لمحات کو ضائع کرنے کی بجائے آپ شعر و سخن میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کرتے رہے۔ جن میں آپ کی قلم کی سیاہی نے زیادہ تر عسکری رنگ بکھیرے۔ آپ نے اپنے اشعار میں وطن کی محبت اور خطہ پاک سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے وہ انداز اختیار کیا جو عام فہم ہے۔ اپنی بات کو تراکیب و استعارات کی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے بڑے سادہ الفاظ میں بات کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کے اس مشینی دور میں کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ الجھے ہوئے الفاظ یا اشعار کی گتھیاں سلجھاتا رہے۔ اس لیے آپ نے سوچنے کے لیے گھنٹوں وقت خرچ نہیں کرنے دیا۔ بلکہ فوری سمجھ میں آجانے والے اشعار کہے ہیں۔

آپ نے اپنی شاعری میں جب جوانوں کو مخاطب کیا ہے تو انہیں اپنے اندر چھپے ہوئے اس شخص کو باہر لانے کا مشورہ دیا ہے۔ جسے دنیا نے تجربات کی کٹھالی سے نکال کر تسلیم کیا ہے۔

آپ نے اپنے کلام میں نوجوانوں کو پند و نصائح بھی کیے ہیں اور انہیں اپنے مسلمان ہونے کا احساس دلایا ہے۔ ہمارے لیے کیا بہتر ہے؟ اور کس میں بھلائی ہے؟ آپ نے واضح کیا ہے کہ یہ ہم باقی اقوام سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ooo

پاک فوج کے جوانو

اے فوج کے جوانو دنیا کو یہ بتا دو ثانی نہیں تمہارا پیغام یہ سنا دو
محکم قدم تمہارے بڑھتے ہیں جس دم آگے مشکل ہے ان کا رکنا کفار کو بتا دو
ایمان کی حرارت سینوں میں ہے تمہارے دشمن کو تم جلا دو اور راکھ بھی اڑا دو
دشمن پہ جب بھی جھپٹو عقاب بن کے جھپٹو جو "کندھ" راہ میں آئے ٹھوکر سے وہ گرا دو
اسلام کا جہاں میں پرچم بلند رکھنا باطل کا اس جہاں سے نام و نشاں مٹا دو
پیارا وطن تمہارا اسلام کا قلعہ ہے مضبوط اس کے یارو دیوار و در بنا دو
ہیں جسم و جاں تمہارے اس قوم کی امانت جب وقت آ پڑے تو پھر گردنیں کٹا دو

اطہر پکارے جاؤ میدانِ جنگ کو جب
حکمِ خدا کے آگے اپنی جبیں جھکا دو

غزل

دنیا کی لذتوں کو دل میں نہ تم بسانا یہ جانتے ہو، آخر، اک دن پڑے گا جانا
جس نے کیا ہے پیدا بس اس کے ہو کے رہنا تم ماسوا کے آگے سر نہ کبھی جھکانا
امّی لقب کا احساں واجب ہے یاد رکھنا ارشاد اس ؐ کے یارو دل سے نہ تم بھلانا
ہے حکم اس ؐ کا بانٹو، دکھ درد دوسروں کے سمجھو تو عفو اس ؐ کی رحمت کا ہے خزانا
مظلوم کی مدد کو آتی ہے حق سے نصرت بھولے سے بھی دلوں کو بے جا نہ تم دکھانا
رازق وہی ہے جس نے پیدا کیا سبھی کو اس رزق کے لئے تم ہرگز نہ ظلم ڈھانا
سن لو نماز سب پر ہے فرض پنجگانہ کیوں خود سے کر رہے ہو تم روز اک بہانا

شیطاں بہت ہے نازاں یوں کامیابیوں پر
تم اس کو بھی تو اطہر نیچا کبھی دکھانا

لیفٹننٹ کرنل ایچ مہدی ریحانؔ

ایچ مہدی ریحان کے قلمی نام سے ادب میں داخل ہونے والی اس شخصیت کا اسمِ کامل محمد حسام مہدی ریحان ہے۔ فوج میں ایک شعبہ ایسا بھی ہے۔ جس کے لوگ میدان جنگ میں ایکٹو (Active) حصہ نہیں لیتے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو پورا نظام وہی چلا رہے ہوتے ہیں۔ میڈیا سب انہی کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ مختلف ادارے اور انتظامی ڈھانچے انہی کے دم سے حرکت میں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگ میں اگلے مورچوں پر ڈٹے ہوئے یا لڑنے والے افراد کی مورال سپورٹ کے علاوہ دوسری کئی تنظیموں اور سپلائی کی امداد کو بحال رکھتے ہیں۔ ان افراد کو ہم جنرل لسٹ میں شامل کرتے ہیں۔

جناب مہدی ریحان چونکہ تعلیمی لحاظ سے خاصی پڑھی لکھی شخصیت ہیں۔ اس لیے جب آپ نے فوج کو اپنایا تو آپ کی اہلیت کو استعمال کرنے کے لیے آپ کی قابلیت کے پیش نظر آپ کو سائیکالوجسٹ رکھا گیا۔ آپ نے نفسیات میں ایم۔اے (فرسٹ کلاس فرسٹ) کے علاوہ سائیکالوجی اینڈ گائیڈنس میں ایم ایڈ (فرسٹ کلاس) کیا ہوا ہے۔ آپ نے اپنی مدت ملازمت کا بیشتر حصہ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ میں گزارا۔ وہیں آپ نے سینئر سائیکالوجسٹ کے عہدے پر بھی کام کیا۔ یوں آپ نے اپنی پرکھ اور معیارِ چناؤ سے فوج کو بڑے عمدہ اور اچھے افسر مہیا کئے اور یہ آپ کے فرائض کی ادائیگی کا اہم موڑ اور فرض شناسی کی بہترین مثال ہے۔

لیفٹننٹ کرنل محمد حسام مہدی ریحان ۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد کچھ عرصہ سول اداروں میں ملازمت کرتے رہے اور پھر اپنی خدمات فوج کے سپرد کر دیں۔ جہاں آپ کو ۱۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو کمشن ملا۔

اردو کے لکھنے والوں میں آپ کا نام ابھی نیا ہے۔ آپ نے نثر اور شعر ہر دو کو اپنایا ہے۔ آپ انگریزی میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔ آپ مبتدی ہونے کے حوالے سے اپنا حوالہ کوئی زیادہ فخر سے نہیں دیتے۔ لیکن بامقصد لکھتے ہیں جسے سراہا جاسکتا ہے۔ ○○○

غزل

گلستاں میں غوغا مچانا پڑے گا
بہاروں کو جنبش میں لانا پڑے گا
ہجومِ تمنا و گل ہائے ارماں
اداؤں کو من میں بسانا پڑے گا
یہ دردِ اسیری، اسیروں سے سن کر
اسیری کا نقشہ مٹانا پڑے گا
اٹھا لیلیٰ شب کے چہرے سے آنچل
لبِ بام سورج کو آنا پڑے گا
شبستانِ الفت میں کوندے گی بجلی
تو پلکوں سے تنکے سجانا پڑے گا
ہیں لبریز آہوں سے دل کی صدائیں
ستاروں کو آنسو بہانا پڑے گا
یہ ساون کی راتیں یہ برکھا کی رم جھم
امنگوں کو گردش میں لانا پڑے گا
ہے محفل عداوت سے لبریز ریحان
یہ بارِ محبت اٹھانا پڑے گا

تیری یاد کا کیا عجب سلسلہ ہے
مرے دل میں جیسے چراغاں ہوا ہے
مری زندگی بندگی بن گئی ہے
مرا کعبہ اب تیرا در بن گیا ہے
تری زلف کو چھو کے آئی ہے شاید
بہت مشکبار آج موجِ صبا ہے
سفر میرا کتنا حسیں سا سفر ہے
ترا نقشِ پا جب سے، رہبر بنا ہے
تمہاری صدا سے بہت ملتی جلتی
مرے کان میں گونجتی اک صدا ہے
مجھے اپنی الفت نبھانا پڑے گی
مجھے اس سے کیا، وہ اگر بے وفا ہے
ہے شاید صبا، جانِ فصلِ بہاراں
چمن در چمن اب ترا تذکرہ ہے

لیفٹننٹ کرنل غلام جیلانی خان

خوشبو کو حاصل کرنے کی تمنا تو ہر دل میں ہوتی ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو خوشبو بانٹتے ہیں اور وہ بھی پھولوں کا رس نچوڑ کر نہیں بلکہ اپنے خیالات اور سوچوں کے گلشن سے خوشبو نکال کر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایسے ہی عطار صفت اشخاص میں ایک نام آتا ہے غلام جیلانی خان کا۔ جو پھولوں سے کشید شدہ عطر سے زیادہ ثمین، پائیدار اور لانگ لائف لفظوں کی خوشبو بانٹتے رہتے ہیں۔

لیفٹننٹ کرنل غلام جیلانی خان ۲۱ اپریل ۱۹۳۶ء یعنی علامہ اقبالؒ کی وفات سے پورے دو سال پہلے اس دنیا میں آئے۔ اردو اور فارسی ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۶۸ء کو آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن حاصل کیا اور پھر سروس کے دوران مختلف تدریسی اور سٹاف عہدوں پر کام کیا اور تعلیم کا حصول بھی جاری رکھا۔ انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری اور عربی زبان میں ڈپلومہ لیا۔ آپ فارسی کے مترجم بھی ہیں۔ آرمی جونیئر برن ہال میں چیف انسٹرکٹر بھی رہے۔ ٹریننگ پبلی کیشنز ڈائریکٹوریٹ میں خدمات سرانجام دیں۔ پاکستان آرمی جرنل کے مدیر کی حیثیت سے اسے بڑا عمدہ جریدہ بنادیا آپ مختلف رسائل میں مضامین لکھتے رہتے ہیں اور اپنی معطر تحریروں سے عسکری اور ادبی ماحول کو خوشبوؤں سے نوازتے رہتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں کمال حاصل ہے خاص کر پیشہ ورانہ موضوعات پر آپ کو مکمل گرفت ہے۔ آپ کئی عسکری کلاسیکی کتب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ آرمڈ فورسز بورڈ آف ایجوکیشن کے لئے نصابی کتب تحریر کی ہیں۔ اردو میں عسکری لغت تیار کر رہے ہیں عسکری مشاہدات و تجزیات کو قرطاس کی زینت بنانے کے علاوہ آپ مزاحیہ تحریروں سے بھی گلدان سجاتے رہتے ہیں اور خوب سجاتے ہیں۔ آپ کا شعری رنگ خالص فوجی اور فکاہیہ ہے۔ آپ سچوایشن کی وضاحت کو نظم میں جب پابند کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں ایک افرنگ ادارے سے کورس پر لکھی نظم دیکھئے ٭٭٭

تقدیر کا اعجاز

کیا بتائیں بیٹھے بیٹھے بات کیا یاد آ گئی — اس بھری محفل سے اٹھنے کی سزا یاد آ گئی

مہ وشانِ عربدہ جُو وہ قطار اندر قطار — جن کے ہونٹوں پر شرارت، جن کی آنکھوں میں شرار

وہ بتانِ تند خو وہ مہ جبینانِ فرنگ — جن کا جامہ قامتِ صبر و شکیبائی پہ تنگ

بے حجابی کے مکمل استعارے جو بدن — جو سراپا امتحاں جو بے محابا فکر و فن

جن کے غمزے برق ساماں جن کے عشوے بے پناہ — جن کے چہروں سے نگاہوں کو ہٹا لینا گناہ

زُعم تھا جن کو بہت ہی جسم کی جاگیر کا — "سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا"

میں کہ تھا روزِ ازل سے دلرباؤں کا اسیر — بندۂ حرص و ہوا جاں دادۂ برنا و پیر

انتخاب و خوب و زشت و پست و بالا ہر طرف — بس یہی حسرت کہ ہو صنفِ مخالف صف بہ صف

اور یہاں تو سیلِ جسم و جان طغیانی میں تھا — آب و گِل کا کھیل تھا لیکن فراوانی میں تھا

تشنہ کامی اون پر جب ہو تو پیمانے کی خیر — ساقیِ شیریں دہن کی خیر، مے خانے کی خیر

ابرِ نیساں پھر سے کشتِ جاں پہ منڈلانے لگا — سینۂ ویراں میں گویا پھر شباب آنے لگا

پھر طوافِ کوئے رسوائی مقدر بن گیا — میں بزعمِ خود مقدر کا سکندر بن گیا

وہ گھنی پلکوں کے سائے وہ جواں زلفوں کے جال — وہ نشیلی آرزوئیں وہ کھنکتے ماہ و سال

گیسوؤں کی سرد چھاؤں میں حسیں چہروں کی دھوپ — وہ نکھرتے جگمگاتے جاگتے جسموں کے روپ

شعلۂ رخسار کی وہ دم بدم تابانیاں — مشکلیں وہ صبح کی وہ شام کی آسانیاں

آنچلوں کی سرسراہٹ جاں کو برماتی ہوئی — گرم سانسوں کی مہک دل میں اتر جاتی ہوئی

ہائے کیا لمحے تھے، کیسی رُت تھی، کیسا دور تھا — روز و شب مدہوش رہنے میں مزا کچھ اور تھا

ازدحامِ لالہ رویاں میں گھرا رہتا تھا میں — جلوتوں میں خلوتوں کی داستاں کہتا تھا میں

آہ لیکن گردشیں افلاک کی تھیں تاک میں — آج جھلکے تو کوئی اس دیدۂ نمناک میں

اب کہاں وہ محفلیں وہ انجمن آرائیاں — وہ سلگتے رت جگے وہ گونجتی تنہائیاں

مختلف یوں قصۂ سود و زیاں ہو جائے گا — کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائے گا

بے در و دیوار سا اک گھر ہے آبادی سے دور — جس میں لا پھینکی ہے میں نے اپنی جانِ ناصبور

یادِ ایامِ گزشتہ کی کسک دل میں لئے — اس خرابے میں پڑا ہوں چشمِ حیرت وا کئے

عہدِ رفتہ کے شکستہ ساز کی آواز ہوں — آئینۂ عبرت کا ہوں "تقدیر کا اعجاز" ہوں

لیفٹننٹ کرنل محمد الیاس

بہت پیارا لگتا ہے جب کوئی سینئر آدمی اپنی زبان اور اپنے لہجے میں بات کرتا ہے۔ ورنہ ہمارے ذہنوں پر تو انگریزیت کا ایسا آسیب چھایا ہے کہ اپنے لباس، اپنی زبان، اپنے کلچر حتیٰ کہ اپنی بات کہتے ہوئے بھی احساسِ جرم ہونے لگتا ہے۔

لیفٹننٹ کرنل محمد الیاس مجھے اسی لیے من بھاؤنے لگتے ہیں کہ وہ اپنی بات اپنی زبان میں "تڑ" کر کرتے ہیں۔ ے

سبھے گلاں سوکھیاں ــــ پَر اوکھا چھڈن لوہا
اپنی کُھڈ تے شیراں اگے تڑ کھلوندا چوہا !

آپ نے اپنے پنجابی مجموعہ کلام "چانن" اور اردو مضامین کے مجموعہ "کمالِ قیادت" میں اپنی بات اپنے خطے کی بات، اپنوں کی بات، اپنے وطن کی بات، اپنے لہجے میں کی ہے اور اتنے ہی مہارت دکھائی دیئے ہیں۔ جتنے یونیفارم پہن کر ہاتھ میں سٹک لئے چَٹک دکھائی دیتے ہیں۔

جناب محمد الیاس، یہاں پھر ایک دھوکہ ہو جاتا ہے کیونکہ آزاد کشمیر کے لکھاری محمد الیاس اس وقت اپنی چند کتب کے حوالے سے خاصے معروف ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ۔۔ لیفٹننٹ کرنل محمد الیاس ۳۰ مئی ۱۹۴۷ء کو چیلیانوالہ ضلع منڈی بہاؤالدین میں پیدا ہوئے۔ چیلیانوالہ کی اپنی ایک تاریخی حیثیت ہے اور جن افراد کو تاریخ سے ذرا بھر بھی لگاؤ ہے۔ انہوں نے چیلیانوالہ کی جنگ کے بارے ضرور پڑھا ہو گا۔

آپ کے والد کا نام، چوہدری احمد خان ہے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد فوج میں آکر ۲۰ اپریل ۱۹۶۹ء کو سیکنڈ لیفٹننٹ کے عہدے سے کمشن پایا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں آپ کی ڈیوٹی پی اے ایف بیس مسرور پر تھی اور آپ نے دشمن کے ہوائی حملوں سے اسے محفوظ رکھنا تھا۔ اپنی اینٹی ایئر کرافٹ گنوں سے یہ فرض آپ نے باحسن ادا کیا۔

آپ نے اپنی مدتِ ملازمت صحیح چوہدریوں والے رکھ رکھاؤ سے پوری کی، یعنی اعلیٰ نتائج کے ساتھ کورسز کئے۔ سکول و کالج کے زمانے سے آپ بہترین ایتھلیٹ رہے ہیں۔ اسے برقرار رکھا۔

لیکن آپ کے خلق، سادگی اور انسان دوستی میں چوہدریوں والی کوئی بات نہیں۔ عشقِ رسولؐ اور عشقِ آلِ بیتؓ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس کا اظہار آپ کی تحریروں سے اور خاص کر "چانن" میں بھرپور انداز سے واضح ہے۔ ○○○

نعت

ہمارے خدا کا پیارا محمدؐ　　کروڑوں کی آنکھوں کا تارا محمدؐ
پکارو پکارو یہ مل کر پکارو　　ہمارا ، تمہارا ، پیارا محمدؐ
بنا کر جسے بھیجا رحمت خدا نے　　ہے محشر میں سب کا سہارا محمدؐ
نہ اس جیسا کوئی ہوا ہے نہ ہو گا　　بصیرت کا ایسا منارا محمدؐ
وہ اخلاقِ اعلیٰ کا روشن نمونہ　　شرافت کا کامل ادارہ محمدؐ
فضائیں ہوئیں خوشبوؤں سے معطر　　کہ جب بھی کسی نے پکارا ، محمدؐ

تری بگڑی الیاسؔ سب بن گئی ہے
بنے جب سے تیرا سہارا محمدؐ

غزل

موجوں میں گیا کود میرا عشق کھڑا تھا　　سوچوں میں گیا ڈوب جو ساحل پہ کھڑا تھا
کثرت سے ملی داد مجھے چاروں طرف سے　　صورت پہ تری شعر جو اک خوب گھڑا تھا
وہ بھی نہ بچا کورِ جفا سے تری صر صر　　تنہا جو ہرا پیڑ گلستان میں کھڑا تھا
کی پوری کمی کیسے وہ اک مردِ خدا نے　　احساس کا اک دور میں جب قحط پڑا تھا
کیوں مجھ پہ کرم آج کیا شوخ نظر نے　　محفل میں کوئی مجھ سے نہ مشتاق بڑا تھا؟

لڑ لڑ کے کیا لڑنے کا اک شوق بھی پورا
الیاسؔ سے سب ایک یہ الیاس لڑا تھا

لیفٹننٹ کرنل محمد یوسف

وجودِ پاکستان سے چند روز پہلے چکوال کے ایک نواحی گاؤں بھکڑی کے ایک زمیندار مگر خالص فوجی گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد یوسف رکھا گیا۔ یہ خاندان تین پشتوں سے سپہ گری کو اپنائے ہوئے تھا لیکن کئی پشتوں تک اس خاندان میں کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ بچہ جب قدرے بڑا ہوا تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا رجحان ادب کی طرف ہے۔ لیکن والد نے اسے سائنس کی تعلیم پر مجبور کیا یوں والد کی مرضی پر صاد کرتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج چکوال سے فزکس اور حساب میں بی ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اب یہ بچہ جوان تھا لہٰذا سپہ گری کا انتخاب کرتے ہوئے کاکول جا پہنچا اور اپریل ۱۹۶۹ء میں آرٹلری کور میں کمشن پایا۔

جناب محمد یوسف کو ملازمت کے دوران کئی مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ رائل ملٹری کالج آف سائنس انگلینڈ اور سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کیا۔

زمانۂ طالب علمی میں اپنے کالج میگزین میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔ عملی زندگی میں آنے تو کبھی کبھار کچھ لکھ لیا لاہور گئے تو احمد ندیم قاسمی سے ملاقات ہوئی۔ انہیں اپنی بیاض دکھائی۔ انہوں نے کافی حوصلہ افزائی کی اور یوں آپ ان کی گمنام شاگردی میں اس رستے پر چل پڑے آپ نے شاعری میں محبت، دکھ اور غم کے استعارے استعمال کئے ہیں جو آپ نے زمانے کے حالات اور معاشرے کے مطالعہ سے حاصل کئے اور انہیں صفحات پر بکھیر دیا۔ اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے دکھوں کو آپ نے اپنے احساس میں سمو کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

زندگی مختلف رنگوں کی وسیع آبشار ہے اس میں محبت کے چشمے بھی پھوٹتے ہیں اور درد کے آنسو بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس کو بغور دیکھا جائے تو ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور اپنا ہی عکس لہراتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیفٹننٹ کرنل محمد یوسف کے کلام کے اس شفاف پانی میں جو بھی دیکھے گا اسے اپنا ہی عکس ڈگمگاتا اور ڈولتا ہوا نظر آئے گا۔ آپ کی محنت کا ثمرہ "آہٹ" کے نام سے ہاتھوں میں آچکا ہے اور دوسری کاوش زیر ترتیب ہے۔ لیکن ہاں! آپ کی شاعری نے آپ کی عسکری زندگی کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ آپ فوجی معمولات اور مشغولات میں بالکل پرفیکٹ ہیں ○○○

غزلیات

جب کبھی دل پہ نئے غم کی گھٹا چھائی ہے   پھر تیری یاد ہی بہلانے چلی آئی ہے
جن سے کیں شام و سحر تیری وفا کی باتیں   کیسے ان لوگوں سے کہہ دوں کہ تو ہرجائی ہے
سوچ کی آگ نے پگھلائے سلاسل ورنہ   دل کو ہر عہد نے زنجیر تو پہنائی ہے
زندگی بھر میں جو پایا تھا جنوں کے صدقے   ایک لمحے میں کہیں عقل گنوا آئی ہے

تم تو اک عہد کی خوشیوں کا بھرم تھے یوسف
آج دیکھا جو تمہیں آنکھ بھی بھر آئی ہے

لٹ گیا شہر لہو بوئے کفن کیا ملتی   فکرِ بے نور سے خوشبوئے وطن کیا ملتی
اس کے چہرے پہ جو لکھا تھا اسے پڑھ ڈالا   ہم کو صیاد سے رودادِ چمن کیا ملتی
حرمتِ لفظ ہی حدت سے جو کھو بیٹھا ہو   اس قبیلے سے ہمیں دادِ سخن کیا ملتی

جیسے اک خواب ہوا خونِ جگر بھی یوسف
صرف رنگوں سے مجھے لذتِ فن کیا ملتی

محفلِ زیست کو یوں آپ سجاتے رہیئے   جب نئے رنج ملیں جشن مناتے رہیئے
آپ ہی آپ کسی آگ میں جلتے رہیئے   یوں نہ ہر بات زمانے کو سناتے رہیئے
کس کو معلوم وہی کل کو ہو راہبر اپنا   اب تو رہزن کو بھی سینے سے لگاتے رہیئے

کون آتا ہے کٹھن راہوں پہ چل کر یوسف
دیپ یوں ہی نہ سرِ شام جلاتے رہیئے

لیفٹننٹ کرنل ذوالفقار احمد اقبال خان زلفی

میجر سہیل اقبال سے کچھ عرصہ کے بعد جب ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے ایک کتاب "تمنا" پیش کی یہ ایک شعری مجموعہ "کسک" تھا میں نے کتاب کو بغور دیکھا اور سہیل اقبال سے کہا "بڑا اچھا گیٹ اپ ہے اور خوبصورت کتاب ہے لیکن یہ زلفی صاحب ہیں کون؟" -

"میرے بڑے بھائی" انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں جواب دیا۔

"خوب ۔۔۔ تو گویا یہ جراثیم آپ کے خاندان میں بھی موجود ہیں" لیکن یہ بات میں نے دل ہی دل میں کہی۔ شوق مزید بڑھا اور کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی شاعری واقعی اپنے اندر ایک چبھن اور کسک لئے تھی۔ جوانی کی کچھ ناکامیوں اور جذبوں کو بڑے سادہ الفاظ اور لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا تھا جونہی گھر پہنچا تو میرے دوست ملک شاہسوار علی ناصر موجود تھے کتاب دیکھ کر میرے ہاتھ سے لی اور بلامعذرت چلتے بنے۔ البتہ جاتے ہوئے اپنی کتاب "کرلات" میرے ہاتھ میں تھما گئے ۔۔۔ تو یوں میں پہلی بار جناب زلفی کی شاعری اور شخصیت سے واقف ہوا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا دوسرا مجموعہ کلام "احساس" چھپا جب اس کا مطالعہ کیا تو پہلے سے بھی بہتر پایا۔

لیفٹننٹ کرنل ذوالفقار احمد اقبال خان ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو آرمڈ کور میں کمشن پایا۔ کوئی ڈیڑھ ہی سال بعد نارووال سیکٹر میں دشمن سے پنجہ آزمائی کا موقع ملا۔

آپ نے نفسیات میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔ جس کا اثر آپ کی شاعری پر بھی پڑا ہے۔ آپ نے اپنے ادبی شوق میں جہاں روایات کا ساتھ دیا ہے اور ادب برائے ادب کی بات کی ہے وہاں جدید رویوں کو بھی ساتھ لے کر چلے ہیں۔ نفسیاتی پہلوؤں پر استعاراتی اور تشبیہاتی روشنی ڈالی ہے۔ غزل میں اس صنف کے بنیادی اور جبلی تقاضے پورے کئے ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری میں پاکستانیت کو بھی اجاگر کیا ہے اور وطن سے محبت کا فرض بھی نبھایا ہے آپ نے ملکی مسائل اور اپنی عسکریت کا اظہار بھی کیا ہے OOO

غزلیں

صبر کر اے ناخدا بس ایک دھارا رہ گیا — چار گز کے فاصلے پر اب کنارہ رہ گیا
کھیت کی گندم تو ساری لے گیا جاگیر دار — دیکھتا ہاتھوں کو بس دہقاں بیچارہ رہ گیا
میری تسکیں کے لئے تازہ جہاں بیکار ہیں — میری آنکھوں میں تو بس کے اک نظارہ رہ گیا
کہکشاں جن کو ملی ہے وہ تو کوئی اور ہیں — اپنی خاطر آسماں میں اک شرارہ رہ گیا
راہنمائے کارواں تھا جو نویدِ نور تھا — بادلوں میں چھپ کے وہ صبحوں کا تارا رہ گیا

قتل بھی کرتے ہیں خود کرتے ہیں پھر نوحہ گری
مشغلہ زلفی یہی اب تو ہمارا رہ گیا

تیری دنیا میں اے مالک اپنا کوئی کام نہیں
اپنی کوئی صبح نہیں ہے اپنی کوئی شام نہیں
میری حالت دیکھ کے تم کیوں جان پریشاں کرتے ہو
پیار کے قابل ہم ہی نہیں تھے تم پہ کوئی الزام نہیں
نگری نگری گاؤں گاؤں میں نے ڈھونڈی ٹھنڈی چھاؤں
مجھ کو ہر جا دھوپ ملی ہے قسمت میں آرام نہیں
رند پئیں مے خانوں سے میں نین تیرے مستانوں سے
ان کے جام پہ فتویٰ ہے پر میرا جام حرام نہیں
تیرا میرا پیار صنم ہے اس افسانے کی صورت
جس کا کوئی آغاز نہیں ہے جس کا کوئی انجام نہیں
یہ کہہ دو تم من والوں کو، پیار کا حق ہے دھن والوں کو
بھول وہ جائے پیار وفا کو جس کے پلے دام نہیں
دکھ زلفی کو بھی ہوتا ہے اس سے لیکن چپ رہتا ہے
ہو نہ کہیں مشہور یہاں جو قصہ اب تک عام نہیں

لیفٹننٹ کرنل جاوید افروز

لیفٹننٹ کرنل جاوید افروز، ملک کے لاحقہ کے ساتھ جاوید افروز ملک کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ ضلع سرگودھا کی ایک معتبر بستی (جہاں کا بگوی خاندان، مفسرِ قرآن کے حوالے سے پیر محمد کرم شاہ صاحب اور بالکل بر عکس چلیں تو احمدی مذہب کے دوسرے بڑے ستون مولوی نور الدین وغیرہ کو دنیا کی اکثریت جانتی ہے) یعنی بھیرہ میں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام ملک محمد فیروز خان ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور ایف سی کالج میں داخلہ لیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۷۰ء میں آرمڈ کور میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے کمشن پایا۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران آپ سیالکوٹ کے محاذ پر تھے۔

جناب جاوید افروز ملک مارشل قوم سے ہونے کے ناطے اپنا سارا وقت عسکری فرائض کی ادائیگی میں صرف کر رہے ہیں تاکہ جذبۂ حب الوطنی کی تسکین کے ساتھ ساتھ خاندانی بھرم بھی قائم رہے۔ لیکن جب کبھی آپ کو فرصت کے کچھ ثانیے نصیب ہوتے ہیں تو اسے آپ کتابوں کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر جب کوئی سوچ ابھرتی ہے تو اسے ترتیب و سلیقے سے کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ آپ علامتی نظم بڑے دلآویز انداز میں کہتے ہیں۔ لیکن غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ جس میں روایت کی چاشنی ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

تکلف ہے ترا میرے لئے باعث مصیبت کا
گوارا ہو تو کچھ اظہار کردوں میں عقیدت کا
خموشی سے گزر جاتے ہو کیوں نظریں جھکا کے تم
بجھا دیتا ہے دل میرا یہ احساس اجنبیت کا
بہانے ڈھونڈتا رہتا ہوں تجھ سے ہم کلامی کے
مگر پڑتا نہیں ہے حوصلہ عرضِ محبت کا
تعجب ہے کہ تو افروزؔ سے نا آشنا ہے کیوں
کہ ہے وہ منتظر پیہم تری چشم عنایت کا

ooo

پتنگا اور میں

(۱)

اک پتنگا اداس اور تنہا غم زدہ ، دل گرفتہ ، افسردہ
ایک تاریک سے گھروندے میں پھڑپھڑاتا تھا اور سوچتا تھا
رات کیسے کٹے گی برہا کی
ہائے کیا زندگی ہے دنیا کی

(۲)

نقدِ جاں رات تک سلامت ہے اور پھر صبح تو قیامت ہے
تیری بستی ہے یا طلسمِ خیال؟ اپنی ہستی ہے یا ملامت ہے؟
اے خدائے ازل ، ابد کیا ہے؟
میری محرومیوں کی حد کیا ہے؟

(۳)

یہ گھڑی دو گھڑی جو جینا ہے آہ بھرنا ہے زہر پینا ہے
کیا یہی سنگ ہیں مقدر میں؟ کیا یہی دل کا آبگینہ ہے؟
تیری تخلیق کا زوال ہوں میں
اپنی تضحیک کا کمال ہوں میں

(۴)

دفعتاً دور ایک شمع جلی زندگی روشنی کی بات چلی
غم کی تاریکیاں ہوئیں کافور ہجر کی دلگداز رات ڈھلی
لی پتنگے نے ایک انگڑائی
جانِ بسمل میں جان سی آئی

✡

لیفٹننٹ کرنل محمد اسد عالم

ہم نے ماضی میں اپنے لہو کی فروزاں کرن
اپنے ہاتھوں سے بخشی ہے تاریخ کو
ہم زمانوں کی عظمت کے مینار ہیں
ہم نے کوہ گراں کے جگر چیر کر راستے وا کئے
تیرہ و تار شب کو سویرا کیا

نظم کی ان چھ سطور میں، مسلمان ہونے کے ناطے ہماری پوری تاریخ سمٹ کر آگئی ہے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر۔۔۔ نہیں۔۔۔ بلکہ دنیا کے کونے کونے میں ایک پیغام لے کر اور محبت و امن کے سفیر بن کر جانے والے اس قوم کے افراد کی خواہ کشتیاں جلا کر پہنچے ہوں یا تختے خشکی پر بچھا کر، داستانِ شجاعت واضح کر دی ہے۔ لیکن جناب محمد اسد عالم صرف ماضی کو یاد کر کے یا اس سے رشتہ جوڑ کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ آنے والی نسل کو اس پیغام سے آگاہ کرنے کے لیے انہیں بہادری اور جوانمردی کا سبق دیا ہے اور انہیں ابھارا ہے کہ اٹھو اور زمانے کا رنگ بدل دو۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی ہمت بندھائی۔

لیفٹننٹ کرنل محمد اسد عالم کی پوری نظم (نظم کی شاعری) نوجوانوں کی ہمت بندھانے، انہیں حوصلہ دینے، انہیں یہ یقین دلانے کہ زمانے میں جو کچھ بھی ہے تم ہو، تمہی طارق ہو، تمہی ابن قاسم ہو، تمہی محمود ہو، تمہی قتیبہ ہو، تمہی عزیز ہو، تمہی یونس ہو، تمہی مہدی ہو، تمہی کمال ہو اور تمہی عظمتوں کے پاسبان ہو، کے گرد گھومتی ہے۔ نظم کے علاوہ آپ نے غزل بھی کہی ہے۔ جس میں تیرگی کو مایوسی یا موت تصور نہیں کیا۔ اسے بھی زندگی اور امید کا نام دیا ہے اور راہوں کے سنگ و خشت و خار کو رکاوٹ نہیں بلکہ جرأت و حوصلہ دینے کی علامت ظاہر کیا ہے۔ آپ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو آرٹلری میں کمیشن پایا۔ سٹاف اینڈ کمانڈ کالج کوئٹہ میں گریجویشن کیا۔ ○○○

غزلیں

میں روشنی کی جگہ تیرگی پسند کروں
تمہاری زلف کی تابندگی پسند کروں

ہوا کے دوش مچلتے شرارتی پتے
یہی خیال یہی زندگی پسند کروں

مرے وجود کو پھولوں سے چوٹ لگتی ہے
گلوں کے خار کی رخشندگی پسند کروں

یہ قربتوں کے مسائل یہ وصلِ شب کی چبھن
میں حسن و عشق میں پائندگی پسند کروں

اسدؔ کے دل میں فقط اک ہے آرزو باقی
کسی نگاہ کی بالیدگی پسند کروں

★

افسانۂ نشاط لبوں پر رواں نہ تھا
یہ کیسی چاندنی تھی کوئی شادماں نہ تھا

حاصل ہوئی ہیں تیری محبت سے وسعتیں
دل میرا دل تھا اتنا کبھی بیکراں نہ تھا

رستے کے سنگ و خشت تھے میرے نصیب میں
کانٹے بھرے پڑے تھے کوئی گلستاں نہ تھا

آیا تھا ڈھونڈنے تری محفل میں تیرا قرب
سوچوں کے دائروں کے سوا کچھ وہاں نہ تھا

اب کے برس عجیب تھا موسم بہار کا
پھولوں میں رنگ و نور کا کوئی نشاں نہ تھا

پھیلا ہوا تھا سطحِ خلا پر مرا خیال
یہ کہکشاں نہ تھی یہ کوئی آسماں نہ تھا

سوچا تو آگ تھی سرِ صحرا لگی ہوئی
دیکھا تو دور دور کہیں پر دھواں نہ تھا

دیوار بن گئے تھے محبت میں سیم و زر
ورنہ وفائے یار کا یہ امتحاں نہ تھا

اب اس کا نام لب پہ بھی آتا نہیں اسدؔ
وہ شخص جو کبھی مرے دل پر گراں نہ تھا

لیفٹننٹ کرنل فوزی علی شاہ

فوزی ایک پیارا نام، ایک پیاری شخصیت، جادوگرانہ چال، افسرانہ وقار۔ صرف فوزی اگر پڑھا جائے تو یوں لگے جیسے فوزیہ نے اپنا تخلص فوزی کر دیا ہو لیکن یہ کچھ روائتی نام ہوتے ہیں جو بڑے پیارے اور دل میں کھُب جانے والے ہوتے ہیں۔ فوزی علی بھی ایسا ہی روائتی اور دل میں کھُب جانے والا نام ہے۔

سید فوزی علی شاہ ولد سید فیض علی شاہ ۱۴ اپریل ۱۹۵۴ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ بچپن لاہور میں گزرا۔ گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول لاہور سے میٹرک، ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی اور پھر پشاور یونیورسٹی سے بی ایس سی انجینئرنگ کیا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ پی ایم اے آگئے۔ جہاں سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ای ایم ای کور میں سیکنڈ لیفٹننٹ کی حیثیت سے کمشن حاصل کیا۔ مختلف عہدوں پر فرائض سرانجام دیئے۔ جبکہ اسی دوران انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے انجینئرنگ میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل آپ ایک بٹالین کی کمان کر رہے ہیں۔

جناب فوزی علی شاہ کو شعر و شاعری سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ ان کی شاعری میں ان کا دلی خلوص رچا بسا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک پُر خلوص انسان ہیں اس لئے ہمیشہ پُر خلوص انسانوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وطن سے انہیں والہانہ محبت ہے۔ جس کا اظہار اکثر ان کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی شاعری سادگی، خلوص اور حبِ وطن کی روشن اور تابندہ مثال ہے وہ شعر برائے شعر کے قائل نہیں بلکہ وہ شعر برائے زندگی کے پیروکار ہیں۔ آپ جب بھی بات کرتے ہیں تو زندگی کے حوالے سے، وقت اور زمانے کو پرکھ اور پڑھ کر احساسات کی کٹھالی سے سونا بنا کر اگلتے ہیں۔ شعر کو پیغام کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اس لئے ان کی شاعری ایک خاص مقصدیت لیے ہوتی ہے۔ جس میں ان کا دلی خلوص بھی شامل ہوتا ہے اور ہاں! شاعری سے ہٹ کر جب بھی آپ بات کرتے ہیں تو دھیمے اور دلکش لہجے سے گیتوں کی جھنکار کا گمان ہوتا ہے ○○○

غزلیں

ہر ڈھیر سے اشکوں کے گہر رول رہا ہوں
پھر سب سے چھپا کر انہیں خود تول رہا ہوں

گو ہونٹ مرے سی دیئے اک شاہ نے کل شام
دیکھو مری ہمت کہ ابھی بول رہا ہوں

آواز نہ دے کوئی مجھے آخرِ شب ہے
اس وقت میں افلاک کے در کھول رہا ہوں

ٹھہرائی تھی یہ شرط ملاقات کی اس نے
کس شوق سے میں دار پہ اب ڈول رہا ہوں

سمجھا نہ کوئی اس میں کوئی راز ہے پنہاں
تاعمر اٹھائے جو میں کشکول رہا ہوں

حال اپنے مقدر کا میں پڑھ لوں گا وہاں خود
پَر اپنے سوئے لوحِ ازل تول رہا ہوں

شاہوں سے خریدا نہ گیا مل کے بھی فوزی
مفلس ہی سہی پھر بھی میں انمول رہا ہوں

حسن کو گر عشق یونہی دیکھتا رہ جائے گا
داستانِ عشق میں پھر کیا بھلا رہ جائے گا

کب تلک یونہی امیدوں کے جلاؤں گا دیئے
نام ہونٹوں پہ ترا یونہی سجا رہ جائے گا

بزم کی رونق ہمارے دم سے قائم ہے تری
ہم ہی اٹھ جائیں گے محفل سے تو کیا رہ جائے گا

اپنی یادوں کو تو لے جائے گا تو جاتے ہوئے
میری آنکھوں میں ترا نقشہ رکھا رہ جائے گا

دار تک پہنچیں گے ہم راہِ وفا سے ایک دن
حشر تک زندہ یونہی نامِ وفا رہ جائے گا

پاسبانانِ وطن بھی ہو گئے غافل اگر
"نیند آجائے گی دروازہ کھلا رہ جائے گا"

آدمی ہی آدمی کو کھا گیا فوزی اگر
سوچتا ہوں میں کہ پھر دنیا میں کیا رہ جائے گا

لیفٹننٹ کرنل عبدالقادر عثمانی

شاعری اور حکمت ایک وقت تھا کہ لازم و ملزوم تھیں بلکہ ایک ہی شے کے دو عکس سمجھے جاتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ حکمت کی جگہ میڈیکل نے لے لی تو شاعری اور میڈیکل کی راہیں تقریباً تقریباً جدا ہو گئیں۔ لیکن آج بھی بے شمار ڈاکٹر ایسے مل جاتے ہیں جو شاعری کا ساتھ بھی با حسن نبھار ہے ہیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو آج کی شاعری زندگی کی ترجمان ہے اور زندگی سے جتنا قریبی تعلق ڈاکٹر کا ہوتا ہے اتنا اور شاید ہی کسی کا ہو۔ جس سے ادب پر بڑے دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جسم کی رگ رگ سے واقف ہوتا ہے اور جسم زندگی کی علامت ہے۔

عبدالقادر عثمانی جو آرمی میڈیکل کور کے ڈاکٹر ہیں۔ نشتر اور قلم دونوں سے کام لینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جہاں تک زندگی کو بچانے کا تعلق ہے یہ ان کا فرض اور پیشہ ہے اور پھر اسے پرکھنے اور جانچنے کے بعد اس کو نوک قلم پر لے آنا آپ کا شوق ہے۔ اور ان دونوں میں سے آپ زندگی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے میں کوتاہی کے مرتکب تو ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن زندگی کو بچانے میں آپ نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ یعنی اپنے شوق کو اپنے فرض پر ہمیشہ قربان کئے رکھا اور یہی وجہ ہے کہ بہت کم لکھا ہے۔ لیکن جو لکھا ہے اسے خوب پرکھ کر لکھا ہے۔ آپ نے جہاں دیکھا ہے کہ پھول نے ایک ادنٰی سی، معمولی اور وقتی مسکراہٹ کے لیے کانٹوں سے الجھ کر بڑے گہرے زخم کھائے ہیں تو اسے لگی لپٹی بغیر ویسے ہی پیش کر دیا۔ عشق و محبت میں آنکھوں سے ٹپکتی مے کو پی کر اس کا حوالہ دینے میں استعارے نہیں برتے۔ کبھی کبھی ساغر تھاما ہے تو اسے تسلیم کیا ہے۔ حسن کو حسن سمجھ کر اس کی بھرپور تعریف کی ہے نہ کہ اپنی محرومیوں کا رونا رویا ہے۔ بلکہ اس کی تمام تر حشر سامانیوں، فتنوں اور حدتوں کا ببانگ دھل تذکرہ کیا ہے۔۔۔ اور جب ذات کی بات آتی ہے تو اپنی فریب کاریوں اور ریاکاریوں کو واضح کیا ہے۔ آپ نے اگر کبھی زاہد بن کر دھوکہ دینے کی کوشش کی بھی ہے تو اس کا اعتراف کر کے عظمت کا ثبوت دیا ہے۔

جناب عبدالقادر عثمانی ۳ فروری ۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے اور ۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو آرمی میڈیکل کور میں کمشن پایا۔ ○○○

غزلیں

یاسمن زار نہ ہو، لطفِ چمن زار نہ ہو ۔ پھول مہکا ہو جہاں کوئی وہاں خار نہ ہو
حشر کو آنے میں اے یار کوئی عار نہ ہو ۔ دو قدم آگے اگر فتنۂ رفتار نہ ہو
دامنِ برق، حجابِ رخِ دیدار نہ ہو ۔ جس سے بجلی گرے وہ گرمیِ گفتار نہ ہو
بارِ عصیاں کے سوا دو، دو فرشتے سرِ دوش ۔ لطف ہے یہ کہ طبیعت پہ ذرا بار نہ ہو
مانگتا ہوں یہ دعا حشر کا دن، رات بنے ۔ اے بتو میری طرح کوئی سیہ کار نہ ہو
کب سے کشتی ہے بھنور میں میری اٹکی یارو ۔ ڈوب ہی جائے یہ کم بخت اگر پار نہ ہو

خلق کو دھوکا دیئے جاتے ہو زاہد بن کر
تجھ سا قادرؔ بھی کوئی بندہ ریا کار نہ ہو

وفا نے نقش ابھارا یہ زندگی کے لئے ۔ کہ میں نے جان لٹا دی تری خوشی کے لئے
خزاں کے دور میں کانٹوں کے زخم کھائے ہیں ۔ گلوں نے خندہ لبی اور شگفتگی کے لئے
نہ جانے آج یہ کیسی بہار آئی ہے ۔ ترس رہا ہے زمانہ کلی کلی کے لئے
ہوا کی موج ستارے کی روشنی ترا قرب ۔ کوئی سماں ہو طبیعت کی تازگی کے لئے
میں ان کی مست نگاہوں سے روز پیتا ہوں ۔ ہے دورِ ساغر و مے تو کبھی کبھی کے لئے
وہ دل بجھے ہیں کہ اب تیرگی نہ جائے گی ۔ "بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے"

غروبِ مہر ، غنائے گل و سمن قادرؔ
غرض ہزار اشارے ہیں آدمی کے لئے

ونگ کمانڈر محمد عقیل قریشی

محمد عقیل قریشی ایک مدت سے یعنی تقسیمِ ہند سے پہلے سے لکھ رہے ہیں اور شعر کہہ رہے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے لوگ شاید اس بنار پر آپ سے ناواقف ہوں کہ آپکا یہ نام بہت کم ادبی صفحات پر نظر آیا ہے۔ دراصل آپ ابو سہیل عقیل کے ادبی نام سے لکھتے ہیں۔

جناب ابو سہیل عقیل کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ آپ ابھی ہائی سکول میں پڑھتے تھے کہ موزونیت کی طرف چل پڑے اور مولوی قمرالحق مونگیروی جوکہ آپ کے سکول میں استاد تھے، سے اصلاح لینے لگے اور اخبارات میں شائع بھی ہونے لگے۔

آپ کو شعر کہنے سے زیادہ اشعار کی Collection کا شوق تھا۔ اور اس شوق نے آپ کے مطالعہ کو بہت وسیع کیا۔ جب ہند و پاک آزاد ہوئے تو آپ ان دنوں انبالہ چھاؤنی میں تھے۔ تقسیم کی افراتفری میں آپ کی ایک ضخیم بیاض بھی وہیں رہ گئی اور آپ پاکستان آ گئے۔ یہاں آکر سب سے پہلا مسئلہ روٹی، کپڑا اور مکان کا تھا۔ سو گردشِ روزگار میں شعر کی طرف توجہ ہی نہ ہو پائی۔ لیکن فوری ہی یہ مسئلہ حل ہوگیا اور ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب بطور فلائنگ افسر سرگودھا میں آپ کی تعیناتی ہوئی تو گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل (جو اہلِ ذوق کی قدر افزائی بھی کرتے تھے) سید احمد علی عابد سے ملاقات ہوئی اور پھر ان کی وساطت سے مقامی شعرار سے ملنے کا موقع میسر آیا۔

اب جو پرانی عادت یا شوق دب گیا تھا اس نے پھر سر ابھارا اور جناب محمد عقیل قریشی اس جانب متوجہ ہوئے اور طبیعت مائل ہونے لگی۔

ونگ کمانڈر محمد عقیل قریشی ایک لمبا عرصہ ایئرفورس میں گزارنے یعنی کم و بیش ۲۱ سال کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کو پاکستان فضائیہ سے سبکدوش ہوئے۔ ابھی آپ ۶ ماہ کی رخصت پر تھے کہ آپ کو پاکستان فضائیہ کے سرگودھا کالج میں ایڈمنسٹریٹو افسر مقرر کر دیا گیا۔

آپ کی ایک کتاب "انتخاب" شعرار کے مختلف مضامین کے تحت یکجا کئے گئے شعروں کی ایک بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ادبی ایج ہے۔ اس انتخاب سے آپ کا شعری ذوق، محنت، مطالعہ اور کاوشیں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ○○○

نمونۂ کلام

اہلِ دانش جنہیں کہتے رہے بیگانہ خرد — وہی مجذوب تھے جو سرِ نہاںؑ تک پہنچے
اِس طرف نارِ جہنم ہے اُدھر خلدِ بریں — ڈھونڈنے والے تجھے دیکھ کہاں تک پہنچے
جن کو دعویٰ ہے عروضی کا قوافی پہ عبور — چشم و ابرو سے چلے تیر و کماں تک پہنچے
عشق کامل ہو تو ہوتا ہے یقیں کا ہم سر — عقل پختہ ہو تو بس وہم و گماں تک پہنچے
آپ ہی نے تو نکالا تھا اِرم سے ہم کو — ہم زمیں سے جو چلے ہفت سماں تک پہنچے
جامہ زیبی نے ابھارا ہے تمہارا جوبن — ہاتھ ترساں ہے کہ وہ کیسے وہاں تک پہنچے

کیا مرصع یہ غزل تم نے سنائی ہے عقیلؔ
کیا عجب داد اگر کون و مکاں تک پہنچے

کیا نیا کوئی ستم آپ نے ایجاد کیا — ورنہ اس بندۂ ناچیز کو کیوں یاد کیا
سن کے روداد مری اس نے بصد ناز کہا — پھر سے فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا

آج ہوتا ہے مرے دل میں سوا درد عقیلؔ
کیا مرے دشمنِ جاں نے مجھے پھر یاد کیا

اندوہ و رنج کے جو بادل تھے چھٹ گئے — منزل قریب آئی تو رستے سمٹ گئے
وہ گل بدن جو رات تصور میں آگیا — اپنے گلے میں ڈال کے بانہیں لپٹ گئے

جس ماہ رُو کو دیکھا وہ دل میں سما گیا
ٹکڑے میرے جگر کے حسینوں میں بٹ گئے

آپ کا رینک ماسٹر وارنٹ افسر ہے

ونگ کمانڈر عبدالرحمان (رحمان کیانی)

سعودی عرب میں نعیم حامد علی صاحب "نغمۂ پیکر" سے ملاقات ہوئی تو اس نے رحمان کیانی کا غائبانہ تعارف ماسٹر وارنٹ آفیسر کی حیثیت سے کروایا۔ جب ونگ کمانڈر محمد اسماعیل واثق سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رحمان کیانی کا عہدہ بوقت ریٹائرمنٹ ونگ کمانڈر بتایا۔

نام عبدالرحمان اور عرف محمد میاں تھا۔ ۲۹ محرم ۱۳۴۳ھ کو موضع منڈیاں ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی حافظ محمد عبدالحق فرنگی محل اور ندوۃ العلوم سے فارغ التحصیل، صوفی منش، تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن اور تحریکِ پاکستان کے پرجوش حمایتی تھے۔

جناب عبدالرحمان نے ابتدائی تعلیم دادی اور پھوپھی سے پائی۔ ابتدائی فارسی اپنے تایا حکیم محمد ولی سے پڑھی۔ مزید فارسی، عربی، تاریخ، سیرت اور مذہبی تعلیم اپنے والد سے اُن کے مدرسے صفی پور ضلع اوناؤ اور مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ سے حاصل کی مروجہ تعلیم بر جلیسیہ مڈل سکول ریاست بھوپال ہائی سکول امیر الدولہ اور اسلامیہ کالج لکھنؤ سے پائی۔

۱۹۴۳ء میں آپ ایئر فورس میں شامل ہو گئے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو آپ پاکستان ایئر فورس میں آ گئے۔ پھر آرامنٹ انجینئرنگ میں ڈپلومہ لیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایئر یونیورسٹی امریکہ سے آرامنٹ کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ دس سال سکول آف ایئروناٹکس میں انسٹرکٹر رہے اور سات سال پاک فضائیہ کی مرکزی ممتحنہ کے رکن رہے۔ ۱۹۷۴ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

شاعری کی ابتدار ۱۹۳۸ء میں ہوئی لیکن فوج میں شمولیت کے بعد کچھ عرصہ تک آپ خاموش رہے۔ ۱۹۵۶ء کے بعد ادبی حلقوں میں شرکت شروع کی اور تصنیف و تالیف کے کام کی ابتدار کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ ونگ کمانڈر رحمان کیانی نے شاعری کو روائتی خدوخال سے باہر نکالا اس سے نصائح اور تبلیغ کا کام لیا آپ نے معاشرے کو اپنی شاعری کے ذریعے وطن سے محبت، قومی فرض سے آگاہی، اسلامی تشخص، عشقِ رسول ؐ، توحیدِ باری تعالیٰ پر یقینِ محکم، عزتِ نفس، افواجِ پاکستان کی جرأت و ہمت اور دشمنانِ دین و ملت کی عیاریوں سے آگاہی کے علاوہ پیار اور یگانگت کا درس دیا ہے۔ آپ کی شاعری ہر محب وطن پاکستانی اور ہر اسلام دوست کے جذبات کا ولولہ انگیز اظہار ہے۔ میرے اس دعوے کا ثبوت "حرفِ سپاس"، "سیف و قلم"، "پلکوں کے چراغ"، "شعلۂ مشرق"، "شمشیرِ ضیابار"، "شرارِ سنگ" اور "ناشنیدہ" وغیرہ میں آپ کو مل سکتا ہے ○○○

نیا پاکستان ۱۹۷۲ء

امنڈ گھمنڈ کر سیاہ بادل ہر ایک جانب سے آرہا ہے
تھرک رہا ہے مٹک رہا ہے اور اپنی ڈھولک بجا رہا ہے
ٹِکا کے کمبل میں اپنے سورج چھُپا کے سب چاند اور ستارے
گھروں کے سارے دیئے بجھا کر نظر پہ قدغن لگا رہا ہے
ہر ایک جانب ہے قبر جیسا دبیز، تہہ دار، گھُپ اندھیرا
جو دیکھ سکتے تھے مر کے منظر وہ زندگی میں دِکھا رہا ہے
گھٹائیں کھل کر برس رہی ہیں اور اس پہ آندھی بھی چل رہی ہے
درخت جڑ سے اکھڑ رہے ہیں گھروں کو سیلاب کھارہا ہے
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن فلک مخالف، زمین دشمن
اِدھر سے بجلی چمک رہی ہے اُدھر سے طوفان آرہا ہے
ہر ایک شے کو ہوا کے جھکڑ پکڑ کے تھپڑ لگا رہے ہیں
خفا ہیں نالے، غضب میں دریا، اُدھم سمندر مچا رہا ہے
اور اس سمندر میں اک سفینہ خراب و خستہ، شکستہ، جس کا
خدا تو ہے ناخدا نہیں ہے نہ جانے کس سمت جارہا ہے

غزل

لوگ سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتے ہیں — لو چراغوں کی سرِ شام بڑھا دیتے ہیں
رات بھر "جاگتے رہنا" کی صدائیں دے کر — صبح تک شہر کے لوگوں کو سلا دیتے ہیں
جانتے ہیں کوئی سیلاب ہے آنے والا — پھر بھی اک ریت کی دیوار اٹھا دیتے ہیں
اتنے وابستۂ گلشن ہیں کہ پھولوں کی طرح — لوگ گلدان میں کانٹے بھی سجا دیتے ہیں
چیز کڑوی ہے مگر دھوپ سے بچنے کے لئے — نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگا دیتے ہیں
غم گسارو تمہیں معلوم ہے یہ رسمِ جہاں — صبح ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتے ہیں

پہلے دیوانہ بنا دیتے تھے لوگوں کو حسیں
آج کل شہر کے حالات بنا دیتے ہیں

ونگ کمانڈر امداد باقر رضوی (ڈاکٹر فہیم اعظمی)

بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ ایئر فورس کے ونگ کمانڈر امداد باقر رضوی ادبی دنیا میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور جس نے جوش ملیح آبادی کی سوانح عمری "یادوں کی بارات" پڑھی ہے تو اس نے ایک کردار "دُلارے میاں" کا نام بھی پڑھا ہو گا۔ یہ دلارے میاں یہی فہیم اعظمی ہیں۔

جناب امداد باقر رضوی ۱۹۲۵ء میں موضع چماواں ضلع اعظم گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ روائتی ماحول میں ہوش سنبھالا جس میں ادب کا خاص عمل دخل تھا یعنی آپ کے والد عقیل اعظمی ایک معروف ادبی شخصیت تھے۔

ابتدائے تعلیم مکتب میں "آمد نامہ" اور "خالق باری" سے شروع ہوئی۔ پھر "گلستان"، "بوستان" پڑھی۔ ۱۹۴۱ء میں چھتریہ ہائی سکول سے میٹرک اور ۱۹۴۳ء میں اینگلو بنگالی انٹرمیڈیٹ کالج اعظم گڑھ سے انٹر پاس کیا ۱۹۴۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فلسفہ ۱۹۵۰ء میں ایم اے تاریخ اور ۱۹۵۱ء میں ایم اے جرنلزم کیا۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ آپ پاکستان ایئر فورس میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے ۰۰۰ اور پھر ۰۰۰ ۱۹۷۴ء میں جب آپ ونگ کمانڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو سعودی عرب کی حکومت نے آپ کی خدمات لے لیں اور آپ رائل سعودی ایئر فورس میں ایڈوائزر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ پھر انہی دنوں یعنی ۱۹۸۲ء میں امریکہ سے پی ایچ ڈی کر لیا۔

۱۹۴۰ء میں آپ کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ اور یہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ نظم اور نثر میں آج تک جاری ہے۔ آپ نے کتنی کتابیں لکھیں کچھ کہہ نہیں سکتا ہاں البتہ جو میری نظر سے گزریں ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

"پاکستان کے بورژوا انقلابات"، "قوم اور قومیتوں کا مسئلہ"، "بہت دیر ہو چکی"، "پھر کیا ہوا؟"، "جنم کنڈلی" اور "حصار" ○○○

غزلیات

ہم کو منظور تو نمرود کی تعظیم نہیں
کیسے گل، نار ہو جب عزمِ براہیم نہیں

یہ تو بات اور ہے کچھ آپ کو تسلیم نہیں
یہ نہ مانوں گا مری بات کی تفہیم نہیں

میں نے چاہا تھا مرض میرا اسے لگ جائے
اس میں اب تک تو محبت کے جراثیم نہیں

دل کی حرکت کی ہے تفصیل ستاروں کی نہیں
ڈائری ہے یہ مری سال کی تقویم نہیں

فوقیت تم کو اگر دوں تو میں گھٹ جاؤں گا
عشق اک فعلِ ضرب ہے کوئی تقسیم نہیں

چور جب گھر میں گھسا دوش ہمارا کیا تھا
آپ کا حسنِ خطط تھا میری اسکیم نہیں

سب میں جذبات کے اظہار کی قوت ہے فہیم
شاعری کے لیے لازم کوئی تعلیم نہیں

پگڈنڈیوں کو چھوڑ جہاں گشتِ حال ہوں
میں زندگی کی شام میں زیادہ فعال ہوں

ہر ماہِ نو محرک جذباتِ زندگی
مد و جزر کے بیچ ابھرتا سوال ہوں

نو آزمودہ لوگ مجھے جانتے نہیں
میں شاعری کی عمر ہوں اور لازوال ہوں

مرنے کے بعد ماہیتِ ذوق کے طفیل
تخلیقِ نو نوائی کی زندہ مثال ہوں

مانا حریقِ حسن ہو تم مشعلِ شباب
موسم زدہ شجر ہوں میں شعلہ خصال ہوں

یوں لاف زن ہوں خاطرِ احباب کے لئے
ورنہ خیالِ خام ہوں قدرِ سفال ہوں

میں بھی فہیم اپنے مقدر کا ہوں اسیر
اک دائرے میں گھوم رہا ہوں محال ہوں

ونگ کمانڈر غلام فرید آشنا

اردو شاعری میں بہرحال غزل کا اپنا ایک مقام ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ابتداء میں یا دورِ وسطیٰ میں غزل کی اپنی ایک خاص نہج تھی جو باقی اصنافِ شاعری سے قدرے ہٹ کر تھی اور اپنی روش سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جانا اسے غزل سے الگ کر دیتا تھا۔ لیکن جدید غزل نے ان تمام طبقات کو مٹا کر یک جہتی کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ آج ہم غزل میں ہر وہ بات کہہ دیتے ہیں جو کبھی صرف نظم کے لئے مخصوص تھی حتیٰ کہ کسی روداد یا داستان کو بیان کرکے اسے غزلِ مسلسل کا نام بھی دے سکتے ہیں بشرطیکہ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ جدید غزل میں دقت پسندی، استعارات و تشبیہات اور کنایات نے اسے مشکل و نافہم کر دیا ہے جو عام قاری کے ذہن کے اوپر اوپر سے گزر جاتی ہے۔ مگر بہت سے شاعر آج بھی سادہ اور سلیس الفاظ کے استعمال سے غزل کو عام فہم اور پُررونق بنا کر پیش کر رہے ہیں انہی سادہ فطرت اور آسان پسند لوگوں میں جناب آشنا بھی ہیں۔

آپ نے پاکستان ایئرفورس میں کمشن حاصل کیا اور ونگ کمانڈر کے عہدے تک پہنچے۔ لیکن بیماری نے آپ کو کمبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی پہنچا دیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے آپ کو بستر پر لیٹنے پر مجبور کردیا۔ ہسپتال میں عسکری جسمانی بھاگ دوڑ سے تو آپ محروم تھے۔ لہذا شاعری کی بھاگ دوڑ جاری رکھی اور آخری لمحات تک یہ تگ و دو کرتے رہے۔ آپ کی یہ تگ و دو بیماری کے خلاف فکر و خیال کی تھی۔

۱۳ جون ۱۹۷۳ء کا دن غلام فرید آشنا کے احباب کے لئے ایک دکھ بھری خبر لے کر ابھرا اور نوجوان ہارون فرید کو گھر کی نئی ذمہ داریاں سونپ کر روپوش ہو گیا۔

مرحوم ایک اچھے افسر اور صداقت شعار آدمی تھے۔ آپ نے اپنے کلام میں اپنی روایات سے محبت اور مہر و وفا کا اظہار بھی کیا اور شکایات بھی۔ یوں انسانی فطرت کے تقاضوں کا بھرم رکھا○○○

غزلیں

چھلکتے ساغر و مینا و جام بھی آئے　　سبو بدوش کئی لالہ فام بھی آئے
نہ راستوں کا تعین نہ منزلوں کا نشان　　رہِ حیات میں ایسے مقام بھی آئے
ہماری یاد کی توہین ہے نہ یاد کرو　　کبھی کبھی ہمیں ایسے پیام بھی آئے
شفق سے خونِ تمنا کی سرخی مٹ جائے　　سحر سے پہلے کبھی ایسی شام بھی آئے
جہاں کھڑے ہی رہے ہم جھکے تو جھک نہ سکے　　نمازِ عشق میں ایسے مقام بھی آئے
ہمارے خون کی سرخی سے کھیلنے والو　　ہمیں ہیں راہِ وفا میں جو کام بھی آئے
کفن سے ڈھانپ دے ان بے نقاب چہروں کو　　خدا کرے کوئی ایسا نظام بھی آئے
تڑپنے کی بھی نہ طاقت تھی جن میں اے صیاد　　کچھ ایسے مرغِ سحر زیرِ دام بھی آئے

حضورِ داورِ محشر ہر ایک حاضر ہے
میں منتظر ہوں کہ آشا کا نام بھی آئے

★

ہم ایک حرفِ غلط کی طرح مٹائے گئے　　ہمارے مٹنے کی یارو حکایتیں کیسی
کسی سے دل کی کوئی بات کہہ نہیں سکتے　　کسی سے ہم کو بھلا پھر شکایتیں کیسی
جو دو قدم ہی چلے تھے کہ تھک کے بیٹھ گئے　　رہِ حیات میں ان کی رفاقتیں کیسی
گناہ سمجھ کے کبھی بھی گناہ کر نہ سکے　　خدا کے سامنے جھوٹی ندامتیں کیسی
ہمارے درد کا احساس وقت کو بھی نہیں　　تو پھر یہ پل یہ گھڑی اور ساعتیں کیسی
چراغِ شب میں اگر خونِ دل جلا نہ سکے　　تو پھر سیاہیِ شب کی حکایتیں کیسی
فقیہہِ شہر کو للّٰہ کوئی سمجھائے　　جو بے اثر ہی رہیں وہ ہدایتیں کیسی

نقیبِ شہر نے آشا کو اب پکارا ہے
اسے بچا نہ سکیں، یہ شفاعتیں کیسی

ونگ کمانڈر رشید قیصرانی

بلوچ قبائل میں ایسے ایسے روشن دماغ افراد نے جنم لیا جنہوں نے روایات کی ڈگر بدل کر امن و آشتی کا پیغام بھی دیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ پنن خان نے دنیائے عشق میں ایسا کردار ادا کیا کہ بلوچوں کی اس تاریخ کو امر کر دیا۔ آج بھی لوک شاعری میں اگر پنوں اور سسی کے عشق کا تذکرہ نہ ہو تو وہ شاعری بے لطف محسوس ہوتی ہے۔

کوٹ قیصرانی (جسے غالباً بستی شیر گڑھ بھی کہتے ہیں اور اسے تحصیل تونسہ میں شیر بہادر خان نے آباد کیا تھا) کے سردار شیر بہادر خان کے گھر ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء کو ایک بچے نے جنم لیا۔ جس کا نام رشید خان رکھا گیا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کوٹ قیصرانی سے شروع ہوئی اور لاہور سے بی اے کی ڈگری کے حصول پر آ کر رک گئی۔ صحافت کا شوق لئے سفر پر نکلے اور ۱۹۵۳ء میں ایئر فورس میں افسر بن گئے۔ افسرائی شروع ہوئی تو شاعری کا شوق بھی آوارد ہوا اور ۱۹۵۴ء میں شعر کہنے شروع کر دیئے اور بقول خود "ایک نامکمل غزل کہی تھی اس کو مکمل کرنے کے لئے شعر کہے جا رہا ہوں اور المیہ یہ ہے کہ وہ آخری شعر ابھی تک نہیں ہوا جس پر میں نے اپنا یہ طویل سفر ختم کرنا ہے"۔

جناب رشید قیصرانی نے ایئر فورس میں ایک مدت گزارنے کے بعد ونگ کمانڈر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔ ملازمت کے دوران ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں عملاً حصہ لیا اور بہت کچھ سیکھا۔ جو فوجی زندگی میں ممد ثابت ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں سول ملازمت اختیار کی وزارتِ ثقافت و سیاحت کے ذیلی ادارے (ادارہ ثقافتِ پاکستان) کے سیکرٹری رہے۔

آپ کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ابتدائی دور کی شاعری جس میں غالب اور فیض جیسے عظیم شعراء سے متاثر ہو کر لکھا دوسرا پختہ دور کی شاعری جس میں صرف غزلیں کہیں اور پہلی روش سے ہٹ کر کہیں۔ نئی تراکیب، نئے استعارے اور نیا لب و لہجہ تیار کیا "فصیلِ لب" اور "کنارِ چشم" اس بات کی گواہ ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری میں بلوچوں کی خاص سج دھج کو استعمال کیا ہے اور اپنی علاقائی علامتیں برتی ہیں۔ آپ کی شاعری کا کینوس خاصا وسیع دکھائی دیتا ہے۔ غزل کو پسند کر کے آپ نے تخلیقی صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ "نین جزیرے" آپ کے دوہوں کی کتاب ہے۔ جو علاقائی اور روائتی شان و شوکت سے جلوہ گر ہوئی ہے ○○○

حمد

دلوں کی دھڑکنیں آنکھوں کی بارشیں بولیں
محبتوں کے خدا سے محبتیں بولیں

میں بار بار پکاروں تجھے نعیم مرے
کہ بار بار ترے در سے نعمتیں بولیں

میں خلوتوں کی کہانی جو تیرے نام لکھوں
سرِ صحیفۂ جاں تیری جلوتیں بولیں

میں پستیوں کا مکیں پستیاں حروف مرے
تو رفعتوں کا جہاں تیری رفعتیں بولیں

نشاں بھی تو ہے یہ ساری نشانیاں تیری
کہ اس جہاں میں فقط تیری آئتیں بولیں

میں خاک تھا مجھے دل دے دیا نظر دے دی
مرے وجود میں بھی تیری عظمتیں بولیں

ترے حضور ہو جب بھی حسابِ حرف و بیاں
تری عنائتیں میری عقیدتیں بولیں

مجھے جو اسم سکھائے وہی ہیں یاد ابھی
مری زباں سے ابھی تک وہ صحبتیں بولیں

مجھے جو اذن ملے تو رشید مجھ سے بھی
سکوت بات کرے اور خلوتیں بولیں

غزل

صدیوں سے میں اس آنکھ کی پتلی میں چھپا تھا
پلکوں پہ اگر مجھ کو سجا لیتے تو کیا تھا

تو پھیل گیا تا بہ ابد مجھ سے بچھڑ کر
میں جسم کے زنداں میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا

ہاں مجھ کو ترے سرخ کجاوے کی قسم ہے
اس راہ میں پہلے کوئی گھنگرو نہ بجا تھا

گزرے تھے مرے سامنے تم دوشِ ہوا پر
میں دور کہیں ریت کے ٹیلے پہ کھڑا تھا

سینے میں ابھرتے ہوئے سورج کا تلاطم
آنکھوں میں تری ڈوبتی راتوں کا نشہ تھا

اے دیدۂ حیراں تو ذرا اور قریب آ
اے ڈھونڈنے والے میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا

اب جانئے کیا نقش ہواؤں نے بنائے
اس ریت پہ میں نے تو ترا نام لکھا تھا

اچھا ہے رشید آنکھ بھر آئی تھی کسی کی
اس خشک سمندر میں تو میں ڈوب رہا تھا

☆

ونگ کمانڈر پیر احمد اکرم (پیر اکرم)

جناب پیر احمد اکرم ۱۹۳۰ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤاجداد کشمیر کی وادیٔ جنت نظیر سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب کے اس شہر میں آکر آباد ہوئے تھے یہ شہر ثقافتی اور تہذیبی روایات کا مرقع ہے۔

جب تحریکِ آزادیٔ پاکستان چلی تو برصغیر کے مسلم طلبہ نے اس میں بھرپور حصہ لیا پیر اکرم نے باوجود کم عمری کے اس تحریک میں مسلم نوجوانوں کے ساتھ مل کر آزادی کے لئے بھرپور کام کیا اور جب اپنی امیدوں اور امنگوں کی سرزمین حاصل کر لی تو اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے اپنے وطن یعنی پاکستان آ گئے۔ یہاں آکر تعلیمی سفر جاری رکھا اور پنجاب یونیورسٹی سے نفسیات میں ماسٹر کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار مقرر ہوئے۔

ونگ کمانڈر پیر احمد ۱۹۵۷ء میں پاک فضائیہ میں شامل ہوئے۔ آپ کی ساری مدتِ ملازمت کوہاٹ اور پشاور کی حسین و دلکش وادیوں میں گزری یہاں تک کہ آپ ونگ کمانڈر کے عہدے سے وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں آپ نے شاعری کی ابتدا کی۔ آپ کی شاعری میں کوہاٹ اور پشاور کے دلکش مناظر کی طرح خوبصورت استعارے اور مضبوط اقدار پائی جاتی ہیں آپ کا کلام ملک کے نامور ادبی رسالوں مثلاً "نیرنگِ خیال"، "افکار"، "فنون"، "ماہِ نو"، "آہنگ" وغیرہ میں اکثر چھپتا رہتا ہے۔

آپ کا مجموعۂ کلام "آئینے صداؤں کے" کافی مقبولیت پا چکا ہے اور ادبی حلقوں نے اسے خوب سراہا ہے۔ آپ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "آپ کلاسیکل لہجے اور جدید رویوں کے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری میں جدید اور قدیم رجحانات کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری اپنی روایات کی محکم قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی کے نئے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی فن کی بھرپور حمایت کے ساتھ قاری کو متاثر کرتی ہے" ○○○

ہدیۂ عقیدت

کچھ اس طرح سے ترا ﷺ ذکر صبح و شام کروں
متاعِ حسنِ بیاں وقف تیرے ﷺ نام کروں

سجاؤں چہرے پہ اپنی ندامتوں کے حروف
جھکی نظر کی زباں سے تجھے ﷺ سلام کروں

ترے ﷺ پیام کی تفسیر اور کیا ہوگی
بس ایک لفظِ محبت جہاں میں عام کروں

تو ﷺ آدمی بھی تھا تکمیلِ آدمیت بھی
اسی سبب تو ہر انساں کا احترام کروں

نہیں ہے زادِ سفر شوقِ رہگزر تو ہے
مجھے بھی اذنِ سفر ہو تو اہتمام کروں

تمہاری ﷺ ذات کی نسبت سے لوگ پہچانیں
کبھی زمانہ میں ایسا بھی کوئی کام کروں

بس اب تو دل میں یہی آخری تمنا ہے
ترے ﷺ حضور پہنچ کر تجھے سلام کروں

غزل

سسک رہی ہے اندھیروں میں شامِ تنہائی
کوئی چراغ جلاؤ بنامِ تنہائی

سدا رہے یونہی آباد، شہرِ شیشہ گراں
ہمارے نام کیا وقف جامِ تنہائی

روش روش پہ ہیں کچھ آئینے سے ٹوٹے ہوئے
قدم قدم ہے نشانِ خرامِ تنہائی

یہ کس خیال سے روشن ہے کنجِ شامِ فراق
یہ کیسی لو سے دمکتا ہے بامِ تنہائی

یہ سوچ کر کہ وہ جاں، جانِ انجمن بھی تو ہے
اسے نہ بھیج سکوں اک سلامِ تنہائی

لکھی ہیں پلکوں پہ بے حرف بھی مناجاتیں
کمالِ فن سے کیا احترامِ تنہائی

سجائی ہونٹوں پر دیوار و در کی خاموشی
کچھ اس طرح بھی کیا اہتمامِ تنہائی

فرازِ درد سے اکرمؔ صحیفۂ دل پر
اتر رہا ہے مسلسل کلامِ تنہائی

★

سید افضل تحسین کا ہی دوسرا نام ہے

کمانڈر مظہر ماہی

مزاح اور تفنن شعری ادب کی ایک جیتی جاگتی روایت ہے۔ جو تفریحی پہلو کے ساتھ ساتھ اصلاحی مقاصد کی تکمیل میں بھی معاون ہوتی ہے۔ ایک بات اور جو کہ کچھ عجیب سی ہے وہ یہ کہ ہر پڑھنے والے کی اپنی سوچ اور فکر کا چونکہ بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ جس طرح یا انداز میں کسی بھی تحریر کو ایک قاری پڑھ کر سوچے گا اور معنی اخذ کرے گا وہ ویسے ہی اس کے ذہن پر نقش ہوگی۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بڑی سنجیدہ سی تحریر کو ہم طنز اور مزاح کے روپ میں لے لیتے ہیں اور کبھی یوں کہ طنزیہ لکھت کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بالکل سنجیدہ سی بات کہی گئی ہے۔ لیکن کچھ تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو غور و خوض کا موقع فراہم کرتی ہیں اور قاری مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے اس کے صحیح لہجے میں سوچے۔ ہاں! ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت اس کے معنی سمجھنے یا اس کی روح کو جانچنے میں غلطی بھی کر جائے۔

کمانڈر مظہر ماہی اس مکتب کے آدمی ہیں جو ماحول کو پڑھتے اور قاری کے ذہن کو پرکھتے رہتے ہیں۔ جو وقت کی نازک مزاجی اور حالات کی نازک خیالی کو سمجھتے ہیں۔ آپ کی طبیعت میں فطرت نے ایک خاص لچک رکھی ہے۔ جو آپ کی شاعری کے توسط سے ہم تک پہنچتی ہے۔ اب یہ زمانے کی مرضی ہے کہ وہ ان کے ساتھ ساز کرے یا باز کرے۔ وہ زمانے کو اپنے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ لیکن زمانہ ہے کہ ان کی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔

جس طرح شخصیت اور فن ہر فنکار کے دو نمایاں پہلو ہوتے ہیں اور بہتر فنکاروں کی شخصیت اور فن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں وہ المیہ جناب مظہر ماہی کے ساتھ نہیں۔ آپ ماہی ہیں تو اسے پس پردہ نہیں رکھتے۔ بلکہ آپ اسی کا مظہر بھی ہیں۔ آپ کی شخصیت کا جو پہلو پوشیدہ ہے۔ اُسی کی طرح شاعری میں بھی کوئی کوئی پہلو تہ در تہ ملتا ہے اور پرتیں کھولنے پر اجاگر ہوتا ہے۔ ○○○

پیارے لوگ

ہم تھے موجوں کے دوش پر رقصاں دیکھتے تم رہے کنارے سے
تم کو ہم سے اگر لگاؤ ہے ہم سے کہہ دیتے کچھ اشارے سے
پہلے جو جیت کی علامت تھے اب وہ لگتے ہیں جیسے ہارے سے
بات ہے اُس کی دل خراش بہت جیسے چِر جائے سینہ آرے سے
زر کی دیوی کو پوجنے کے لئے لوگ پھرتے ہیں مارے مارے سے
سن کے سچ بات زِچ ہوا ایسے جیسے نکلے ہَوا غبارے سے
پیاری پیاری جو کرتے ہیں باتیں لوگ ہوتے ہیں پیارے پیارے سے
بات سیدھی بھی جو سمجھ نہ سکے خاک سمجھے گا استعارے سے

عہدِ وفا

نہ ہی عہد کا تجھے پاس ہے، نہ وفا کی کوئی اساس ہے
یہ ہے بات کیا ترا قول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کبھی غیر کے بنو ہم نوا کبھی اپنوں سے کہو ماجرا
یہ عجیب سا ترا رول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کسی ایک شخص کا ساتھ دو، کسی ایک شخص کو ہاتھ دو
بھلا یہ بھی کوئی مخول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کبھی دوستوں کے ہجوم میں، کبھی دشمنوں کے قدوم میں
تیرے دل میں طرفہ یہ ہول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کبھی سیدھے سادھے سے تیر ہو، کبھی آڑھی ترچھی لکیر ہو
تری ذات میں کیسا جھول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کبھی ساتھ دو کبھی چھوڑ دو، کبھی دل کو ضرب سے توڑ دو
تری شخصیت کا یہ قول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف
کبھی راہرو کی سبیل ہو، کبھی راستے کی فصیل ہو
کبھی چپٹی ہے، کبھی گول ہے، کبھی اس طرف کبھی اس طرف

میجر مرزا مصطفیٰ اشرف گورگانی رزمی، مخفی

جب بہاولپور ایک الگ ریاست تھی تو امیر بہاولپور نواب صادق محمد خان کے اتالیق مرزا محمد اشرف گورگانی بزمی تھے۔ بزمی اتالیق تو تھے ہی، شاعر بھی تھے اور ایک اور اعزاز جو آپ کے حصے میں آیا کہ آپ "صادق التواریخ" کے مصنف بھی تھے۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۰۳ء کو جے پور میں آپ کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام آپ نے مصطفیٰ اشرف رکھا۔

مرزا مصطفیٰ اشرف نے ابتدائی تعلیم جے پور میں حاصل کی۔ رحیم یار خان سے مڈل اور کلکتہ کے اینگلو عربک ہائی سکول سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کیا اور والد کی علالت کے باعث بہاولپور آ گئے۔ جنہوں نے ۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء میں رحلت فرمائی۔

مرزا مصطفیٰ اشرف گورگانی نے ۱۹۲۴ء میں والد کے انتقال کے بعد صادق ایجرٹن بہاولپور سے ایف اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ جے پور میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ لیکن اپنے خالو جان فیاض حسین اور کرنل مقبول قریشی کے بلانے پر بہاولپور آ گئے اور فوج میں شامل ہو گئے۔ سات سال تک خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں آپ کو ریٹائر ہونا پڑا۔ اس وقت آپ کیپٹن تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں آپ کو دوبارہ بلایا گیا اور ترقی دے کر میجر بنا دیا گیا۔ لیکن آپ نے انگریزی فوج میں لڑنے سے انکار کر دیا اور جنگ پر جانے کی بجائے جے پور چلے گئے۔ جہاں آپ کو جنرل مارڈن کے حکم سے گرفتار کر کے بہاولپور لا کر صادق گڑھ پیلس اور پھر سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ جہاں سے ۸ مئی ۱۹۴۸ء کو رہائی ملی۔ لیکن کہیں آنے جانے کی پابندی تھی۔ یعنی آپ اشرف آباد ضلع رحیم یار خان میں اپنی اراضی پر ایک سال تک کے لیے مقیم رہنے کے پابند تھے۔

۱۹۶۴ء میں آپ نے اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور رحیم یار خان میں اپنے مکان کے برابر ہی دفن کئے گئے۔ آپ اردو میں بڑے پیارے شعر کہتے تھے۔ رزمی اور مخفی دونوں تخلص کرتے تھے۔ آپ کو نظم اور غزل دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں آپ ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔ ۰۰۰

غزلیں

نا آشنائے رازِ خفی و جلی رہی
شرمندۂ معانی مری زندگی رہی

تیرا مقام دونوں جہاں میں کہیں نہ تھا
پھر یہ نگاہ تجھ کو کہاں ڈھونڈتی رہی

یہ فیض پایا آپ کی نیچی نگاہ سے
لیجے خودی رہی نہ مری بے خودی رہی

ہر سجدۂ نیاز کو ٹھکرایا آپ نے
تقصیر ہی نصیبِ غمِ زندگی رہی

میرا نشان حرفِ غلط سا مٹا دیا
پھر بھی تری نگاہ غلط انداز ہی رہی

رزمیؔ خدا کے خوف سے کس کو ڈرائیے
وہ بت جنہیں خدا سے سدا ہمسری رہی

تمہارے عشق میں طاری جو بے خودی ہوتی
وہ بے خودی نہیں ہوتی وہ آگہی ہوتی

کسی کے وعدے پہ گر اعتبار کر لیتے
تو انتظار ہی رہتا ستم کشی ہوتی

سوالِ وصل پہ وہ سٹ پٹا سے جاتے ہیں
نہیں تو بات کہیں کی کہیں گئی ہوتی

ہزار سجدے کئے تو بھی کیا ملا زاہد
رضا پہ جھکتے اگر دل میں روشنی ہوتی

پلائی تھی جو مئے معرفت مجھے ساقی
تو اک نگہ تری کافی تھی ڈال دی ہوتی

خدا کی شان ہے وہ کہہ رہے ہیں مخفیؔ سے
کبھی تو تم نے بھی ایمان کی کہی ہوتی

میجر چراغ حسن حسرت (حسرت کاشمیری)

چراغ حسن نام، حسرت تخلص اور وطن کشمیر جس نسبت سے کاشمیری کہلوائے ۱۹۰۴ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام شیخ بدرالدین تھا۔ بچپن نانے کی گود میں گزرا جو ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ اور حسن تخلص کرتے تھے۔ حسرت نے فارسی تعلیم گھر میں حاصل کی میٹرک پونچھ سے کیا اور پھر مزید تعلیم کے لئے لاہور آ گئے۔ یہاں آکر آپ پڑھے بھی اور گڑھے بھی۔ فارغ التحصیل ہو کر شملہ کے ایک سکول میں مدرس ہو گئے۔ وہاں سے کلکتہ کا رخ کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خان جب کلکتہ گئے تو انہیں بھی اپنے ساتھ لاہور لے آئے اور یوں آپ "زمیندار" کی ادارت سے منسلک ہو گئے بعد ازاں "احسان"، "انصاف"، "احرار اور شہباز" میں کام کیا۔ ایک ہفت روزہ "شیرازہ" کے نام سے خود بھی جاری کیا۔ لیکن اس کا شیرازہ بکھرنے پر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں فوج میں کمشن مل گیا اور فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے چونکہ فارسی، اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر دسترس تھی اس لئے بڑے کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں کئی ایک شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا اور خوب تجربہ حاصل کیا فوج میں میجر تھے کہ مستعفی ہو گئے اور پھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ چل نکلا۔ ساتھ ہی روزنامہ امروز کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو کراچی جا کر ریڈیو پاکستان میں قومی پروگرام کرنے لگے لیکن علالت کے باعث لاہور آ گئے اور یہیں ۱۹۵۵ء میں انتقال فرمایا۔

آپ ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نگار اور طنز نگار بھی تھے۔ آپ کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور سیاست کے نشیب و فراز سے بھی خوب واقف تھے۔ آپ کو علم موسیقی سے بھی کافی آگاہی تھی۔

نصراللہ خان (صحافی) لکھتے ہیں کہ "ان سے بڑا مزاحیہ کالم نویس اور طنز نگار آج تک پیدا نہیں ہوا۔ شاعری ہو یا تاریخ یا علم و ادب کا کوئی مسئلہ ہو کسی کتاب یا مصنف کی کوئی بات ہو یہ بزرگ پاتال کی خبر اور بال کی کھال تک نکال لاتے"۔

جناب حسرت کاشمیری صحیح زبان لکھنے پر قدرت رکھتے تھے اور ٹیکسالی زبان استعمال کرتے تھے۔ آپ کی شاعری میں سادگی اور سلاست نے ایک عجیب سی چمک پیدا کر دی ہے جس سے قاری بڑی آسانی سے مطالب و مفاہیم پا لیتا ہے ○○○

غزل

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ ہوتے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

ماہیئے

باغوں میں پڑے جھولے
تم ہم کو بھول گئے ہم تم کو نہیں بھولے

ساون کا مہینہ ہے
ساجن سے جدا رہ کر جینا کوئی جینا ہے

یہ رقص ستاروں کا
افسانہ کبھی سن لو تقدیر کے ماروں کا

دل میں ہیں تمنائیں
ڈر ہے کہ کہیں ہم تم بدنام نہ ہو جائیں

اب اور نہ تڑپاؤ
یا ہم کو بلا بھیجو یا آپ چلے آؤ

آخر یہی ہونا تھا
تم کو یونہی ہنسنا تھا ہم کو یونہی رونا تھا

میجر صلاح الدین گوہر حزیں

۱۹۴۳ء کی ایک صبح ڈیوٹی کے دوران ایک مسلمان سپاہی قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہا تھا کرنل وہاں سے گزرا۔ سمجھا شاید ناول پڑھ رہا ہے کتاب چھین کر پھینک دی معاملہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کا تھا بڑھ گیا دیولالی نارتھ نمبر ا ٹرانسپورٹیشن سنٹر میں ایک ہی مسلمان آفیسر تھا اسے لایا گیا وہ افسر علاقے کے جیّد عالم مولانا عبدالقادر کے پاس گیا یوں مسلمانوں کے ایک بپھرے ہوئے جلوس کو کنٹرول کیا گیا۔ یہ مسلمان افسر سنٹر کے ایڈجوٹینٹ جناب صلاح الدین تھے۔

شہزادہ صلاح الدین گوہر حزیں ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم شہزادہ عالی گوہر سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ حزیں آٹھ برس کی عمر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تیسری جماعت میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری لے کر فارغ ہوئے۔ آپ ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے لیکن اس ملازمت سے جلد ہی جی اکتا گیا اور ۱۹۴۱ء میں فوج میں آگئے۔ ۶ ماہ کی تربیت کے بعد ۱۹۴۲ء میں آپ کو کمشن مل گیا۔ ۱۲ برس تک اس ملازمت میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد ۱۹۵۳ء میں ریٹائرمنٹ لے لی اور پی آئی ڈی سی میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں جب اس ملازمت کو چھوڑا تو جنرل ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک سال بعد ہفت روزہ "پاک جمہوریت" میں منیجر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں پھر فوجی وردی زیب تن کی اور دشمن کے سامنے آگئے۔ اب آپ کو پائینر فورس کی ایک بٹالین کی کمان دی گئی۔

میجر صلاح الدین گوہر حزیں کے والد شہزادہ عالی گوہر فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے اور آپ کے دادا شہزادہ والا گوہر بھی فارسی کے مستند اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ گھر کے اس شاعرانہ ماحول اور علیگڑھ کی ادبی فضا نے اپنا رنگ دکھایا اور گوہر حزیں میں ایک شاعر پروان چڑھنے لگا یوں شاہ شجاع کے بھائی شہزادہ محمد حسین کی نسل کا یہ شہزادہ پندرہ برس کی عمر میں نویں جماعت سے ہی شعر موزوں کرنے لگا۔

آپ کی شاعری میں وراثتی اثرات پائے جاتے ہیں گو آپ کا انتخاب اردو زبان تھی لیکن فارسی کی وراثت کو آپ نے ضائع نہیں ہونے دیا اور فارسی تراکیب و استعارات استعمال کئے ہیں

غزلیات

یہ گیت ہے بہار کا یا کہکشاں کا رقص
افسوں ہے سحر ہے ترے سروِ رواں کا رقص

ساز و سرود و رقص ہم آہنگ کیوں نہ ہوں
ہوتا ہے تارِ جاں پہ دلِ ناتواں کا رقص

یوں کھیلتا ہے درد دلِ لخت لخت سے
جیسے ہو لالہ زار سے برقِ تپاں کا رقص

آتی ہے جب بہار تو ہوتا ہے دیدنی
کنجِ قفس میں طائرِ آزردہ جاں کا رقص

طوفانِ تند و تیز میں موجوں کے دوش پر
دیکھا ہے ہم نے کشتیِ بے بادباں کا رقص

تنکے اُسی کے ڈھونڈ رہا ہوں، کل آپ نے
دیکھا تھا دوشِ باد پہ جس آشیاں کا رقص

ہے میکدے میں جشنِ بہاراں کا اہتمام
ساغر میں ہو رہا ہے مئے ارغواں کا رقص

اب مجھ کو اندمال کی حسرت نہیں رہی
ہے میرے زخم زخم میں نوکِ سناں کا رقص

ساغر میں عکسِ سبحہ و دستار دیکھئے
پھر اس کے بعد دیکھئے پیرِ مغاں کا رقص

رہتی ہے وہ قریبِ نشیمن جہاں بھی ہو
ہے دیدنی بہار میں برقِ تپاں کا رقص

زاہد بھی جائے کیوں نہ وہاں سر کے بل حزیںؔ
ہے میکدے میں حوریٔ باغ جناں کا رقص

مزرعۂ غم کی تازگی ہے میرے اختیار میں
خونِ رگِ بہار ہے دیدۂ اشکبار میں

رشکِ بہار کیوں نہ ہو دامنِ خونچکاں مرا
حسنِ بہارِ خلد ہے دامنِ لالہ زار میں

ہے دلِ لخت لخت میں لالہ و گل کی تازگی
عکسِ بہار ہی تو ہے سینۂ داغدار میں

دامنِ دل ہے گلفشاں عکسِ رخِ حبیب سے
ہے وہ بہارِ زندگی ساتھ مرے بہار میں

دولتِ دو جہاں ملی، مل گیا جس کو غم ترا
لطفِ سرورِ سرمدی ہے غمِ کیف بار میں

بادہ غمِ فراق ہے وصلِ شرابِ ناب ہے
وصل میں اک نشاط ہے کیف ہے انتظار میں

شکوہ ہجر وہ کرے پاسِ وفا نہ ہو جسے
یہ شبِ ہجر ہی نہیں گزرے جو یادِ یار میں

بخیہ گری نثار کی بے خبری پہ اے حزیںؔ
دولتِ صبر مل گئی دامنِ تار تار میں

میجر سید ضمیر جعفری (تمغۂ قائداعظم)

ادب کے اس فیلڈ مارشل کے بارے میں کیا کہوں جس نے نثر و نظم کے کئی قلعے فتح کئے وطن سے محبت کا یہ عالم کہ بھارت سے بین الاقوامی ادبی ایوارڈ لینا صرف اس لئے پسند نہ کیا کہ وہ ہمارا دشمن ہے . . . لیکن مجھے بھی آخر اپنا فرض تو ادا کرنا ہے۔ کچھ تو کہنا ہے خواہ آپ کے حالات زندگی ہی۔

سید ضمیر جعفری کی تاریخ پیدائش ان کی اپنی سمجھ سے بالا ہے۔ لکھتے ہیں "پیدائش کی تین تاریخیں سننے میں آئی ہیں دو تاریخیں ۱۹۱۵ء میں اور ایک ۱۹۱۶ء میں مہینہ کسی کو یاد نہیں رہا۔ آخر یکم جنوری ۱۹۱۷ء کو اختیار کر لیا گیا۔ ویسے مدرسے کے ریکارڈ کے مطابق میرے بڑے بھائی ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے"۔ آپ کا مقام پیدائش چک عبدالخالق ضلع جہلم ہے۔ لوئر مڈل گاؤں سے میٹرک جہلم، انٹرمیڈیٹ اور بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا۔

جناب جعفری صاحب نے عمر بھر ملازمت کی مگر جم کر نہیں۔ ابتداء ضلع کلرکی سے ہوئی۔ پھر حکومت ہند میں ذرا اونچے درجے کی کلرکی کی۔ جنگِ عظیم دوم چھڑی تو فوج میں چلے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور راولپنڈی سے ایک روزنامہ "بادِ شمال" جاری کیا جسے کچھ عرصہ بعد بند کرنا پڑا۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ایسے بیٹھے کہ پھر سیاست کا نام نہ لیا اور دوبارہ فوج میں چلے گئے۔ واپس لوٹے تو سی ڈی اے (اسلام آباد) میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ تعینات ہوئے۔ وہاں سے فراغت پا کر تھوڑے عرصے کے لئے آرام فرمایا اور پھر پاکستان نیشنل سنٹر کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل بنا دیئے گئے۔ اس کے بعد افغان مہاجرین کے محکمے میں مشیر رہے۔ اکادمی ادبیات سے رابطہ ہے۔ ماہنامہ "چہار سو" نکال رہے ہیں صحافت آپ کی گھٹی میں پڑی ہے۔ تصنیف و تالیف آپ کا شغل ہے۔ درجنوں کتب لکھ چکے ہیں جن میں "ارمغانِ ضمیر۔ لہو ترنگ۔ زبورِ وطن۔ من میلہ۔ من کے تار۔ جزیروں کے گیت۔ کھلیان۔ گنر شیر خان۔ مافی الضمیر۔ ضمیریات۔ ضمیر ظرافت۔ متاعِ ضمیر۔ کارزار۔ میرے پیار کی زمین۔ ولائتی زعفران۔ جنگ کے رنگ۔ اُڑتے خاکے۔ ملایا اور ملایا کے لوگ۔ آنریری خسر۔ کتابی چہرے۔ خدوخال۔ مثنوی سقوطِ مشرقی پاکستان۔ سفرنامہ۔ خسر نامہ اور قریۂ جان" شامل ہیں۔

آپ نظم اور نثر دونوں میں لکھتے ہیں۔ سنجیدہ، طنزیہ اور مزاحیہ ہر پہلو پر آپ کو مکمل گرفت ہے۔ سید ضمیر حسین شاہ ولد سید حیدر شاہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ صاحب طرز ادیب اور بالغ نظر صحافی ہیں۔ آپ کا انداز نہایت شگفتہ، رنگین اور دل نشین ہے ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

زندگی کی دھوپ میں سب سے گھنا سایہ تو ہی
اس زمیں پر موتیوں والا سخی دریا تو ہی

ذہنِ انسانی میں جو بوئی گئی تاروں کی فصل
اس کا رکھوالا اور اس کے پالنے والا تو ہی

جس کی آہٹ پہ رواں صدیوں کی اجلی ساعتیں
رنگ اور خوشبو کی وہ موجِ سفر پیما تو ہی

وقت کے ماتھے پہ جن کی روشنی لکھی گئی
وہ رخِ زیبا ہے تیرا وہ یدِ بیضا تو ہی

کس نے تھاما رات میں ڈوبے ہوئے سورج کا ہاتھ
روشنی کو صبح کی چوکھٹ پہ لے آیا تو ہی

کون ہے تیرے سوا دکھیا دلوں کا داد رس
خلق کا مولا تو ہی، ملجا تو ہی، ماویٰ تو ہی

اے مسلماں کی متاعِ اولین و آخریں
دیں تو ہی، آئیں تو ہی، دنیا تو ہی، عقبیٰ تو ہی

کشتِ امیدِ بشر کی زرد پیاسی ریت پر
اور بادل بھی تھے لیکن ٹوٹ کر برسا تو ہی

جس پہ ہر سائل کو مل جاتی ہے پھولوں کی چنگیر
اس بڑے داتا کے لنگر کا درِ تنہا تو ہی

غزل

مجسم حسن یکسر روشنی بن جائے گی دنیا
مگر کیا جانئے اس موڑ تک کب آئے گی دنیا

تمنا ترک کر ڈالی توقع چھوڑ دی ہم نے
ہمیں اب اس سے بڑھ کر اور کیا سمجھائے گی دنیا

لشکتی دھوپ میں رستوں کے پتھر توڑنے والو
جہاں تک تم اسے لے آؤ گے، آجائے گی دنیا

ہر اک ساعت سنہرے موتیوں کا تھال رکھتی تھی
بہت غم دیکھنے پر بھی بہت یاد آئے گی دنیا

اصولوں کی چمک، خوابوں کے انجم، ذہن کے موتی
یہ اس کا قرض ہے جب بھی طلب فرمائے گی دنیا

ہمیں معلوم ہے دنیا میں اک دن ہم نہیں ہوں گے
مگر جو ہم پہ گزری ہے اسے دہرائے گی دنیا

میجر محمد عاشق

غالب ایک ایسے شاعر تھے جن کی اپنی خصوصیات الگ، لیکن ان پر لکھنے والوں نے ان کو امر کر دیا۔ اور ان کے کئی روپ عوام کے سامنے پیش کر کے ان کی شخصیت کو ایسا جوہرِ ناقابلِ فراموش بنا دیا جو قرنوں تک لوگوں کے ذہنوں میں بسا رہے گا۔ غالب کو ہر دور میں جہاں ان کی اصلی شخصیت کے حوالے سے پیش کیا گیا وہاں فرضی کردار بھی کافی مشہور ہوئے کبھی "غالب بند روڈ پر" کبھی "غالب بھائی پھیر دیں" جیسے کئی نئے رنگ سامنے آئے جنہوں نے لوگوں کو تفریح بھی دی اور غالب کی یاد بھی۔ اسی طرح ایک مزاحیہ تصنیف ۱۹۴۹ء میں ادبی حلقوں میں پہنچی تھی جس کا نام تھا "غالب پی ٹی کورس پر" صاف ظاہر ہے کہ ایسی تصنیف کسی فوجی مصنف کی ہی ہو سکتی تھی اور یہ تھے میجر محمد عاشق۔

جناب محمد عاشق کی پیدائش ۱۹۱۶ء کی اس تاریخ کو ہوئی جو ۱۹۸۸ء میں ہمارے لئے ایک قیامت بن کر آئی ملک کے صدر اور چیف آف دی آرمی سٹاف کے ہمراہ پاکستان آرمی کے بہترین آفیسرز یا دوسرے لفظوں میں کریم (Cream) کو اپنے دامن میں چھپا کر چلتا بنا۔ میرے خیال میں ۱۷ اگست کا یہ دن پاکستان کے کسی فرد کو نہیں بھول سکتا۔

آپ کی جنم بھومی لاہور ہے وہیں سنٹرل ماڈل ہائی سکول سے ۱۹۳۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر اسلامیہ کالج اور دیال سنگھ کالج سے فیض پایا اور فوج میں آ گئے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک آپ وائسرائے کمشنڈ افسر رہے۔ ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو آپ نے کمشن حاصل کیا اور ۱۳ سال خدمات ادا کر کے ۱۹۵۸ء میں ریزرو چلے گئے لیکن ۱۹۶۵ء میں آپ کو دوبارہ عسکری خدمات کے لئے بلایا گیا یوں آپ مشکل وقت میں وطن کی پکار پر لبیک کہتے رہے۔ ۱۹۷۱ء کا جانسوز مرحلہ بھی برداشت کیا۔

میجر محمد عاشق ابتداء سے ہی ادبی ذوق رکھتے تھے فوج میں آ کر یہ ذوق پختہ ہو گیا اور قلم میں روانی آ گئی۔ آپ نظم اور نثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ نظم میں زیادہ تر غزل اور نعت لکھی اور نثر میں تحقیق اور طنز و مزاح آپ کا میدان رہا "غالب پی ٹی کورس پر" کے بعد ۱۹۶۷ء میں آپ کی غزلوں کا مجموعہ "جنونِ زار" منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد "لذت آزار" چھپا آپ فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے ○○○

مجاہد کی واپسی

(یہ نظم ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد قید سے رہا ہو کر آنے والے ساتھیوں کے لیے کہی گئی)

شکرِ خدا گزر گئے لمحاتِ انتظار
جاں کو ملا سکون تو دل کو ملا قرار

عرصہ ہوا جو ساتھی جدا تھے وہ آگئے
مدت کے بعد بچھڑے ہوئے دوست ہمکنار

انفاسِ مشکبو سے ہوائیں ہیں عطر بیز
اندازِ گفتگو سے فضائیں ہیں نغمہ بار

ماحول میں جو پہلی گھٹن تھی نہیں رہی
اعصاب میں نہیں رہا احساس کا فشار

ہے غازیانِ دیں کی شجاعت کو دیکھ کر
کلیوں پہ جو نکھار ہے غنچوں پہ جو بہار

پائے ثباتِ عزمِ مجاہد سے ہر جگہ
ارضِ وطن میں وحدتِ ملت ہے استوار

ہے سجدہ گاہِ اہلِ وفا نقشِ پا ترا
ہے کحلِ چشمِ اہلِ نظر خاکِ رہگزار

صد وجہِ ناز تیری روش مشکلات میں
کردار حادثات میں صد وجہِ افتخار

منزل کی جستجو میں نمایاں ہیں سنگ راہ
پھولوں کی آرزو میں فراواں ہے نوکِ خار

غازی کی سخت کوشی سے آرائشِ چمن
دشت و دمن شہید کی جرأت سے لالہ زار

سینہ سپر ہمیشہ صدائے جہاد پر
اسلام کے فدائی محمدؐ کے جاں نثار

فرزند و جان و مال کی پرواہ کئے بغیر
شعلوں میں کودے خوں میں نہائے ہزار بار

اجداد کا طریق بھلایا نہ جائے گا
ہوتا ہے امتحان محبت میں بار بار

میجر محمد اقبال رشدی

محمد اقبال رشدی کوٹلی آزاد کشمیر میں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے ۔ بہت چھوٹی عمر میں میٹرک کر لیا اور محکمہ امدادِ باہمی میں ملازم ہو گئے آپ کے والد منشی فضل الٰہی کوٹلی میں سرگرم سیاسی کارکن تھے ۔ جو تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی بنا پر دو سال تک ریاست بدر بھی رہے ۔

میجر محمد اقبال رشدی دسمبر ۱۹۴۱ء میں برٹش انڈین آرمی کی آٹھویں پنجاب رجمنٹ میں سپاہی کلرک بھرتی ہوئے ۔ اور جلد ہی حوالدار کے عہدے پر پہنچ گئے ۔ دوسری جنگِ عظیم ان دنوں زوروں پر تھی۔ آپ برما کے محاذ پر متعین تھے ۔ جہاں آپ رنگون، میگاؤں اور ہنوئی تک فوجی خدمات کے سلسلے میں گھومے پھرے ۔

۱۹۴۵ء میں مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں لیبیا، سوڈان مصر اور حیفا وغیرہ میں رہے ۔ ۱۹۴۷ء میں آپ نے برصغیر کی تقسیم کے ساتھ جب دیکھا کہ کشمیر ابھی تک غاصبوں کے قبضے میں ہے تو آزاد کشمیر میں آکر جنگِ آزادیٔ کشمیر کے مجاہدین میں شامل ہو گئے ۔ اور آزاد کشمیر رجمنٹ میں اپنی خدمات سپرد کیں ۔ جہاں ترقی کرتے کرتے میجر کے عہدے پر پہنچے ۔ ۱۹۶۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کی خدمات دوبارہ حاصل کی گئیں۔ ○○○

نمونۂ کلام

ہماری قوم کے بیٹوں نے نقدِ جاں دے کر
دیارِ پاک کی دنیا میں آبرو رکھ لی
یہ کس کا فیضِ کرم تھا کہ ہند والوں پر
مجاہدوں کی شجاعت کی دھاک بیٹھ گئی
فروزاں اس طرح کی عظمتِ ماضی کی چنگاری
عطا کر دی ہمیں خود اعتمادی اور خود داری

عیشِ دوام کس کو ہے عمرِ دراز میں
حسرت بھری ہوئی ہے دلِ بے قرار میں
تو نے وفائے عہد کا اچھا صلہ دیا
عمرِ عزیز بیت گئی انتظار میں
ابرِ بہار اٹھا ہے جس طمطراق سے
ڈر ہے بدل نہ دے میری نیت بہار میں

میجر اسحاق محمد۔ ملٹری کراس

میجر اسحاق محمد جالندھر کے ایک غریب جٹ گل، کسان کے چشم و چراغ تھے۔ بڑی مشکل لیکن اپنی ذہانت سے ایم اے او کالج امرتسر سے بی اے کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم میں برٹش آرمی میں کمیشن لیا۔ آپ کی محنت جرأت اور ذہانت تھی کہ آپ کو ملٹری کراس کے اعزاز سے نوازا گیا اور آپ ایسٹرن کمانڈ کے انچارج جنرل آکن لنک کے ایڈی کانگ مقرر ہوئے۔

میجر اسحاق محمد نے ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر میں پانڈو کی دشوار گزار پہاڑی اور دفاعی مورچہ بندی پر قبضہ کر کے بھارتی فوجوں کو شکست سے ہمکنار کر کے ایک بار پھر اپنی بہادری کا لوہا اپنے وطن کے لئے منوایا۔

۱۹۵۱ء میں آپ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں رہا ہونے کے بعد بھی ہر عہد میں ایوب خان، بھٹو، یحییٰ خان، ضیاء الحق جیسے حکمرانوں نے آپ کو جیلوں میں باقاعدگی کے ساتھ بند رکھا۔ آپ پاکستان کسان مزدور پارٹی کا قیمتی ورثہ تھے۔ آپ کی ذاتی زندگی معمولی کاشتکار کی زندگی تھی۔ جو انسانیت کے تمام معاشروں میں جبر و استحصال اور ناہمواریوں کے بوجھ تلے سسکنے والے مجبور طبقوں کا غم سینے میں سمائے ان کے مسائل و مصائب کے حل کے لئے تمام عمر جدوجہد میں مصروف رہے۔ ۱۹۸۲ء میں آپ بہاولپور جیل میں بند تھے ناقص خوراک کے نتیجہ میں آپ پر فالج کا مہلک حملہ ہوا جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے اور ۲ اپریل ۱۹۸۳ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ○○○

غزل

حاکمِ شہر ہوا دشمنِ جاں جس دن سے — وحشتِ دل سرِ بازار لئے پھرتی ہے
زاہدِ خشک کو صہبائے وطن کی برکت — طرفہ وحشت ہے سرِ دار لئے پھرتی ہے
جب سے در بند ہوا ہم پہ ترا، یہ قسمت — دربدر بے طرح بیکار لئے پھرتی ہے
رنجِ بے بہری میں جاں کھوئے زمانہ گزرا — اب صبا مژدۂ دلدار لئے پھرتی ہے

جان ہم کس لئے بیگانہ بنے بیٹھے ہیں
بوئے گل خارِ رہِ یار لئے پھرتی ہے

میجر فضل حسین

جناب فضل حسین ولد وزیر خان کا تعلق بزرگوں کی اس نسل سے ہے۔ جو پیدا ہوتے تھے تو ان کے برتھ سرٹیفکیٹ نہیں پوچھے جاتے تھے بلکہ کسی نہ کسی تاریخی حوالے کی نسبت سے عمر کا حساب بتایا جاتا تھا لیکن جب سکول کی چار دیواری میں آتے تو ایک فرضی تاریخ پیدائش لکھ دی جاتی۔ لیکن حقائق کا سامنا کرنے والے افراد مدتوں بعد جب کسی کو عمر بتاتے تو یہی کہتے کہ "جب پہلی لام چھڑی تو اس وقت یہی کوئی آٹھ، دس سال کا تھا"

میجر فضل حسین فضل بھی بڑی "لام" سے چند سال پہلے پنڈ جھاٹلہ (راولپنڈی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بقول حاجی حافظ محمد عبدالکریم ایک خاموش فقیر تھے۔ یوں اس فقیر منش شخصیت نے ایک خاموش فقیر کے زیر سایہ پرورش پائی۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو آپ فوج میں آ گئے اور پھر ایک عرصہ تک ملک و قوم کی خدمت کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں بحیثیت میجر فوج سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کو دوبارہ بلایا گیا۔

جناب فضل حسین کو شعر و ادب سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ لیکن اس کو جلا اس وقت ملی جبکہ آپ فوجی ملازمت کے دوران کوئٹہ میں مقیم تھے۔ وہاں آپ کی ملاقات محشر رسول نگری سے ہوئی۔ جن سے کافی کسبِ فیض حاصل کیا۔ فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ کا رابطہ مشاعروں اور ادبی انجمنوں سے باقاعدہ رہا۔ آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ "افکارِ فضل حصہ اول" اور دوسرا مجموعہ "افکارِ فضل حصہ دوم" ہے۔ آپ ۲۰ جون ۱۹۷۹ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

بقول سرور انبالوی "آپ کی شاعری آپ کے صفائے قلب کی آئینہ دار ہے۔ غزل میں وہی سادگی، شیرینی اور رکھ رکھاؤ ہے جو آپ کی طبیعت کا خاصا ہے۔ آپ کے ہاں تجربہ کی گہرائی، زبان کی شگفتگی اور خیالات کی بلندی یہ سب چیزیں مل کر شعر کو ایک خاص تاثر دیتے ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی ان کے شعروں کی خوبی اور یہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔" ○○○

فخرِ کونینؐ کے حضور

وحدت کا جام ساقیؐ کوثر پلائیے
سرشار حشر تک مجھے آقاؐ بنائیے

عاشق ہے آپؐ کا ابھی تقدیر کا اسیر
اس خستہ حال کو بھی مدینے بلائیے

گر خادموں میں آپؐ کے میرا نہیں شمار
ان خادموں کا ہی مجھے خادم بنائیے

اب بڑھ رہی ہیں کفر کی تاریکیاں یہاں
ان میں خدا کے نور کی شمعیں جلائیے

ملت میں انتشار ہے اور فرقہ بندیاں
پھر اس کو لِلّٰہ جامِ اخوت پلائیے

سوشل اِزم کی آگ ہے تیزی سے بڑھ رہی
خیر البشرؐ اس آگ سے سب کو بچائیے

اب اہلِ شر بنے ہیں مساوات کے امیں
یو. ش سے ان کی فخرِ دو عالم بچائیے

اٹھے لحد سے فضل جو محشر میں تشنہ لب
اس کو بھی آپؐ ساغرِ کوثر پلائیے

غزل

محبت ہی بنائے کُن فکاں معلوم ہوتی ہے
یہی الفت ربوبیت کی جاں معلوم ہوتی ہے

مروت اور حلیمی ہے طریقِ کارِ مے خانہ
اسی سے عظمتِ پیرِ مغاں معلوم ہوتی ہے

جنہیں جذب و جنوں سے کچھ خبر اپنی نہیں ہوتی
انہیں تقدیر کی سرِ نہاں معلوم ہوتی ہے

نکونامی نہیں ہے زیست کا حاصل نکوکاری
یہی مجھ کو متاعِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

جو تھے صحرا نشیں ان کو بنایا فاتحِ عالم
یہ جیت اس شاہ کی شایانِ شاں معلوم ہوتی ہے

ابھی نغمے گلستاں میں جو بلبل کے بھی سنتے ہیں
صدائے الحفیظ و الاماں معلوم ہوتی ہے

جڑا ہو فضل تار اس منبعِ انوار سے جس کا
جھلک یہ اس کے چہرے سے عیاں معلوم ہوتی ہے

★

میجر منظور احمد

مشاہدے اور داخلی واردات میں کشمکش کا پیدا ہونا اور رد و کد کا سلسلہ ایک اچھے ادب کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ یہ کھینچا تانی اسے بے راہروی سے مقصدیت کی جانب لے جا کر زندگی کے خول میں داخل کر دیتی ہے۔ جہاں یہ زیست کا ایک عنصر دکھائی دیتا ہے۔ اور یہیں سے ادب برائے زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور آجکل جتنا بھی ادب جس حوالے سے اور جس صنف میں تخلیق ہو رہا ہے۔ اسے ادب برائے زندگی میں شمار کر سکتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب کسی بھی صورت میں آج کے حالات سے کٹ کر نہیں رہ رہا۔

میجر منظور احمد اسی معاشرے کے فرد اور اسی ماحول کے پروردہ ہیں۔ آپ کی زندگی گرد و پیش کی آلودگیوں، آلائشوں، الجھنوں اور پیچیدگیوں سے کسی طرح محفوظ نہیں۔ آپ کا عالم شعور میں آنے کے بعد بڑے عجیب حالات سے واسطہ رہا۔ زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا۔ دوستیوں اور دشمنیوں کو پرکھا اور برتا۔ فریب اور ریاکاری کو جانچا۔ جہاں محبتوں کی خوشبوؤں سے مہکے وہیں نفرتوں کے الاؤ سے بھی گزرے۔ پاکستان جب معرض وجود میں آیا۔ تو اس وقت کے حالات آپ کے ذہن پر نقش ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں دشمن کی مکاری اور اپنوں کی جرأتوں سے واسطہ پڑا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دشمن کی ریاکاریوں، اپنوں کی اضداد اور نام نہاد دوستوں کے تعلق کو اندر رہ کر دیکھا اور ساری شکست و ریخت کے نقوش آپ کے دل و دماغ پر گہرے ثبت ہوئے۔ انہی مشاہدات و تجربات کو آپ نے اپنی شاعری کا حصہ بنا کر زندگی اور شاعری کو ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے۔ اور انہی مختلف کیفیتوں کا امتزاج آپ کی نظموں سے جھلکتا ہے۔ جبکہ غزل میں آپ روایات کے پابند دکھائی دیتے ہیں۔ کرنل افضل کیانی آپ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ ظاہر میں کچھ ہیں اور باطن میں کچھ۔ گو ہمیں تو وہ سفید ریش ہی نظر آتے ہیں۔ مگر ان کے اشعار میں اتنی جوانی ٹپکتی ہے جتنا ظاہراً بڑھاپا۔"

جناب منظور احمد اپنے بارے رقمطراز ہیں۔ "بچپن میں کھائی ہوئی چوٹیں اب بڑھاپے میں پھر ابھر آئی ہیں۔"

جب ہم آپ کی پوری شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو آپ کی غزل اور نظم دو علیحدہ اوصاف سے مزین نظر آتی ہے۔ ○○○

غزلیات

کشتی جو پار جاکے کنارے پہ جل گئی
تکیہ تھا جن پہ ان کی نظر بھی بدل گئی

کل شب گئے تھے حلقۂ رِنداں میں شیخ جی
واں مفت میں جناب کی پگڑی اچھل گئی

"اچھا تو اب بھی حسن پرستی شعار ہے"
بولے جب اُن کے سامنے میری غزل گئی

دوشِ ہوا پہ آئی تھی آواز ان کی آج
کیا کیا نہ اس کو سُن کے طبیعت مچل گئی

ان کا ہی تھا پیام وہ آواز ان کی تھی
سن کر قرار آگیا جاں بھی سنبھل گئی

لاکھوں جراحتیں لئے آئی ہے فصلِ گل
زنداں میں بوئے گل مرے دل کو مسل گئی

منظورؔ اپنے ہاتھ ہی پھیلا کے رہ گیا
دامن بچا کے موجِ صبا بھی نکل گئی

جہانِ تیرہ فقط رات کا بسیرا ہے
مری نگاہ میں ہر نور اک سویرا ہے

فریب، مکر، تغافل، فرار، گمراہی
یہ کن بلاؤں نے انسانیت کو گھیرا ہے

قمر نورد، ضیا بار عہد ہے لیکن
حریم روح میں اُف کس قدر اندھیرا ہے

تلاش تم کو کیا عمر بھر نہ مل پائے
قصور اس میں تمہارا کہاں ہے؟ میرا ہے

ذرا سنبھل کے چلو حسن کے شہنشاہو
قدم قدم پہ یہاں حاسدوں کا ڈیرا ہے

میجر لطیف ملک

زندگی اور دنیا۔۔۔ دنیا اور زندگی ایک ہی تو چیز ہیں۔ اس کے کئی رنگ اور کئی روپ ہیں اور انسان سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ اسے کس رنگ سے دیکھا جائے؟ اس کے کس پہلو پر غور کیا جائے؟ اس کے کس بہروپ کو اصلی مانا جائے؟ اس Paradox سے ہر شخص حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لگتا ہے ہر جزو دوسرے جزو پر برتری کی کوشش میں ہے۔

زندگی کی انہی کیفیات کو جناب لطیف ملک نے شاعری میں ڈھالا ہے۔ یوں تو آپ کی پوری شاعری زندگی کے گرد ہی گھومتی ہے۔ لیکن درج ذیل نظمیں آپ نے زندگی کو بڑا قریب سے دکھایا ہے۔

میجر لطیف ملک ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ اس عالم فانی میں آئے۔ دنیا کے دیکھنے اور پرکھنے میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اور فوج میں آ گئے۔ کچھ عرصہ سپاہی رہے اور پھر کمشن کے لیے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں سیکنڈ لیفٹننٹ کمشن پایا۔ ۱۹۶۶ء تک عسکریت کو اوڑھے رہے اور پھر ریٹائرمنٹ لے لی۔ OOO

زندگی

(۱)

یہ زندگی\
یہ زندگی\
اتنا سہانا نام ہے؟\
کتنا حسین انجام ہے؟\
کیا خوب ہے کیا زشت ہے\
کتنی حسین کتنی اداس

(۲)

زندگی\
اے زندگی\
دائم بھی ہے قائم بھی ہے\
روحِ ازل جانِ ابد\
از ایں جہاں تا آں جہاں

اک سلسلۂ بے کراں
جس کی نہیں ہے کوئی حد
کہتے تو ہیں پائندہ ہے
تو شوکتِ سنجر بھی ہے
اور قہرِ تاتاری بھی ہے
مثلِ نجوم و مہر و ماہ

مانندِ اوجِ کہکشاں

تو ہر گھڑی تابندہ ہے

(۳)

زندگی اے زندگی
یہ دوش و فرداء روز و شب
تیرے اسیرانِ غضب
از ابتدار تاانتہا
از فرش و کرسی تا زمیں
ہے جو بھی ان کے درمیاں
یہ مرغ و ماہی [illegible] شجر
کیا یہ بشر [illegible]
تیرے ہی سب دریوزہ گر

(۴)

زندگی
اے زندگی

تو ایک شمشیرِ دو دم
تو برق و رعد و ابر و بار
تو باغ و دہر و دشت و در
تو آرزوئے شاہ بھی
تیرا جہاں آئے قدم
جھک جائیں مہر و ماہ بھی

(۵)

زندگی اے زندگی
حق بات چھپ سکتی نہیں
یہ اپنی اپنی سوچ ہے
اور فکر کا انداز ہے
تیرے لئے میں اک طلسم
میرے لئے تُو راز ہے
دائم بھی تُو، قائم بھی تُو
روحِ ازل، جانِ ابد
جس کی نہیں ہے کوئی حد
زندگی
اے زندگی

☆

میجر محمد یونس خان (یونس خلیل)

جناب محمد یونس خان ۲۷ دسمبر ۱۹۲۵ء کو تہکال بالا (پشاور) میں الکوزئی قبیلے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد ایوب خان ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے کیا اور پھر ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو آفیسرز ٹریننگ سکول سے بحیثیت سیکنڈ لیفٹننٹ سگنلز کور میں کمشن پایا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں لاہور اور ۱۹۷۱ء کے سانحہ کے دوران مرحوم مشرقی پاکستان میں تھے۔ جہاں جنگی قیدی ہوئے اور قید کا عرصہ بھارت کے شہر بریلی کے قیدی کیمپ میں گزارا۔ واپس آنے کے بعد تھوڑا عرصہ فوج میں گزار کر ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو ریٹائرمنٹ لے لی۔

فوج سے آنے کے بعد سگنل ٹریننگ سنٹر کوہاٹ میں سویلین اکاؤنٹ آفیسر کی حیثیت سے منسلک ہوگئے لیکن کچھ عرصہ بعد اسے ترک کردیا اور ڈسٹرکٹ آرمڈ سروسز بورڈ پشاور کے سیکرٹری بنا دیئے گئے۔

میجر محمد یونس خلیل ایک عرصے سے ادب سے وابستہ ہیں۔ پشتو شاعری آپ کا میدان ہے۔ لیکن قومی زبان سے بھی مستقل رابطہ ہے۔ آپ مختلف اخبارات ورسائل کے لیے اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ جن میں قاصد، قومی ڈائجسٹ، نن پردن، ابابین، وحدت، خیبر، مشرق پشاور اور نوائے وقت شامل ہیں۔ آپ کے دو شعری مجموعے "لالہ زار" اور "خاکی" (قطراتِ شبنم) چھپ چکے ہیں۔ یونس خلیل چونکہ جدید دور کے شاعر ہیں اس لیے وہ نظم میں اپنے ضمیر کی بات کرتے ہیں۔ ○○○

عظمتوں کی معراج

زنداں کی دیواروں پر کس شفق کی سرخی پھیل گئی
یہ کس کے لہو کا رنگ ہے جس نے ماحول کو لالہ زار بنا دیا
یہ جو خاک میں سرخ لہو کا کفن پہنے ہوئے پڑے ہیں
یہ کس کی مانگ کا سندور ہے
کس کی آنکھ کا نور ہے

یہ بے تاب دلوں کی دھڑکنیں ہیں
یہ جاگتی ہوئی راتوں کی دعائے نیم شبی ہے
ہند کی سرزمین کتنی بے رحم ہے کہ اس کی خونی پیاس بجھی ہی نہیں
مگر خون کے داغ جو سارے کیمپ میں قطرہ قطرہ پھیلے ہوئے ہیں
وفا کے قول کی تحریریں ہیں
میرے مقدر کی تقدیریں ہیں
ظلم کی ظلمتوں میں روشن چراغ ہیں
مجرمانِ وفا پر ستم کے پہرے لگے ہوئے ہیں
اور بے رحموں کی سنگینیں اپنی نوکوں میں بے بسی کو پرو رہی ہیں
مگر وہ شہیدوں کی قربانیوں کا گلا نہیں گھونٹ سکتیں
ابھی سینوں میں زخموں کی لازوال بہاریں پھوٹ رہی ہیں
یہ نوخیز بہاریں وطن کے بے آب و گیاہ بیابانوں میں یوں پھیل جائیں گی
جیسے کسی دلہن کی صندلی ہاتھوں میں مہندی کی شفق سمٹ آئی ہو
بظاہر یہ جیالے ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں
مرے لعل ایک اجنبی سرزمین کی خاک میں کھوئے گئے ہیں
مگر یہ تو ایسا ہی ہے جیسے افق سے وہ نور ابھر رہا ہے
جو آزادی کی بشارت ہے، جو قافلۂ بہار کی نغمہ بار آہٹ ہے
درحقیقت یہ موت وطن کی وہ زندگی ہے
جس میں وقار بڑھتا ہے اور نگاہیں بلند ہوتی ہیں
یہ موت قوموں کے آسمان پر عظمتوں کی معراج ہے

★

نوٹ:۔ یہ نثری نظم بریلی کے قیدی کیمپ میں بھارتی پہریداروں کے ہاتھوں چار جیالوں کی شہادت پر کہی گئی تھی۔

میجر سید ذوالفقار حسین شاہ کاظمی

ناقدینِ غزل نے ایک روایت اپنا رکھی ہے اور جب بھی غزل کی تعریف میں کچھ کہتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ "جی! غزل کا مطلب ہے عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا"۔ حالانکہ آج کے دور میں غزل نے اپنا دامن بہت پھیلا لیا ہے۔ بہرحال ان نقادانِ غزل کی طرح روایتی غزل گو شاعر ابھی تک انہی حسن و جمال کے تذکروں اور عورتوں سے گفتگو کے چکروں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اور غزل کی آزادی کے گرد ایک حصار کھینچا ہوا ہے۔ ان کے کلام میں ابھی تک صنم کی چاہت و وصال، غم و درد، وفا و بے وفائی اور جدائی و فرقت کے قصے ہیں۔

جناب کاظمی ایسے ہی ایک روایتی لہجے کے شاعر ہیں۔ اور وہی پرانی روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں وہی کچھ ملتا ہے جو غزل میں ابتدا سے چلا آرہا ہے۔ ان کی شاعری میں آج بھی غزل کا ابتدائی پرتو دکھائی دیتا ہے۔ وہ آج بھی کہتے ہیں ؎

ہو گا نہ کوئی ایسا بھی ناداں مری طرح
سمجھے ہے ایک بت کو جو یزداں میری طرح
لکھی ہیں کس نے آپ پہ غزلیں تمام عمر
لکھے گا کون پیار کے دیواں میری طرح

میجر سید ذوالفقار حسین شاہ کاظمی نے روایتی غزل کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا ہے۔ اور یہ حصہ آپ کے پرتو کے افق پر صبح کے سورج کے مانند ظہور پذیر ہے۔ اور شاید اس کی وجہ آپ کا میر کے خاندانِ سادات سے ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے آپ نے میر کے انداز میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ ؎

شوقِ وصالِ گُل تو ہمیں لے گیا چمن
حسرت یہ لے کے نکلے مگر گلستان سے ہم
مدت کے بعد کاظمی اک ہمزباں ملا
کچھ بات کہہ سکے نہ مگر ہم زباں سے ہم

مجھے موصول ہونے والی معلومات کے مطابق شاہ صاحب ۵ اپریل ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے اور بیس سال کی عمر میں ۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء کو فوج میں بحیثیت سیکنڈ لیفٹیننٹ کمشن پایا۔ OOO

غزلیات

بعد مدت کے میں پہنچا درِ مے خانۂ گُل
ہاتھ آیا نہ وہاں بھی مجھے پیمانۂ گُل

حادثے ہم پہ بہت عہدِ خزاں میں گزرے
کوئی چاہے تو سنائیں اسے افسانۂ گُل

آہ تقدیر نے ہر سمت بکھیرے کانٹے
کیسے جائے کوئی اب جانبِ کاشانۂ گُل

زندگی ساری گلستاں میں گزاری لیکن
ایک لمحے کو بھی دیکھا نہ کبھی خانۂ گُل

پھر کوئی شور سا گلشن میں بپا ہے شاید
پھر گلستاں میں چلا آیا ہے دیوانۂ گُل

ہر طرف پھیل گئی کنجِ قفس میں خوشبو
لے کے آئی ہے صبا چپکے سے پھر نامۂ گُل

وصلِ محبوب کی خاطر یہ چمن سے نکلا
کوئی دیکھے تو ذرا جرأتِ رندانۂ گُل

کاظمی کون ہے؟ اک روز جو پوچھیں تو کہوں
ایک دیوانہ ہے دیوانہ ہے دیوانۂ گُل

دور پردیس میں الفت کی فضا یاد آئی
تیری ہر بات میں اک رمز و ادا یاد آئی

جگمگاتے ہوئے ان چاند ستاروں کے تلے
مجھ کو اکثر تیرے ماتھے کی ضیاء یاد آئی

صحنِ گلشن میں نئے پھول جو کھلتے دیکھے
تیری خاموش نگاہوں کی حیا یاد آئی

نامہ تاخیر سے موصول ہوا ہے شاید
بعد مدت کے انہیں میری وفا یاد آئی

پیاسے صحراؤں میں تھک کے جو گرا تو مجھ کو
میرے ہمدم تری زلفوں کی گھٹا یاد آئی

ساقیا پھر مجھے اک جامِ محبت بھر دے
آنکھ سے کس کے پلانے کی ادا یاد آئی

مطربا ! چھیڑ وہی سازِ محبت پھر سے
آج پھر کوئی مجھے شعلہ نوا یاد آئی

کاظمیؔ پھر بنو بیمارِ محبت اک بار
آج پھر مجھ کو مسیحا کی ادا یاد آئی

میجر محمد نذیر (م ن منہاس)

کافی عرصے تک یہ نام مختلف رسائل میں پڑھتا رہا۔ تب سوچتا کہ نجانے ن م کس نام کا مخفف ہے۔ کئی نام ذہن میں آئے۔ لیکن جب تلاش کیا تو محمد نذیر درست نکلا۔ جناب محمد نذیر یک مارچ ۱۹۲۶ء کو منہاس فیملی میں پیدا ہوئے۔ ۲۳ سال ۹ ماہ اور ۱۵ دن کی عمر میں آپ نے فوج میں کمیشن لیا اور انجینئرنگ کور میں ایک مدت تک عسکری فرائض انجام دیئے۔ اس دوران کئی مقامات پر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس پیریڈ میں آپ کا شاعرانہ مزاج کمشنڈ افسروں کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نجانے کون سا گیپ تھا جو پُر نہیں ہو پا رہا تھا۔

میجر م۔ن منہاس نے دقیق علوم کا مطالعہ کیا ہے جس سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کے ذہن پر خشکی کا اثر نمایاں ہوتا۔ لیکن آپ نے شاعری جیسے نفیس اظہارِ خیال کو اپنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کے اندر رومانیت کا عنصر تر و تازہ ہے۔ مطالعہ اور شاعرانہ ریاضت نے آپ کے اندر کے فنکار کو بڑا خوبرو بنا دیا ہے۔ آپ کی شاعری میں نرم و نازک جذبے کومل احساسات اور خوشنما لفظ مل کر خوبصورت وصف کی صورت ابھرے ہیں۔ کہیں کہیں استعارات و تشبیہات اور نفسیاتی کیفیات کا اظہار اس میں مزید چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ہاں ! آپ کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے زمانے کے نشیب و فراز، وقت کی بے قاعدگیوں، راہوں کے خطرات اور نظامِ حیات کے زیر و زبر سے آگاہ کیا ہے۔ پھر اچھے اور برے کو پہچاننے کا مشورہ بھی دیا ہے۔

بنیادی طور پر آپ غزل گو شاعر ہیں۔ لیکن آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور بہت اچھی کہی ہیں۔ آپ نئی اور پرانی روایات کے امتزاج سے شعر کہتے ہیں۔ جس میں ایک عجیب قسم کی وارفتگی اور لذت پائی جاتی ہے۔ قدیم لہجے کو آپ استعمال کرتے ہیں۔ مگر جدید شعری حسیت سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ جو آپ کے کلام سے بھی واضح ہوتا ہے۔ ○○○

دوستو آؤ محبت کی دعائیں مانگیں

جانے کس جرم کی سنگینی کی پاداش ہے یہ — اپنا اس شہرِ تعصب کا مکیں ہو جانا
لوگ چہروں پہ لئے داغِ بد اندیشی کے — بستیاں دیکھ کے شرمائے جہاں ویرانا
آتشِ نفرت بے جا میں سلگنے والے — اپنے سائے کو برا کہنے کی حد تک پاگل
زیر دستوں کو تو انساں نہ سمجھنے والے — لیکن آقا کو خدا کہنے کی حد تک پاگل
دوستو ان کو بتاؤ کہ محمدؐ کا خدا — حسنِ کردار سے خوش ہوتا ہے باتوں سے نہیں
سارے انسان برابر ہیں محبت کے لئے — شرف اعمال کی نسبت سے ہے ذاتوں سے نہیں
دوستو آؤ محبت کی دعائیں مانگیں

غزل

مسموم ہے فضائے شہر جاگتے رہو — شب بھر کرو دعائے سحر جاگتے رہو
ہر راستے میں فتنہ گروں کے جلوس ہیں — واماندگانِ راہِ سفر جاگتے رہو
یہ خامشی سکوتِ نزعِ زندگی کا ہے — یہ شب ہے پیشروئے حشر جاگتے رہو
مظلوم بے حسی سے ہے ظالم کا ہم نوا — نظمِ عدل ہے زیر و زبر جاگتے رہو
تم سو گئے تو حشر تک سوتے ہی رہو گے — پہنے رہو لباسِ سحرؔ جاگتے رہو
اتنا تو دشمنوں سے بھی ڈرتے نہ تھے کبھی — اپنوں سے اب ہے جتنا خطر جاگتے رہو
سو لینا جتنا چاہو یہ طوفاں گزر تو جائے — اب بجلیوں کی زد میں ہے گھر جاگتے رہو
اس کائناتِ عرض کا نگراں کوئی تو ہو — دن رات مثلِ شمس و قمر جاگتے رہو
چنگاریوں کو کثرتِ خاشاک کیا دبائے؟ — باطل کدوں میں صفتِ شرر جاگتے رہو
اس ظلمتِ مہیب سے ابھرے گی زندگی — سر پر سجائے تاجِ سحر جاگتے رہو
ابلیس کی تو خیر ہے لیکن یہاں سے دوست — گزرے گا اب جلوسِ بشر جاگتے رہو
کس کا رُکا ہے رہوارِ وقت، دوستو
یہ دور بھی جائے گا گزر جاگتے رہو

میجر غلام صادق خان (صادق نسیم)

سردار غلام صادق خان نے ٹیکسلا کے قریب موضع خرم کے ایک زمیندار گھرانے میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو آنکھ کھولی۔ دادا عربی کے عالم تھے لہٰذا ان سے عربی میں شُد بُد حاصل کی اور والد سے فارسی پڑھی اردو ماحول نے اور انگریزی مجبوریوں نے پڑھا دی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر خاندانی روایت کے مطابق فوج میں شامل ہو گئے۔

آپ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس وطنِ پاک کی آزادی کے لئے عملاً کام کیا اور اس خطے کے حصول کے لئے قائد اعظمؒ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے دوش بدوش چلے۔ آپ نے طالب علمی کے دور میں قائد اعظمؒ سے ملاقات بھی کی اور ان کے استقبال کے لئے میلوں پیدل سفر کیا۔ آپ نے ملازمت کے دوران ادب سے اپنا ناطہ قائم رکھا اور عسکری و ادبی دونوں فرائض ساتھ ساتھ باحسن نبھاتے رہے۔ آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا ہے:

"صادق نسیم غزل کے شاعر ہیں اور انہیں غزل کی روایت کا گہرا شعور ہے وہ اس روایت میں بدلتی زندگی کے نئے طرزِ احساس کو شامل کر کے اردو غزل کی روایت کا حصہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ ان کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں شریک ہیں۔ اردو غزل کی یہی وہ روایت ہے جسے غالب نے دوام بخشا تھا۔ صادق نسیم کے ہاں دل کی بستی پوری گہما گہمی کے ساتھ آباد ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا سے بھی ان کا رشتہ قائم ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں ایک انبساط، ایک سرخوشی اور کیف و نشاط کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم گھن بن کر نہیں چاٹتا بلکہ نشتر بن کر ایک نیا حوصلہ دیتا ہے۔ یہاں غم درد تو ہے لیکن ساتھ ساتھ دوا بھی ہے"۔

میجر صادق نسیم شاعری کے علاوہ کبھی کبھار ذائقہ بدلنے کے لئے نثر بھی لکھ لیتے ہیں۔ لیکن آپ کا اصل میدان شاعری ہے آپ نے غزل کو ایک ایسا رنگ دیا ہے کہ ملکی تاریخ کی بعض ابتلائیں موضوعاتی طور پر اس میں نمایاں نظر آتی ہیں اور اس کی شاہد آپ کی کتاب "ریگِ رواں" ہے ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

باغِ دعا کے سارے شجر بھی اسیؐ کے ہیں ان پر قبولیت کے ثمر بھی اسیؐ کے ہیں
وہؐ رہنما بھی راہ بھی منزل بھی موڑ بھی سارے چراغِ رہگزر بھی اسیؐ کے ہیں
وہؐ ناخدا بھی بحر بھی کشتی بھی موج بھی سارے صدف اسیؐ کے گہر بھی اسیؐ کے ہیں
وہؐ انعکاسِ نور بھی تجسیم نور بھی سب آئینے بھی، آئینہ گر بھی اسیؐ کے ہیں
ساری تجلیات کا مرکز، اسیؐ کی ذات مہتابِ شام و مہرِ سحر بھی اسیؐ کے ہیں
یہ راز مجھ پہ چشمِ فلک نے کیا عیاں جلوے اِدھر بھی اور اُدھر بھی اسیؐ کے ہیں
اُمی لقب بھی سارا زمانہ کہے اسے سب اہلِ علم دستِ نگر بھی اسیؐ کے ہیں
اسؐ کے لئے بچھے ہوئے کانٹوں کو کیا خبر گل بھی اسیؐ کے اور ثمر بھی اسیؐ کے ہیں
ہے فرشِ خاک پر بھی وہیؐ بوریا نشیں اور عرش پر نشانِ سفر بھی اسیؐ کے ہیں
غنچوں کے لب پہ اسمِ گرامی اسیؐ کا ہے سب طائران زمزمہ گر بھی اسیؐ کے ہیں
موجِ ہوائے خلد کی صورت ہے اسؐ کی یاد وا ہو گئے جو دل میں وہ در بھی اسیؐ کے ہیں
وہ مثلِ موجِ خوں مری رگ رگ میں بھی رواں مژگاں پہ تابدار گہر بھی اسیؐ کے ہیں

جبریلؑ کو بھی انؐ کی غلامی پہ ناز ہے
صادقؔ سے کتنے خاک بسر بھی اسیؐ کے ہیں

غزل

سلاسل و رسن و دار آزما کے چلا گلی گلی میں صلیبیں سجا سجا کے چلا
وہ جس کے جشنِ چراغاں کی دھوم ہے اب تک چلا تو کتنے گھروں کے دیئے بجھا کے چلا
جو اپنے آپ کو کہتا تھا نور کا مینار وہ شہر شہر میں ظلمت کدے بسا کے چلا
کہاں نوشتۂ دیوار دیکھتا تھا مگر نظر اٹھا کے رہا اور نظر جھکا کے چلا
وہ جس درخت کے سائے میں عمر بھر بیٹھا اسی کی شاخ سے برگ و ثمر گرا کے چلا

خود اپنے آپ سے آنکھیں ملا نہ سکتا تھا
چلا تو آئینے سے بھی نظر چرا کے چلا

میجر ارباب محمد یوسف (یوسف رجا چشتی)

یوسف رجا چشتی علمی اور ادبی حلقوں کی ایک مقبول، ہر دلعزیز اور محبوب شخصیت ہیں۔ دھیما مزاج پایا ہے۔ برداشت کا بلند حوصلہ رکھتے ہیں جس کے باعث ہر ایک سے مسکرا کر ملتے ہیں اور خوش خلقی سے نباہ کرتے ہیں۔

آپ کا اصل نام ارباب محمد یوسف ہے۔ ۶ ستمبر ۱۹۲۸ء کو پشاور کے قریب ایک چھوٹے سے مگر سرسبز و شاداب گاؤں بدھائی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی درساً پڑھی اور عربی، بنگلہ شوقیہ۔ مقدس زبان عربی کے فیض سے قرآن کریم، حدیث و فقہ کا مطالعہ کیا اور اپنی عمر کے سات سال اس اخذِ تقدس میں صرف کئے۔ پشاور میں تعلیم حاصل کی اور ایف اے کرنے کے بعد فوج میں آ گئے۔ زمانۂ طالب علمی میں مشاعروں اور ادبی ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اسی زمانے میں کچھ دوستوں کے تعاون سے مجلسِ اردو سرحد کی بنیاد رکھی۔ لیکن فوج میں آنے کے بعد جب احباب کی مجلسیں چھوٹیں تو ادبی سٹیج سے روپوش ہو گئے اور ادب سے زیادہ آداب سے واسطہ رہا۔ تاہم مشقِ سخن جاری رکھی۔ ۲۷ سال کی ملازمت کے بعد جب ریٹائر ہوئے تو پھر آپ تھے اور ادبی حلقے، تمام کسر پوری کر دی ادارۂ علم و فن پشاور سے منسلک ہوئے اور بالآخر اس کے ناظمِ اعلیٰ مقرر ہو گئے۔

آپ کا ابتدائی کلام جو آپ اکٹھا کر چکے تھے جنگ کے دوران ضائع ہو گیا جس کا (صاف ظاہر ہے) آپ کو بہت دکھ ہوا۔ بچا کھچا اور بعد میں کہا ہوا کلام یکجا کیا اور "آنکھوں کی زبان" کے نام سے ترتیب دے ڈالا۔ آپ فارسی، ہندکو، پشتو اور اُردو زبانوں میں شاعری کرتے ہیں صوفی منش انسان ہیں دکھ جھیلتے ہیں دیتے نہیں ریڈیو اور ٹی وی کے ادبی پروگراموں میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے مشاعروں کی جان ہیں آپ کی شاعری خود کلامی بن کر سامنے آتی ہے۔ الفاظ جو اظہار کا ذریعہ ہیں انہیں خوبصورت جوڑ کر نہایت سلیقے اور سادگی سے پیش کرتے ہیں۔ بچپن کی یادوں میں اکثر کھوئے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بچپن سے ہی محبت کے جھولے جھولتے آئے ہیں۔

یاد آتے ہیں وہ معصوم دھندلکے اب بھی
جن سے احساسِ محبت کی شعاعیں پھوٹیں
بوڑھی سی بستی کے نزدیک وہ اشجارِ جواں
بارہا بجلیاں اندیشوں کی جن پر ٹوٹیں

ooo

غزلیں

وہ برہمی نہ لگی اب یہ آشتی نہ لگے
کہ سادگی بھی تری اب تو سادگی نہ لگے

جراحتوں نے مجھے اتنا کر دیا محتاط
جو پہلی بار ملے وہ بھی اجنبی نہ لگے

کچھ اس سلیقے سے تم دل پہ داغ دیتے ہو
دعا ہے تم کو کسی کی نظر کبھی نہ لگے

ترے خیال میں خود سے مکالمے بولوں
پر اپنی بات بھی اب اپنی بات ہی نہ لگے

نہ جانے رفعتِ معیار ہے کہ شدتِ یاس
جو آدمی نظر آئے تو آدمی نہ لگے

میں تیرے عدل کے بھی خواب دیکھ ہی لیتا
بُرا ہو ڈر کا کہ اک ڈر سے آنکھ ہی نہ لگے

رجاؔ یہ دھوپ نگل لو تو سائے بھی اگلو
کہ زندگی تو بغیر اس کے زندگی نہ لگے

قدم اٹھانے تو دو کہ منزل کا باب آئے
پھر اپنی قسمت جو آگے آگے سراب آئے

یہ زندگی دھوپ ہے تو صحرا کی دھوپ ہی کیوں
کوئی شجر تو ملے کہیں تو سحاب آئے

کہیں نہ حرف آئے تیرے معیارِ دوستی پر
وفا میں ناکام تیرے ہاں کامیاب آئے

وفا شعاروں کی ہی بغل میں ہیں کیوں صحیفے
دغا پرستوں پہ بھی تو کوئی کتاب آئے

سیاستوں کی کہانیاں طاق پر سجیں گی
بس اب تو کوئی صداقتوں کا بھی باب آئے

ہماری کیا زندگی تھی جاڑے کی چاندنی تھی
نہ آپ آئے نہ نیند آئی نہ خواب آئے

وقارِ حرف آج ہے زرِ کم عیار یارو
جہاں کے بازار کا ہمیں کب حساب آئے

میجر سیّد نُورالحسن رضوی

ہر شخص اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یا دل کے احساسات کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اظہارِ خیال کے کس طریقے کو اپناتا ہے اور آیا جس انداز کو اپنا رہا ہے اس کی ابجد سے شُد بُد بھی ہے یا نہیں۔ لیکن انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے۔ دیکھتا ہے۔ پرکھتا ہے۔ سمجھتا ہے اور جو الاؤ یا خوشیاں دل کے نہاں خانے میں جوالا مکھی کی صورت ہوتی ہیں۔ انہیں باہر لے آئے۔ انہیں لوگوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچائے۔ دل کی اسی کیفیت کو سید نورالحسن رضوی نے شاعری کے ذریعے قفس سے آزاد کیا ہے۔ "عکسِ نور" پڑھ کر یہ کہنا تو آسان ہے کہ اس میں کئی سقم ہیں کہیں کہیں تسلسل برقرار نہیں رہا فاعلن، مفعولن کی صحیح بندش نہیں لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ اس تخلیق میں کتنی کوشش ہوئی؟ کتنا خونِ جگر صرف ہوا؟ کتنے دنوں کا چین اور راتوں کی نیندیں خرچ ہوئیں؟ کتنے قیمتی لمحات کا لہو بہا؟ کتنا وقت استعمال ہوا؟ کتنے درد والم سے واسطہ پڑا؟ اور کیسے کیسے غموں سے گزر ہوا؟ بہرحال جناب رضوی نے بڑے سادہ اور مخلصانہ انداز میں فوجی ذمہ داریوں کے باوجود اپنی سوچ کو ہم تک پہنچایا ہے۔

میجر سید نورالحسن رضوی ۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ سائنس کی تعلیم حاصل کی اور وقت سے پہلے فوج میں آگئے۔ ۲۶ اگست ۱۹۵۰ء کو الیکٹریکل اینڈ مکینکل انجینئرنگ میں آپ کو کمشن ملا۔ ۱۹۶۲ء میں آپ کو میجر کے عہدے پر ترقی ملی اور پھر اسی عہدے سے آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے سلسلے میں ۲۷ نومبر ۱۹۷۱ء کو دوبارہ آپ کو بلایا گیا۔ لیکن وقت کا فیصلہ ہو جانے کے بعد جلد ہی یعنی ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء کو آپ پھر سبکدوش کر دیئے گئے۔

آپ نے دونوں کڑے وقتوں یعنی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں اپنے آپ کو پیش کیا اور عسکری فرائض بڑی خوش اسلوبی، محنت، لگن اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جذبۂ حب الوطنی کے تحت سرانجام دیئے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

"مظہرِ رحمتِ تمام آیا" ساتھ اللہ کا کلام آیا
گونج اٹھی سلام کی جنت جب محمدؐ کا لب پہ نام آیا
عام انسان ہو نہیں سکتا جس کو اللہ کا سلام آیا
آمنہؓ بی تمہیں مبارک ہو "مظہرِ رحمت تمام آیا"
عبد و معبود کی حدیں سمٹیں قاب قوسین کا مقام آیا
قابلِ فخر ہو گیا انساں ایسا اسلام کا نظام آیا
راکبِ دوشِ مصطفیٰؐ جو تھا واقعہ کربلا میں کام آیا

برملا رحم کھا گئے مولا
جب بھی درپیش انتقام آیا

غزل

تشکیلِ حیاتِ انساں کی انسان کو قدرت دے دیتا
فرعون کو موسیٰؑ بننے کی اللہ جو مہلت دے دیتا
اب وصل و تقرب کا تیرے امکان نہیں مجبوری ہے
کیا عیب تھا فکرِ انساں کو کچھ اور جو رفعت دے دیتا
چھوٹی سی تسلی کافی تھی بس نزع میں مرنے والے کو
ہلکے سے تبسم کی شاید وہ آپ کو زحمت دے دیتا
دل خوب سمجھتا ہے تجھ کو پر عقل ہمیں بہکاتی ہے
الفاظ کے ہاتھوں میں یارب آئینۂ وحدت دے دیتا
سرداریٔ عالم کے شایاں کچھ خاص ہی بندے ہوتے ہیں
میں بندہ عاصی تھا تیرا کچھ روح کی عظمت دے دیتا
جب حسن سی کافر شے دی تھی انصاف بھی کرنا تھا آخر
کچھ غم کی حلاوت دے دیتا کچھ لطف و عنایت دے دیتا

میجر محمد عیسیٰ انور

جناب محمد عیسیٰ انور اپنے تعارف میں لکھتے ہیں "میں وادی گنگ و جمن کے ایک نہایت ہی غیر معروف گاؤں (جو کسی بھی تاریخی اہمیت کا حامل نہیں) میں ایک دن (یا ممکن ہے رات ہو) پیدا ہوا... پیدائش کا صحیح سن کوشش کے باوجود نہ توامی اور نہ ہی اباجی مرحوم سے معلوم ہو سکا۔ بچپن میں ہم کو پڑھایا گیا تھا کہ تھانے میں بچے کی پیدائش کا اندراج بھی نمبردار یا چوکیدار کرایا کرتا ہے۔ مگر جب بڑا ہو کر تھانے کے رجسٹر سے اپنی پیدائش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ میرے والدین ہی پیدا نہیں ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ متوقع سالوں سے پانچ دس سال پہلے یا بعد میں بھی کسی بچے کی پیدائش کی تصدیق نہیں ہوتی۔ تھانے سے ناکامی کے بعد امی جان سے رجوع کیا تو انہوں نے دماغ پر کافی زور دینے کے بعد مزید رہنمائی ان الفاظ میں کی کہ میں جس سال پیدا ہوا تھا اسی سال ایک زبردست سیلاب آیا تھا"۔

یہ تو تھی جناب کی اپنی تحقیق۔ لیکن میری تحقیق مجھے اس مقام پر لے آئی ہے کہ آپ جب کبھی بھی اس دنیا میں آئے مجھے اس سے غرض نہیں آپ کی رجسٹرڈ تاریخ پیدائش ۱۹ فروری ۱۹۲۵ء ہے۔ جسے آپ ماننے کو تیار نہیں۔

۴ جولائی ۱۹۵۳ء میں آپ کو فوج میں کمشن ملا اور آپ آرڈننس کور میں پوسٹ ہوئے۔ پھر یوں ہوا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پوری قوم ایک جان لیوا سانحے سے گزری۔ آپ ان دنوں ملک کے مشرقی حصے میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ لہٰذا آپ کو بھی دشمن کی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

شاعری کے جراثیم بچپن سے آپ کے اندر موجود تھے۔ آپ کمشن کے حصول سے پہلے رینک میں تھے تو کئی ایک نظمیں لکھیں۔ جن میں سے چند ایک ۱۹۴۹ء میں شائع بھی کروائیں۔ لیکن جب افسر بنے تو سکوت چھا گیا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کچھ نہ کہا۔ لیکن قیدِ ہند کے زمانے میں پھر آپ پر اچانک اور شدید حملہ ہوا اور آپ شعر کہنے لگے بلکہ قید کے دوران تو بہت کہا۔ اتنا کہا کہ دو ہی سال میں ایک مجموعہ ترتیب دے مارا۔ جسے "حسین صیاد" کا نام دیا۔ ○○○

وطنِ کی پاک سرزمین

نہیں ہے تجھ سا پوری کائنات میں کوئی حسیں تری ہتک ہے میں اگر کہوں کہ تو ہے مہ جبیں
جو تجھ میں بانکپن ہے وہ قمر میں ہے نہ شمس میں ہے ایک کوہِ سنگ دوسرا ہے کوہِ آتشیں
ثریا اور زہرہ کیا ہیں تیرے رُخ کے سامنے یہ زرد زرد چہرے تیری گردِ راہ بھی نہیں
تیری نظر میں جانے آج میری حیثیت ہے کیا میں اتنا جانتا ہوں تو ہے میری جان میرا دیں
اگرچہ آج میں ہزاروں میل تجھ سے دور ہوں کبھی وہ روز و شب بھی تھے میں جب ترا تھا ہم نشیں
یہ کیا کہا کہ ایک دن میں تجھ کو بھول جاؤں گا قرارِ من، بہارِ من، دیارِ من، نہیں نہیں

تجھی سے اپنی شان اور ساری آن بان ہے
وطن کی پاک سرزمیں جو تو نہیں تو کچھ نہیں

غزل

یہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم وفا کرتے ہمارا کام تھا ہم کرتے، تم جفا کرتے
قدم اٹھاتے تو منزل کچھ اتنی دور نہ تھی اٹھا کے ہاتھ مگر ہم رہے دعا کرتے
اثر دعاؤں کا الٹا ہی ہم نے دیکھا ہے ہمارے حق میں تم اے دوست بددعا کرتے
تمہی تو کہتے تھے گلشن میں روشنی کم ہے ہم اپنا دل نہ جلاتے تو اور کیا کرتے
ملیں گے سایۂ مسجد میں تم کو کب منصور نمازِ عشق سرِ دار ہیں ادا کرتے
بوقتِ نزع رقیبوں کے ساتھ ہی آئے تمہی کہو کہ ہم ایسے میں کیا گلہ کرتے
گلہ ہے تنگیٔ عالم کا روٹھ کر مجھ سے فراخ دل تھا اسی میں ہی تم رہا کرتے
جو اشکبار ہو شبنم تو پھول ہنستے ہیں ہم اشک گر نہ بہاتے تو آپ کیا کرتے

وہ پوچھتے ہیں اسیروں سے آج کل انور
بتاؤ جاتے کہاں ہم اگر رہا کرتے

☆

میجر عبدالحمید (حمید یورش)

اُردو شاعری میں ڈاکٹر محمد اقبالؒ، فیض احمد فیض اور اصغر سودائی کے اسمائے گرامی کی وجہ سے سیالکوٹ ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اسی سیالکوٹ کے ایک قصبے ظفروال میں خواجہ عبدالحمید ۲۸ مئی ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ آنکھ کھولی تو پورے برصغیر کو انگریزوں کی غلامی میں پایا۔ ابھی زیرِ تعلیم ہی تھے کہ آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔ آپ نے بھی کم عمری کے باوجود دوسرے طلبار کی طرح تحریکِ آزادی کا ساتھ دیا۔ مقامی ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ ریلوے سے منسلک رہے اور پھر ۱۹۴۸ء میں بحیثیت سپاہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۴ سال تک اس رینک میں گزارنے کے بعد کمشن کے لئے درخواست دی اور منتخب ہو کر پاکستان ملٹری اکیڈمی چلے گئے جہاں سے ۱۳ مارچ ۱۹۵۴ء کو سیکنڈ لیفٹننٹ کے عہدے پر شعبۂ مواصلات میں کمشن پایا۔ دورانِ ملازمت آپ کو دفاع کے مواقع میسر آئے تو آپ نے دل و جان سے اپنے فرائض ادا کئے۔ عسکری خدمات کے سلسلے میں راولپنڈی آنا ہوا تو یہاں کی فضا اتنی پسند آئی کہ ۱۹۷۴ء میں ریٹائرمنٹ لے کر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۹ء میں آخری سانسیں بھی اسی شہر کی نذر کر دیں۔

میجر عبدالحمید، جو عبدالحمید، یورش عوامی اور حمید یورش کے اسمار سے لکھتے رہے۔ دورانِ ملازمت اور بعد میں کئی جرائد مثلاً عقاب، ہلال، قاصد، افکار، اور لاہور کے کئی رسائل میں چھپتے رہے۔ "جوئے تشنۂ تلاطم" آپ نے اپنی اَدبی جاگیر چھوڑی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے ایک اثاثہ اور ایک پیغام ہے۔ آپ اَدب میں ترقی پسند رجحان رکھتے ہیں۔ غزل آپ کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے۔ "آپ کی غزلوں میں غمِ جاناں، غمِ دوراں، اقتصادی ناہمواری اور معاشرہ میں طبقاتی اُونچ نیچ سے جو لہر ذہنوں سے اُٹھی ہے۔ اس کی جھلکیاں نمایاں ہیں"۔ آپ کے ہاں عظیم وطن کی تعمیر کا جذبہ ہے۔ خدمت و یگانگت کا پیغام ہے۔ زندگی کی اُمنگوں اور بلند مقاصد کا تصور ہے۔ سوچ کی پختگی اور خیال کا ارتقار ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

زمیں والوں کی خاطر آسماں کے ترجماں تمؐ ہو
غرض اک رابطہ بینِ مکان و لامکاں تمؐ ہو

وقارِ حرف و معنیٰ، آبروئے حکمت و دانش
وہ امیؐ دہن ہے گر علم تو اس کی زباں تمؐ ہو

بشر جکڑا تھا زنجیرِ رسوماتِ جہالت میں
گری پل بھر میں کٹ کر جس سے وہ ضربِ گراں تمؐ ہو

یہ دنیا ابدیت، آقائیت میں بٹتی جاتی تھی
کیا رازِ مساواتِ بشر جس نے عیاں تمؐ ہو

سیاست ہو، قیادت ہو، ہدایت ہو، امانت ہو
زمانہ جتنا دہرائے ہے کم وہ داستاں تمؐ ہو

تم آئے اور گئی تفریق رنگ و نسلِ انساں سے
جہاں تکریم بر تقویٰ ہے وہ موجِ رواں تم ہو

غزل

دل میں زخم لئے پھرنا اور چپ رہنا آسان نہیں
اجنبیوں کے برف سمندر میں بہنا آسان نہیں

میرے آل دوالے والے میرے کتنے اپنے ہیں
سچ پوچھو تو اتنے اپنوں میں رہنا آسان نہیں

چپ کی دیواروں پر ہم سچائی لکھتے پھرتے ہیں
کب اور کون پڑھے یہ تحریریں کہنا آسان نہیں

مجھ کو شہر بدر کرنے والے بھی شاید سچے ہیں
اتنے غیر شناسا عنصر کو سہنا آسان نہیں

سہل نگاروں نے اپنے ماحول کو خد و خال کیا
بس اک میں نے ہی اپنا چہرہ پہنا، آسان نہیں

چوراہے پر سیدھا جاؤں تو تنہا رہ جاتا ہوں
بائیں بتی سرخ مسلسل اور ڈھنا آسان نہیں

یورش کم مقدار ہوا اور زہر کی وافر آمیزش
اس پر حکماً سانس کی مجبوری سہنا آسان نہیں

میجر خواجہ جلیل احمد

خواجہ جلیل احمد ۱۳ جولائی ۱۹۲۵ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نفسیات اور انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور اسی یونیورسٹی میں لیکچرر شپ اختیار کر لی۔ لیکن سب کچھ تیاگ کر مسلمانانِ برصغیر کے لئے بنائے گئے علیحدہ وطن پاکستان کا رخ کیا۔ یہاں آکر اردو کالج کراچی اور گورنمنٹ کالج بنوں میں یکے بعد دیگرے انگریزی کے لیکچرار رہے۔ بعد ازاں فوج سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے فضائیہ میں اور پھر بری فوج میں خدمات سرانجام دیں اور میجر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔ آپ نے ۲۰ اگست ۱۹۵۲ء کو ایئر فورس میں کمشن لیا اور فلائنگ افسر کے عہدے سے ۹ فروری ۱۹۵۷ء کو ریٹائرمنٹ لے لی پھر ۱۸ ستمبر ۱۹۵۷ء کو آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن لیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آیا تو آپ بھی وہیں تھے۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے ساتھ اسیری کے دن کاٹے۔ واپس آکر تقریباً ۴ سال تک خدمات ادا کرتے رہے اور ۱۹۷۸ء میں فوج سے فارغ ہو گئے۔

جناب خواجہ جلیل احمد کا اصل میدان نثر نگاری ہے۔ جس کا شوق آپ کو زمانۂ طالب علمی سے تھا اسی دور میں "نفسیاتی آئینے" آپ کی کتاب شائع ہوئی۔ ۱۹۴۸ء تک آپ مختلف جرائد کے لئے لکھتے رہے۔ انگریزی صحافت سے بھی دلچسپی رہی کچھ عرصہ "سندھ آبزرور" کے نیوز ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ پھر آپ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑی تیزی سے آگے بڑھے۔ ۱۹۶۹ء میں "رزم بزم" کے نام سے آپ کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔

میجر خواجہ جلیل احمد زندگی کی اخلاقی اور روحانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک درد مند دل کے مالک ہیں جو ہر خرابی پر تڑپتا ہے اور ہر خرابی پر دھڑکتا ہے۔ آپ جھوٹ سے بیزار نظر آتے ہیں اور اس کی وجہ شاید بیگم دردانہ جلیل کا ایک ناقد ہونا ہے چونکہ گھر میں ہی تنقید ہوتی رہتی ہے اور جو تحریر سامنے آتی ہے نکھر کر آتی ہے۔ آپ چیستانی شاعری کے شدید مخالف ہیں اور توانا ابلاغ کے زبردست حامی ہیں آپ کے نزدیک خود ساختہ علامات شاعر اور قاری کے درمیان اجنبیت کی دیوار بن جاتی ہیں ○○○

غزلیں

اک طرف ہیں سیم و زر بھرپور تابانی کے ساتھ
دوسری جانب ہے غربت زرد پیشانی کے ساتھ

درد مندوں سے محبت غمزدوں سے دوستی
زیب دیتی ہی نہیں تختِ سلیمانی کے ساتھ

سخت مشکل ہوگیا ہے نسلِ آدم کے لئے
جادۂ ایماں پہ رہنا نفسِ انسانی کے ساتھ

صحبتِ عہدِ جوانی اور ہم سے نکتہ داں
کیا کہیں کیسے گزاری ایک دیوانی کے ساتھ

پیش ہوں گے جلد شاہِ وقت کے دربار میں
اہلِ دولت اپنی جملہ حشر سامانی کے ساتھ

قاتلانِ شعر و وجداں، ساکنانِ چیستاں
قحطِ معانی بھی ہے لفظوں کی فراوانی کے ساتھ

ساتھیو اہلِ محبت پر ہے مایوسی حرام
دوستو آگے بڑھو ہر جہدِ امکانی کے ساتھ

لمحہ لمحہ چاہتا ہے وسعتِ فکر و نگاہ
زندگی مشکل ہے یارو، تنگ دامانی کے ساتھ

وہ مرے بارے میں شاید ٹھیک کہتے ہیں جلیل
ہے تو فرزانہ مگر تھوڑی سی نادانی کے ساتھ

رُخِ حیات پہ شاید کہ تازگی کم ہے
بڑی ہی دیر ہوئی چشمِ آرزو نم ہے

یہ کس کے ہاتھ میں شوق و وفا کا پرچم ہے
سکوت و عجز کے عالم میں صورتِ جم ہے

بڑے ہی شوق سے باہر صدف کے آیا تھا
پتہ چلا کہ یہاں پر تو آبرو کم ہے

خلوصِ فکر ہے مقصود سادگی معدوم
فغاں کہ چار طرف آج دعوتِ سم ہے

بفیضِ عہد یہاں ہونٹ مسکراتے ہیں
درونِ قلب مگر اک فغاں کا عالم ہے

رواں دواں کہ ابھی دور ہے مقامِ ثبات
جلیل زلفِ شبِ تار اب بھی برہم ہے

میجر علمدار حسین سیّد

سیّد صرف تخلص ہی نہیں بلکہ آپ سادات گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ جس نسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔

جناب علمدار حسین سید ۱۹۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اندور میں پائی۔ ان دنوں وہاں ناطق بھوپالی مدرس تھے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ ادبی تھا۔ وہ بات بات پر بچوں کو اساتذہ کے اشعار سناتے۔ جس سے بچوں میں ایک شعری ذوق پیدا ہوا۔ وہاں سے سید صاحب دہلی میں آئے تو یہاں منشی کشن چند ناظم جیسے استاد سے اردو پڑھی۔ منشی ناظم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور ان دونوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ایسے اساتذہ اور ماحول کے زیر اثر جناب علمدار حسین کی طبیعت بچپن سے ہی شاعری کی طرف راغب ہو گئی۔ پہلی غزل جب کہی تو اسے جناب فیض دہلوی کی خدمت میں سنایا۔ جنہوں نے غزل کی اصلاح تو نہ کی البتہ نصیحت فرمائی۔ "صاحبزادے ! اب شاعری میں کیا رکھا ہے اس کو رہنے دو اور تعلیم حاصل کرو۔"

پارٹیشن کے بعد آپ پاکستان آگئے اور راولپنڈی میں رہائش رکھی۔ تعلیم کا سلسلہ جو ادھورا چھوڑا تھا اسے پورا کیا اور فوج میں آگئے۔ فوج میں آنے سے آپ کی شاعری عسکری مصروفیات کی نذر ہو گئی۔ لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب آپ جنگی قیدی بنے تو بریلی کیمپ میں یونس خلیل وغیرہ کے ساتھ مل کر ادبی سرگرمیاں قائم کیں۔ جس سے باقاعدہ غزل گوئی کی ابتدا ہوئی۔ لیکن رھائی کے بعد پھر یہ سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور روٹی، کپڑے اور مکان کا غم اس پر غالب آگیا۔ جب واپس راولپنڈی آئے تو رفتہ رفتہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ دوستوں اور احباب کی پذیرائی سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب بھی آپ کہتے کم اور سنتے زیادہ ہیں اور دل کھول کر داد دیتے ہیں۔

آپ کا کلام پڑھ کر لگتا ہے کہ قدیم اور جدید لہجہ معانقہ کر رہا ہے۔ اس لئے دونوں روایات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ OOO

غزلیں

ان حسینوں میں بھی احساسِ وفا ہے کہ نہیں — یاالٰہی کوئی تاثیرِ صدا ہے کہ نہیں
تم مسیحا ہو کئے جاتے ہو مُردوں کا علاج — کوئی زندوں میں بھی محتاجِ شفا ہے کہ نہیں
ہم نفس ، اے مرے ہمدم، مرے ہمراز بتا — وہ جنوں ساز ابھی ہم سے خفا ہے کہ نہیں
سوچتا ہوں کہ میں خود اپنے ہی ہاتھوں مرتا — اُس بتِ شوخ نظر کی یہ سزا ہے کہ نہیں
ہم نے تو اب بھی کلیجے سے لگا رکھا ہے — اس کی آنکھوں میں جو پیغام کہ تھا ہے کہ نہیں
تم بھی جاکر درِ کعبہ پہ اسے مل آؤ — اپنے گھر میں بھی خدا جانے بسا ہے کہ نہیں

چل پڑے رختِ سفر باندھ کے کس جا سیّد
سوچ لیتے ہیں کہ اب اذنِ دعا ہے کہ نہیں

ہم جنہیں لا کلام کرتے ہیں — بس انہی کو سلام کرتے ہیں
لو، حدیثِ جنوں کے شہپارے — ہم حسینوں کے نام کرتے ہیں
یہ وفاؤں کا سلسلہ قائم — آپ کے ہی غلام کرتے ہیں
زخم بھرنے میں وقت لگتا ہے — آپ کیوں اہتمام کرتے ہیں
دل سرِ شام ڈوب جاتا ہے — لاکھ ہم انتظام کرتے ہیں
جانتے بوجھتے ہوئے سب کچھ — پھر بھی ہم احترام کرتے ہیں

دکھ ہمیں بخشتے ہیں اے سیّد
سکھ رقیبوں کے نام کرتے ہیں

میجر افتخار عزیز احمد غزالی

۱۹۹۱ء کی بات ہے ایک دن میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک نظم بعنوان " سعیِ لاحاصل " نظر سے گزری۔ انداز کچھ جانا پہچانا پایا۔ نام دیکھا تو افتخار عزیز احمد غزالی۔ نام بھی ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ پایا۔ نظم کے تین شعر دیکھئے

جب تو نے مجھے ملنا ہی نہیں
زخموں نے کبھی سلنا ہی نہیں
جب پیار کے سونے آنگن میں
پھولوں نے کبھی کھلنا ہی نہیں
پھر دن گننے سے کیا حاصل
پھر خط لکھنے سے کیا حاصل

کوئی پندرہ، بیس برس پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ نام ماضی کے جھروکوں سے پہلے کیپٹن کے عہدے سے اور پھر میجر افتخار عزیز احمد غزالی کی تحریروں کے روپ میں جھانکتا دکھائی دیا۔ درمیانے قد کاٹھ کے مضبوط گٹھے ہوئے جسم والا، چہرے پر پھبتی ہوئی مونچھیں، بدن پر بڑی خوبصورت جچتی ہوئی فوجی وردی، بہندسم، چال میں تمکنت، آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ذہانت، یعنی کہ ہر لحاظ سے ایک فوجی۔ میں نے "سعیِ لاحاصل " کو پڑھنا چھوڑ کر پرانی فائلیں نکال لیں ان میں سے پندرہ بیس سال پرانا ماضی کنگالنے لگا اور . . . پھر . . . جب تھوڑی دیر بعد دوبارہ یہ نظم پڑھی تو بالکل وہی انداز، وہی لفاظی، وہی شوخی، وہی لہجہ، وہی امید و یاس کی کیفیت، وہی مخمور و مست استعارے، وہی فرقت و جدائی کے قصے، وہی حکایتِ غم دوراں، وہی شکایتِ یاراں، وہی اقرار و انکار کے جھگڑے غرضیکہ اتنی مدت میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ میں خود یقین و بے یقینی کی کیفیت سے گزرتے ہوئے یہ کہنے پر بضد ہوں کہ "سعیِ لاحاصل" انہی کی نظم تھی۔ کیونکہ نام، اظہار، لفظ، اور یہ ہم خیالی و مطابقت خود چغلی کھا رہے تھے۔ اتنی مدت میں تو زندگی بدل جاتی ہے۔ زندگی کے انداز بدل جاتے ہیں۔ زندگی کی ضروریات و کیفیات بدل جاتی ہیں۔ مگر . . . یہاں . . . سوچ اور خیال تک وہی ہے۔ وہی جذبے اور وہی ذریعہ و اندازِ اظہار ہے۔ جس میں دیکھے اور ان دیکھے خوابوں کا حیرت کدہ ہے جس میں زندگی کی حقیقتیں اور وضاحتیں ہیں۔ ○○○

غزلیں

انسان تھا میری طرح اوتار نہیں تھا
پھر کیوں مجھے ملنے پہ وہ تیار نہیں تھا

ہم دونوں تکلف میں ہی مارے گئے شاید
انکار اسے تھا، مجھے اصرار نہیں تھا

اس شہرِ خرابی میں عجب شعبدے دیکھے
اشجار تو تھے سایۂ اشجار نہیں تھا

اب تو غمِ دوراں بھی اٹھایا نہیں جاتا
پہلے تو ترا غم بھی گراں بار نہیں تھا

کس چہرے پہ فرقت کی حکایت نہیں لکھی
کس دل میں ترے درد کا اظہار نہیں تھا

یہ ہم تھے جو نکلے تھے کفن باندھ کے سر سے
ویسے تو ترا کون طلب گار نہیں تھا

اب کے تو وہ بھرپور خزاں آئی کہ توبہ
گلشن میں گل و برگ تو کیا خار نہیں تھا

شاید ہو خموشی ہی کی سولی پہ غزالی
جھوٹوں میں نہیں تھا وہ سرِ دار نہیں تھا

مخمور و مست ہوں میں تو یہ بے سبب نہیں
صہبائے غم تو ملتی ہے گر تیرے لب نہیں

حاجت روا ہو ایسا جو خود آکے دے مجھے
دستِ سوال رکھتا ہوں پائے طلب نہیں

کیا بجھ گیا ہے چہرۂ شامِ الم کہیں
کیوں میرے دل کے داغ میں وہ تاب و تب نہیں

فرقت کے ایک غم نے بھلائے ہیں سارے غم
کچھ اور مسئلہ تو مرا حل طلب نہیں

سوچا بھی تھا کبھی کہ جدا ہوں گے ان سے ہم
آجائیں وہ پلٹ کے بھی تو کچھ عجب نہیں

جانے میں کس نشے میں انہیں اپنا کہہ گیا
اتنا تو عام طور پہ میں بے ادب نہیں

کٹ جائے گی غزالی شبِ ہجر بھی مگر
کوئی بتائے اور تو قسمت میں شب نہیں

میجر محمد سرفراز نعیم

فوجی زندگی اپنی تمام تر عظمتوں اور ولولہ انگیزیوں کے باوجود صبر آزما، مشقت طلب اور نظم و ضبط کی مقتضی ہے۔ واحد یہ ادارہ ایسا ہے جس میں تمام کام یعنی کہ ہر قسم کی پیشہ ورانہ کاروائی سخت ڈسپلن کے تحت ہوتی ہے۔ ایک سپاہی فوجی ماحول سے ہٹ کر بھی اس سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اور اس پر ہر لمحہ اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس غالب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے کے بڑے بڑے شعراء جب آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو یہ مخصوص احساسِ ذمہ داری کسی نہ کسی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اور میجر سرفراز جیسے انجینئرنگ کے طالب علم کو بھی کہنا پڑتا ہے۔

رزم گاہ میں شہ سوارِ فن ہیں ہم
مثلِ تیغِ ضو فشاں روشن ہیں ہم
قوت و جبروت کا مخزن ہیں ہم
ایک سیلِ آتش و آہن ہیں ہم

جناب محمد سرفراز نعیم ۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ سول ایجوکیشن سائنس کے ساتھ حاصل کی اور فوج میں آ گئے۔ ۲ جون ۱۹۶۸ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی سے الیکٹریکل مکینیکل انجینئرنگ میں کمیشن حاصل کیا۔ فوجی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ذہنی سوچ کو اشعار کے روپ میں ڈھالنے کا کام بھی جاری رکھا اور یوں جہاں عسکری اکیوپمنٹ (Equipment) کو نیا اور تازہ کر کے میدان میں لائے۔ وہاں نئے اور تازہ اشعار بھی صفحات پر بکھیرتے رہے۔ فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے راوی ریان میں ملازمت اختیار کر لی اور وہاں بھی چکی کی مشقت اور شعری مشقت دونوں سلسلے جاری ہیں۔

میجر سرفراز نعیم نے شاعری میں ذاتی اور اجتماعی خوشیوں اور دکھوں، اندیشوں، وسوسوں، سوچوں اور جذبوں کو رنگِ تقطیع و عروض دیا ہے۔ آپ کی شاعری امید کی سخن دری ہے۔ غموں کے بیان کے ساتھ اچھے مستقبل کی بشارت ہے۔ ایک خوبصورت زندگی کی نوید سنانے والی شاعری ہے۔ جس کے لفظوں سے یقین پگھل پگھل کر ٹپکتا ہے۔ ○○○

عرضِ وحشت

کیا فائدہ خود سر کو نہ سمجھاؤ تو اچھا
تم مشقِ ستم اور بھی فرماؤ تو اچھا

وحشی ہے کہیں صحنِ فراغت میں نہ کودے
زنجیر وہ قدغن کی اٹھا لاؤ تو اچھا

دیوانے کو جرأت ہے کہ ہستی کی زباں ہے
سرکش کو سرِ دار ہی لے جاؤ تو اچھا

میں خوش ہوں کہ شوریدہ سری کو ہے موافق
دیوانے کے سر پر رہے پتھراؤ تو اچھا

پرواز تخیل کی بڑھی جاتی ہے حد سے
تعزیر کی حد میں اسے لے آؤ تو اچھا

کچھ دیر رہیں اور غزال اور شکاری
تم اور مجھے دشت میں دوڑاؤ تو اچھا

اک دامِ انا ہے کہ اسیر اس کا زمانہ
بڑھتا رہے اس دام کا پھیلاؤ تو اچھا

خنجر کو ملے زُعم کی آب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ عتاب اور زیادہ

غزل

پیامِ مرگ جو لائے وہ آب و دانہ کیا
لپکتے شعلوں کی شاخوں میں آشیانہ کیا

ہوائے تُند کی زد میں چراغ ہیں سارے
قرارِ چشم و دل و جاں کو فی زمانہ کیا

کتابِ فکر ہے بند اور چراغِ ذہن خموش
جلال و تمکنت و شانِ افسرانہ کیا

دماغِ جوشِ نمو کیا ہے کیسی بیداری
دیارِ جبر میں لہجہ ہو ناصحانہ کیا

بتِ مراد دعائیں کبھی نہیں سنتا
کہ سجدہ ریزی ہو اس در پہ عاجزانہ کیا

ازل سے مطلعِ دل پر ہے درد کا خورشید
ملی ہے اس کو تب و تابِ جاودانہ کیا

نعیم جس سے نہ قطرے لہو کے ٹپکے ہوں
نظر وہ کیا ہے وہ دامن ہے کیا فسانہ کیا

★

میجر محمد طارق طور

سیالکوٹ خصوصاً میجر طور سے ملاقت کی غرض سے گیا۔ لیکن وائے قسمت کہ آپ امریکہ گئے ہوئے تھے اور ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ ۱۹۹۶ ء کی بات ہے آپ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گھر سیالکوٹ آ چکے تھے۔

"دروغ برگردن قاری" جیسی طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی کتاب کے خالق محمد طارق طور ۲۰ مئی ۱۹۵۲ ء پیدا ہوئے۔ تعلیمی مراحل سے گزر کر فوج میں آ گئے اور ابتدائی تربیت کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ ء کو کمشن لے کر آرٹلری کور میں خدمات سرانجام دینے لگے۔

میجر طارق طور جنہوں نے نثر میں ظرافت کو پیروڈی کا رنگ دیا ہے اور ہلکی ہلکی بازیگری سے معاشرے کی کمزوریوں کو بڑے شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ شعر کہے تو اس میں ۱۸۰ ڈگری مخالف انداز لے کر آئے ہیں۔ شاعری میں آپ نے محبت اور چاہت کی بات کی ہے۔ کچھ نفرتوں اور عداوتوں کے رنگ بھی لائے ہیں۔ نصیب اور قسمت کی بات بھی کی ہے۔ زخموں اور ان سے اٹھنے والی ٹیسوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

میجر طارق طور نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ عسکری ملازمت کے دوران آپ کو مختلف مقامات پر مختلف عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا۔ حتیٰ کہ پریزیڈنٹ ہاؤس میں بھی خدمات کی ادائیگی کے سلسلے میں رہنا پڑا جہاں مختلف لوگوں سے واسطہ رہا۔ آپ کے مشاہدے اور مطالعے کا سارا نچوڑ آپ کی نثر اور نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے طنز و مزاح کو جہاں ذریعہ اظہار بنایا ہے وہاں سنجیدگی کو بھی کئی مسائل کے اظہار کے لئے اپنایا۔

ooo

رات کا پچھلا پہر تھا، چاند تھا، دریا بھی تھا
حسرتیں تھیں کوبکو تھوڑا سا میں رویا بھی تھا

میں محبت کر سکا تم سے نہ تم سے ہی ہوئی
یہ بجا میں نے تمہیں تم نے مجھے چاہا بھی تھا

بدنصیبی دیکھیۓ اس طاقتِ گفتار کی
پاس سے گزرا تھا وہ میں نے اسے دیکھا بھی تھا

ایسے مسئلے میں پھنسے کہ حل نہ کوئی مل سکا
مدتوں ہم دونوں نے اس پر بہت سوچا بھی تھا

تم غلط سمجھے تھے طارق اس سراپا ناز کو
درحقیقت غیر تھا لگتا مگر اپنا بھی تھا

اس ذرا سی بات کا بھی شہر میں چرچا ہوا
اس کے جوڑے میں سجا تھا پھول اک سوکھا ہوا

زندگی مل جائے پھر بھی موت آئے تو بھی لوگ
جانے کیوں کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا

تو پتہ نہ پوچھ میرا کام سے بس کام رکھ
میں مسافر اور وہ بھی راستہ بھولا ہوا

تیرا ملنا مجھ سے یوں اچھا نہیں اے جانِ جاں
میں بُرا سا آدمی ہوں راہ سے بھٹکا ہوا

حادثہ ملنے کا تیرے گو پرانی بات ہے
زخم پھر بھی زخم ہے تازہ ہو یا بھولا ہوا

روشنی سی دیکھ کر سوچا وہ شاید آگئے
گھر سے باہر جا کے دیکھا چاند تھا نکلا ہوا

آپ طارق طور سے مل کر کبھی تو دیکھیۓ
یہ ہمارا یار ہے دیکھا ہوا بھالا ہوا

میجر غلام نبی اعوان

"اس بار بھی ۲۳ مارچ گذشتہ سالوں کی طرح گزر گیا توپوں کی سلامیاں ہوئیں مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں پریڈیں ہوئیں سیمینار جلسے اور تقریروں کے میلے لگے۔ میڈیا پر بڑے بڑے بقراطوں نے دانشمندیاں جھاڑیں ۰۰۰ تیئیں مارچ ختم ہوا اب وہ سارے عہد و پیمان اور وعدے دھواں بن کر تحلیل ہو جائیں گے؟"

یہ چند سطور جو "اے پاک زمین، میں تیرا مجرم ہوں" سے لی گئی ہیں۔ میجر غلام نبی اعوان کی حقیقت پسندی کا ثبوت ہیں آپ ایسے سادہ اور سیدھے انسان ہیں کہ بغیر لگی لپٹی اور ڈپلومیسی کے ہر بات دھڑلے سے کہہ جاتے ہیں۔

جناب غلام نبی اعوان کے آباؤاجداد صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے صادق آباد ضلع رحیم یار خان میں آکر آباد ہوئے تھے جہاں آپ یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیمی مراحل سے نکل کر لاہور کا رخ کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ناطہ جوڑا جہاں آپ تعلیم اور ادب کو ایک دوسرے کے ہمراہ لے کر چلتے رہے۔ آپ نے وہاں اَدبی مجلّے کی ادارت بھی کی اور نوائے وقت میں سٹوڈنٹ کا صفحہ بھی ترتیب دیا۔ آپ نے تعلیم کا جو سلسلہ مہد سے شروع کیا تھا ابھی تک ختم نہیں ہوا بلکہ آپ کے تیور دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لحد تک اسے جاری رکھنے کا ارادہ ہے۔ آج کل آپ عسکری مصروفیات کے علاوہ ادبی مشاغل کو بھی نبھا رہے ہیں۔ لار کا سوچا ہی تھا کہ تبادلہ کے احکامات مل گئے اور آپ نے ڈاکٹریٹ پر غور کرنا شروع کر دیا۔

آپ اردو ادب میں ایک شاعر، ایک نقاد اور انشائیہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک اچھے مقرر، بہترین کمپیئر اور (آپس کی بات ہے) غضب کے واعظ ہیں۔ انشائیہ میں "اڑان لفظوں کی" آپ کی کتاب کافی مقبول ہو چکی ہے۔ تنقید میں "تنقیدی اشکال" بھی ادبی حلقوں میں پہنچ چکی ہے۔ شاعری میں "آشوبِ شعر" اشاعت کے مراحل میں ہے۔

آپ نے ۱۹۷۲ء میں فوج میں شمولیت اختیار کی ایک اچھے اور قابل افسر بن کر اُبھرے لیکن قدرت کے فیصلوں کو کون رد کر سکتا ہے ایک حادثے میں زخمی ہوئے اور کیٹگری ڈاؤن ہو گئے جس سے آپ کی خدمات اور ترقی محدود ہو کر رہ گئی ○○○

غزلیں

تیر جب اس کمان سے نکلا	ایک شعلہ چٹان سے نکلا
کوئی اپنا رہا نہ بیگانہ	فاصلہ درمیان سے نکلا
راستہ دے دیا سمندر نے	اشک اس آن بان سے نکلا
مٹ چکا تھا نشان جنگل کا	جب شکاری مچان سے نکلا
اب زمیں سے لپٹتا پھرتا ہے	سایہ کیوں سائبان سے نکلا
اپنی آواز لے گیا ہمراہ	جب پرندہ چٹان سے نکلا
بات دل کی زباں پر آ نہ سکی	کام کب ترجمان سے نکلا

بے سبب تو نہیں خفا دنیا
کچھ تو میری زبان سے نکلا

پھر کوئی طرفہ تماشا کر دے	میں برا ہوں مجھے اچھا کر دے
کہیں ایسا نہ ہو کوئی لمحہ	تجھ کو چھو کر مجھے تنہا کر دے
لفظ مر جائے اگر بچپن میں	اس کا وارث کوئی پیدا کر دے
بخش دے میری علامت مجھ کو	میرے اوپر میرا سایہ کر دے
رنگ و بو بانٹ دے اس سے لے کر	پھول کے بوجھ کو ہلکا کر دے
چھین کر اشک سے اس کی آواز	اور بھی اس کو نہتا کر دے
میں ہوں آلودۂ خوابِ غفلت	مجھ کو کھنگال کے اجلا کر دے
میں بکھر جاؤں تو مجھ کو چن کر	اپنے آنگن میں اکٹھا کر دے
میں بھی پہچان لوں شاید اس کو	میری جانب میرا چہرہ کر دے

مجھ کو ڈر ہے کہ میری خاموشی
تجھ سے کوئی نہ تقاضا کر دے

میجر غضنفر عباس قیصر فاروقی

عشق کی دیوداسی ہیر سیال اور پنجابی زبان کے صوفی شاعر حضرت سلطان باہوؒ کے علاقے یعنی ضلع جھنگ کے ایک چھوٹے سے غیر معروف گاؤں میں ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام غضنفر عباس رکھا گیا۔ جس نے بڑے ہو کر اردو ادب میں قیصر فاروقی کے نام سے شہرت پائی۔ نہ جانے قیصر تخلص انتخاب کرتے ہوئے اس لفظ کے معانی پر آپ نے کیوں غور نہیں کیا۔ یہ ابتدائی دور کی ناسمجھی اور لاعلمی بھی ہو سکتی ہے یا انگریزیت کا اثر بھی۔ بہر حال بچپن شیر افضل جعفری اور مجید امجد کے نشانات پر چلتے گزرا ماسٹر کی ڈگری انگریزی ادبیات میں گارڈن کالج راولپنڈی سے حاصل کی اور پھر سید جعفر طاہر کے نقوش کی تلاش میں چل پڑے۔ ۱۶ اپریل ۱۹۷۲ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی سے آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن پایا۔ اور وہیں پی ایم اے میں انسٹرکٹر تعینات ہوئے۔ بعد میں یعنی تب سے اب تک ملک کے کونے کونے میں مختلف تعلیمی اداروں اور سٹاف ڈیوٹیز سے بخوبی نباہ کیا۔

لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ لیکن جب اس شوق کو اپنایا تو خوب لکھا۔ نثر اور نظم دونوں میں خامہ فرسائی کی۔ ملک کے مختلف اخبارات و جرائد میں باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔ ملازمت کے دوران کچھ عرصہ ملک سے باہر بھی رہے۔ آپ جہاں پر چند دنوں کے لئے قیام پذیر ہوتے ہیں وہاں کی ادبی انجمنوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب آپ گلگت میں تھے تو وہاں ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جس سے وہاں کے لوگوں میں اردو زبان کا شعور پیدا ہوا۔ اب آپ کے وہاں سے چلے آنے کے بعد وہ تنظیم کافی فعال ہے۔

سیاچن کے حوالے سے آپ کی کتاب " سیاچن کی سرحد پر " بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ قبل ازیں لوگ آپ کو ایک عمدہ شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن " سیاچن کی سرحد پر " سے آپ ایک بہترین نثر نگار کی حیثیت سے بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ بہر حال آپ کی شاعری کا رنگ پھر بھی مضبوط اور اپنا ہے۔ ○○○

حمدِ ربِ جلیل سبحانہ وتعالیٰ

ہر غم میں ہے چارہ ساز میرا، ہر حال میں محرم راز میرا
داتا ہے غریب نواز میرا، غم خوار میرا، دمساز میرا
سلطانِ جہاں، شاہِ شاہاں، والیِ زمان و کون و مکاں
ہر درد کا میرے ہے درماں، ہمدم، مونس، ہمراز میرا
میں ساجد ہوں، مسجود ہے وہ، میرا مالک رب ودود ہے وہ
میں ذات ہوں اور وجود ہے وہ، میں بندہ وہ بندہ نواز میرا
وہ میری نوا، میرا حرفِ وفا، میرے گیت کی لے، میرے دل کی صدا
میرا ہر ہر بول ہے حمدِ خدا، آواز، لحن انداز میرا
میری شان وہی، میرا مان وہی، میری چاہت اور ارمان وہی
میری ہستی کی پہچان وہی، وہی ناز مرا ہے نیاز مرا
مرا سجدہ جبینِ نیاز ہے وہ، مرے عدم وجود کا راز ہے وہ
مری روح، مری جاں، مرا تن وہ ہے، مری ہر خواہش انداز میرا
میں نغمہ ہوں وہ سرگم ہے، میں پھول ہوں تو وہ شبنم ہے
قیصر میری آنکھ کا نم وہ ہے، وہی سوز میرا ہے ساز میرا

میں ان کی رضا کا ہوں طلبگار ازل سے

اے سرورِ دیں واقفِ اسرار الٰہی — ہیں کون و مکاں تیریؐ جلالت کی گواہی
والشمسؐ ترا چہرۂ خورشید جہاں تاب — لیلائے شبِ زلف ہے والیل الدجیٰ ہی
آفاق کی رفعت پہ اڑے تیراؐ پھریرا — پڑھتے ہیں فرشتے بھی سدا صلِّ علیٰ ہی
ہے ذکر تراؐ باعثِ تزئینِ دو عالم — ہر حرف ہے تکوینِ اوامر و نواہی
ہیں ارض و سما تیریؐ تجلی سے منور — اے نورِ مبیںؐ نیّرِ انوارِ الٰہی
میں انؐ کی رضا کا ہوں طلبگار ازل سے — منشائے محمدؐ میں ہے اللہ کی رضا ہی
ہے حفظِ حرم میرے لئے باعثِ اعزاز — ہوں فوجِ محمدؐ کا اک ادنیٰ سا سپاہی
ہر آن مچلتی ہے دلِ زار میں حسرت — بن جاؤں پھر اک بار مدینے کا میں راہی
سلطانِ دو عالم کا طلبگار نہیں ہوں — میں ہوں شہِؐ طیبہ کے غلاموں کا گدا ہی

میجر محمد یعقوب خان

پچاس کی دہائی میں پیدا ہوئے۔ شعور کو پہنچے تو اپنی ذات میں گم رہنے لگے۔ یعنی کہ سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ جس نے آپ کے احساسات کو تحریک دی۔ اور ایک شاعر ابھرنے لگا۔ یہاں تک کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے رکھتے شاعر بھی جوان ہو گیا۔ لیکن پھر آپ فوج میں آ گئے۔ تربیت کی تکمیل پر ۱۹۷۳ء میں آپ کو آرٹلری کور میں کمشن ملا۔ اس نئے، صاف ستھرے اور محبت بھرے ماحول میں گو آپ نے بہت کم کہا۔ لیکن آپ کی سوچیں یکسر بدل کر قوم اور وطن کی فکر میں لگ گئیں۔ اور اپنے جوانوں کو آپ اصل سمت بلانے لگے۔ اب آپ نئی نسل کو وہ راستہ دکھانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ جو ہماری آن اور بقا کا راستہ ہے ... جو ہمیں صحیح جہت کی طرف لے جاتا ہے ... آپ نے شاعری کو حسن و عشق کے قصوں یا غم و اندوہ کی الجھنوں میں کم کم پڑنے دیا ... ہاں! وطن کے ذکر کے ساتھ ساتھ نعت و حمد سے روح کی تسکین کا سامان بھی کرتے ہیں اور اس انداز سے بارگاہِ رسالت ﷺ اور آپ سے ہر نسبت میں صلوۃ و سلام پیش کرتے ہیں۔

ماہِ طیبہ اور طیبہ کے ستاروں کو سلام
روضۂ پُر نور کے پیارے نظاروں کو سلام
ترستی ہے جن کی خاطر باغِ جنت کی کلی
باغِ طیبہ کی فضاؤں، ان بہاروں کو سلام
جس جگہ تھے آپ کے صدیقِ اکبرؓ ہم سفر
ہوں ہزاروں ان پہاڑوں اور غاروں کو سلام
حضرتِ فاروقؓ و عثمانؓ، حیدرِ کرارؓ پر
آپ ﷺ کے عشاق اور سب جاں نثاروں کو سلام
آپ ﷺ کے اصحابؓ سب اور آپ کی سب آل پر
حضرتِ حسنینؑ اور سب رشتہ داروں کو سلام

جناب محمد یعقوب خان نے شاعری کو شکر کا مقام قرار دیا ہے اور اس سے وطن کے سپوتوں کو حقیقت کی طرف راغب کرنے کا کام لیا ہے۔ اور انہیں اپنی حسین، جرأتوں بھری اور پُر خلوص روایات سے روشناس کرایا ہے۔ اور پھر اس پر قائم و برقرار رہنے کا درس دیا ہے۔ ○○○

غازی یا شہید

(۱)

وطن کی پر خوف سرحدوں پر کھڑے ہوئے سر بکف دلیرو
عدوئے بد بیں کی آنکھ میں تم عقابی نظروں سے دیکھتے ہو
تحفظِ آبرو کا احساس غازیانِ وطن کے دل میں
میں دیکھتا ہوں
اور ایک لمحے کو سوچتا ہوں
میرے جیالے محافظوں کی یہی روایت
اگر سلامت رہے تو کوئی غنیم کیونکر
مرے سجیلے وطن کی سرحد
میری بہن میری ماں کی جانب
بھلا جسارت نظر اٹھانے کی کر سکے گا

(۲)

ابھی اسی سوچ کا لبادہ سجائے سود و زیاں کے چکر سے
بچ نکلنے کی سوچتا ہوں
تو جانے کس گوشۂ خموشی سے یہ صدا
آ کے میرے کانوں میں گھولتی ہے وفا کے نغمے
میں اک سپاہی ہوں
میری منزل شہید و غازی
مجھے مرے دیس کی ہواؤں
شفاف جھرنوں، حسین و شاداب وادیوں، لہلہاتے کھیتوں
سمندروں کی قسم ہے بولا کہ میں وفا ہیں
وطن کی حرمت پہ کٹ مروں گا اور اپنے خوں کے حقیر تحفے سے
پاک مٹی کو سینچ دوں گا
لکیر عظمت کی کھینچ دوں گا

میجر مصطفیٰ کمال ملک

جلا کے مجھ کو وہ خود بھی پگھل رہی ہوگی
کمال وہ بھی تو بے کل سی کل رہی ہوگی
وہ اک اداس سی کومل سی پھول سی لڑکی
انا کی زرد دوپہروں میں جل رہی ہوگی

ایسے شعر اسی صورت میں ہوتے ہیں۔ جب محرومیاں اور درد دل میں بسے ہوں۔ احساسات کچوکے لگا رہے ہوں۔ نام نہاد انا پر دو دل قربان ہو چکے ہوں۔ اور غالباً مصطفیٰ کمال ملک بھی ایسے ہی کسی سانحے سے دوچار ہوئے ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں

موسمِ درد ہے دل غم سے پھٹے جاتے ہیں
خوشنما چہرے اداسی سے اٹے جاتے ہیں

مصطفیٰ کمال ملک ۱۹۵۸ء میں ایبٹ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سینئر کیمرج برن ہال ایبٹ آباد سے ایف ایس سی گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے اور ایم بی بی ایس خیبر میڈیکل کالج پشاور سے کیا۔

شعر و شاعری کا شغف سکول دور سے تھا۔ کالج میں پہنچے تو یہ شوق پروان چڑھا۔ اور اسی بنا پر کالج میگزین "سینا" کی ایڈیٹری آپ کو سونپی گئی۔ میڈیکل کالج میں جب آئے تو ادبی ذوق کے باعث آپ تھنکر فورم خیبر میڈیکل کالج کے صدر منتخب ہوئے۔

ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد آپ نے عسکری ملازمت کو اپنے مستقبل کے لئے چُنا اور فوج میں آگئے۔ جہاں آپ ڈاکٹری اور ادب کو ہمراہ لے کر چل رہے ہیں۔ فوجی زندگی کی مصروفیات، بیماروں کے جھرمٹ اور بیماریوں کے ماحول۔ یہ سب کچھ آپ کی جوان امنگوں اور جوان چاہتوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے اور آپ حسبِ ماضی ابھی تک جوان شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے شعر کو جو لہجہ دیا ہے۔ وہ نرالا ہے۔ اسے ہم جدید کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ جدید لہجہ آپ کو جدید شعراء کی صف میں کسی اچھے مقام پر کھڑا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ○○○

غزلیں

ڈھولکی کی تھاپ میں سسکی دبی رہ جائے گی ۔۔۔ بھیگی پلکوں سے مجھے وہ دیکھتی رہ جائے گی
مسکراتے چاند سے چہرے کے پیچھے رکھ گئی ۔۔۔ ہنستی آنکھوں کے پسِ پردہ نمی رہ جائے گی
دل کی بستی کے مکیں بہہ جائیں گے سیلاب میں ۔۔۔ درد کے پربت پہ پھر بھی برف سی رہ جائے گی
سوچتے ہیں اک تمہاری دوستی چھننے کے بعد ۔۔۔ اب بھلا کس سے ہماری دشمنی رہ جائے گی
راستے کے سب مسافر دھند میں کھو جائیں گے ۔۔۔ دور منزل پر ذرا سی روشنی رہ جائے گی
ہم کہ تیرے پیر کی آہٹ کو ترسیں اور ہوا ۔۔۔ ہولے ہولے چل کے ہم کو چھیڑتی رہ جائے گی

چاہتوں کی ضرب سے بکھری تو پھر جانِ کمال
تو مکمل بھی ہوئی تو اک کمی رہ جائے گی

جدائیوں کی کسک دل مرا ڈبونے لگی ۔۔۔ بھری بہار کی رُت بھی عذاب ہونے لگی
پھر ایک رات کہ جب چاند بھی اداس سا تھا ۔۔۔ مرے رومال میں وہ منہ چھپا کے رونے لگی
میں زرد زرد سے پتے شمار کرتا رہا ۔۔۔ وہ بکھرے پھول کی پتیوں کو پھر پرونے لگی
انا کا زعم تھا تجھ کو تو دل کی شبنم سے ۔۔۔ اب اپنے پھول سے چہرے کو کیوں بھگونے لگی
یہاں میں ہجر کی شب بے سکون پھرتا رہا ۔۔۔ وہاں وہ چین سے پھر میٹھی نیند سونے لگی

پھر ایک روز وہ کومل سی پھول سی لڑکی
دلِ کمال کی دھرتی میں پیارے بونے لگی

میجر امان اللہ خان

اردو زبان کو فروغ دینے کے لئے بے شمار ادارے اور انجمنیں کام کر رہی ہیں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ادبی تنظیمیں اس ذمہ داری کو بڑے احسن طریقہ سے نبھا رہی ہیں لیکن سرکاری سطح پر ابھی تک کچھ نہیں ہوا جتنے بلند و بانگ دعوے کئے گئے یا کئے جا رہے ہیں اس قدر آؤٹ پٹ دکھائی نہیں دیتی۔ اکادمی ادبیات جیسا اگر کوئی ادارہ ہے بھی سہی تو مخصوص لوگوں کے لئے، بات کمیٹیوں کی تشکیل اور کانفرنسوں تک ہی ہے۔ لیکن ان سرکاری اداروں کی نسبت پرائیویٹ تنظیمیں زیادہ کام کر رہی ہیں۔ خواہ وہ ادبی ہوں سماجی ہوں یا رفاعی۔

شنکیاری ضلع مانسہرہ کے مقام پر ایسی ہی ایک تنظیم "انجمن اصلاح و خدمت" سرگرم عمل ہے۔ یہ ادبی اور سماجی کاموں میں زور و شور سے حصہ لیتی ہے۔ جہاں امن اور پرسکون حالات میں یہ ادب کے فروغ کے لئے کام کرتی ہے وہاں پر آشوب دور اور کڑے حالات میں ملک میں سماجی اور ملی خدمت میں بھی کوئی دقیقہ فردگزاشت نہیں رکھتی۔ اس تنظیم کی کامیابی کا سہرا اس کے مخلص کارکنوں کے سر ہے جن میں امان اللہ خان جیسا محب وطن شخص شامل ہے اور پھر آپ ایک اہم رکن ہی نہیں اس تنظیم کے نائب صدر ہیں۔

جناب امان اللہ خان ۱۹۵۷ء میں اسی قصبے شنکیاری میں حاجی خوشحال خان کے خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی اور پھر خدمت کے جذبے کے تحت فوج کو اپنے لئے پسند کیا۔ عسکری خدمات کے ساتھ ساتھ سماجی اور ادبی سلسلے بھی جاری رکھے اور ان میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ جب آپ ایک شاعر کے روپ میں سامنے آئے تو غزل کو ترجیح دی۔

آپ کی شاعری خوشبو کے تعاقب میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ آپ تتلیوں کے پروں اور پھولوں کے رنگوں کے شاعر ہیں اور غزل میں ہر پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ جدائی اور وصل کے تذکرے اور امنگوں کی باتیں بھی آپ کی شاعری کا حصہ ہیں OOO

غزلیات

ساون رت کی آمد آمد گھر گلشن پھلواری ہے
تتلی پر کچھ خوف مگر پچھلی برسات کا جاری ہے

ہر اک جسم ردائے غم میں ساکن اور خاموش یہاں
تیرے ہجر نے کوچہ کوچہ کیسی برف اتاری ہے

ہر اک دوست نے ایک اک کر کے اپنی یادیں واپس کیں
دکھ یہ ہے کہ غم کی فائل سے خالی الماری ہے

کس کے آگے اپنے اجڑے گلشن کی روداد پڑھیں
سائیں سائیں چیرہ کے جنگل میں اک شور سا جاری ہے

جاڑے کی یخ دائیں اور گرمی کی دھوپ اسی کے نام
ایک برہنہ بچے میں جس شخص نے عمر گزاری ہے

☆

اُس کے لئے تو چپ بھی اک دشنام ہو گئی
وہ کم سخن جو شہر میں بدنام ہو گئی

اب میرا دل بھی گھر کی جگہ بے چراغ ہے
اک شمع آرزو تھی ترے نام ہو گئی

سرمایۂ حیات سمجھتا تھا جس کو میں
لپٹی بدن پہ یوں مرا احرام ہو گئی

مہکائے گی خیال کا گلشن تمام رات
جو بات آج تجھ سے سرِ شام ہو گئی

دیوانگی ہی رام کرے گی اسے اماں
عقل و خرد کی چال تو ناکام ہو گئی

☆

میجر محمد اسلم خان سیالوی

سیال شریف ضلع سرگودھا میں ایک معروف گاؤں ہے۔ جہاں سے علم و عرفان کے چشمے پھوٹے اور رشد و ہدایت کی ایسی شمعیں روشن ہوئیں جو آج تک ظلمت کے کونوں کھدروں تک روشنی پہنچا رہی ہیں۔ ان میٹھے اور شیریں چشموں سے روحانی تشنگی کو دور کرنے کے لئے لوگ دور دور کا سفر کر کے حاضر ہوتے ہیں۔ اس مقام پر حکمت و آگہی کے خزینے ہر لمحہ تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہاں سے ایک دنیا فیض حاصل کرتی ہے۔ پیر مہر علی شاہ صاحب جیسی عظیم ہستیاں یہاں ننگے پاؤں چل کر آنے میں فخر محسوس کرتی تھیں اور جب اس در سے فیضیاب ہوئیں تو ہر کہہ و مہہ کو اسلام کی عظمت سے روشناس کرایا۔ خواجگان سیال شریف کے معتقد اپنے نام کے ساتھ سیالوی کہلوانا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی سوچ پھر یہ ہو جاتی ہے ؎

دل میں عشقِ مصطفیٰؐ لب پر ثنائے مصطفیٰؐ
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی عطائے مصطفیٰؐ

ارمغانِ حمد ربِ ذوالمنن کے واسطے
نغمۂ صلِ علیٰ مختص برائے مصطفیٰؐ

میجر محمد اسلم خان سیالوی یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو ضلع سرگودھا کے اسی معروف گاؤں میں پیدا ہوئے فوج میں آئے تو آپ پوسٹ گریجوایٹ تھے۔ اسی بنا پر آپ کو ۳۰ جون ۱۹۸۰ء کو آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن دیا گیا۔ اور آپ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں عربی زبان کے انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ اسی دوران آپ نے قومی ادارہ برائے اللغۃ الجدیدہ اسلام آباد سے عربی زبان میں ترجمہ کا امتحان پاس کیا۔

آپ ایک صاحبِ طرز نعت گو شاعر ہیں۔ اور یہ بھی کسی وسیلے سے آقاؐ کی نظرِ کریم کا فیض ہے۔ کہ آپؐ نے انہیں اس کے لئے چن لیا۔ لیکن کبھی کبھار آپ کوئی نہ کوئی غزل بھی کہہ دیتے ہیں۔

آپ کے متعدد نثری اور شعری فن پارے صف اول کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی زبان فصاحت و سلاست کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ آپ کو الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے۔ آپ کا ایک ایک لفظ عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوتا ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

تھا کون اور کہاں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے　　اک رازِ کُن مکاں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

سربستہ سربسر تھے فطرت کے سب خزینے　　خالق بھی خود نہاں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

مسموم و پُر شرر تھا بعثت سے پہلے عالم　　ہر سو دھواں دھواں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

نجم الہدیٰؐ نے رستہ دکھلایا گمرہوں کو　　گم گشتہ کارواں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

شمس الضحیٰؐ کے دم سے ہر سو ہے نور ورنہ　　ظلمت کا سائباں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

اسلم عطا ہے ان کی شعر و سخن کی دولت
میں کس کا نغمہ خواں تھا خیر الوریٰؐ سے پہلے

غزل

اے اہلِ جفا داغ نیا ڈھونڈ رہا ہوں　　میں گھر میں جلانے کو دیا ڈھونڈ رہا ہوں

اس جھوٹ کی نگری میں مجھے سچ کی طلب ہے　　گویا کہ اندھیروں میں ضیاء ڈھونڈ رہا ہوں

دہلیز کے اُس پار کوئی آکے رکا ہے　　آہٹ پہ دھرے کان صدا ڈھونڈ رہا ہوں

کس کس نے رنگے ہاتھ مرے خون جگر سے　　مقتل میں کھڑا خونِ بہا ڈھونڈ رہا ہوں

وہ شہر کہ جس شہر میں مرنا بھی گراں ہو　　اس شہر میں جینے کی ادا ڈھونڈ رہا ہوں

کیا میری ہی قسمت میں رقم فصلِ خزاں تھی　　تقدیر کے کاتب کا لکھا ڈھونڈ رہا ہوں

عنوان بنے جو کہ مضامین جنوں کا
اسلم میں وہی حرفِ وفا ڈھونڈ رہا ہوں

میجر خورشید زمان

پروفیسر ہارون رشید تبسم کی کتاب "اے وطن کے سجیلے جوانو" جب شائع ہوئی تو مجھے بھی ایک اعزازی کاپی ملی۔ کئی اور نئے ناموں کے ساتھ "خورشید زمان" کا نام بھی میرے لئے نیا تھا۔ نظم جو کتاب کے لئے منتخب تھی۔ بڑی ہی پیاری لگی ؂

اک ضرب سے دشمن کی کمر توڑنے والے
بپھرے ہوئے طوفانوں کا رخ موڑنے والے
اور شوقِ شہادت میں وطن چھوڑنے والے
ایماں سے سدا رشتۂ جاں جوڑنے والے
یہ ملک کی سرحد کے محافظ ہیں امیں ہیں
آئے جو قضا لینے کو یہ خندہ جبیں ہیں

جناب تبسم بھی ان کے بارے کچھ نہیں جانتے تھے۔ تلاش کرنے پر ان کی کئی نظمیں اور غزلیں بھی مجھے مل گئیں اور تعارف بھی۔ ہاں البتہ خورشید زمان نامی دو شخصیات سے واسطہ پڑا۔ ایک انجینئرز کور سے اور دوسرے آرٹلری سے۔ لیکن آرٹلری والے دل پر ثبت ہوگئے جب یہ اشعار میری نظر سے گزرے۔ ؂

عزت و اقبال سے قائم رہے گی آبرو
توپ اپنی ماں ہے یارو دیں گے ہم اس کو لہو
آؤ سب مل کر کریں ہم توپخانے کو سلام
کٹ مرا جو راہِ حق میں پائے گا اونچا مقام

یقین ہوگیا کہ موصوف توپخانے والے خورشید زمان ہیں۔ جو اپنی خدمات اور فرائض سے وفاداری کا اظہار لہو دینے کے عہد سے کر رہے ہیں۔ لہو دینے کا یہ عہد اور اور ماں کی عزت و اقبال کو قائم و برقرار رکھنے کے یہ پیمان صرف زبانی نہیں بلکہ توپ کے فائرنگ بٹن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ عہد ہے۔ آپ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد وطن کی حرمت و عظمت کو مثلِ شمس و قمر رکھنے کے سچے وعدے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے۔ ؂

یہ خون کی سرخی سے تری مانگ بھریں گے
بیٹے ترے جاں تجھ پہ سدا دیتے رہیں گے
جب ہوگی ضرورت تجھے یہ جان بھی دیں گے
تو نام سے منسوب ہے جن کے وہ جری ہیں

فوج میں آگئے اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی سے آرٹلری میں کمشن حاصل کر کے تن من سے وطنِ عزیز کی خدمت میں جُٹ گئے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جذب و شوق اور محبت و عقیدت کا یہ پودا جوان ہوتا جارہا ہے اور اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔

جناب خورشید زمان غزل بھی بڑی پیاری کہتے ہیں۔ وطن کے حوالے سے تو آپ کے اشعار دیکھ ہی لئے ہیں۔ آیئے دو غزلیں دیکھیں۔ ○○○

غزلیں

گو کہ منزل تک پہنچنا بھی کوئی مشکل نہ تھا ۔۔۔ راستے کی سختیوں کا دل مگر قائل نہ تھا

حادثے ایسے بھی گزرے کشتیٔ جاں پہ مری ۔۔۔ میں بھنور سے لڑ رہا تھا دور تک ساحل نہ تھا

یہ مرا عزمِ سفر تھا یا مری دیوانگی ۔۔۔ سامنے منزل تھی پر میں جانبِ منزل نہ تھا

گوشۂ زنداں میں ہوتی کیسے آزادی کی لو ۔۔۔ سب ہی دل تاریک تھے کوئی بھی روشن دل نہ تھا

بستیاں سب لے گیا بے چین موجوں کا جنوں ۔۔۔ پھر بھی موجوں کو نجانے کیوں سکوں حاصل نہ تھا

یہ بھی منظر ہم نے دیکھا کوچۂ قاتل میں آج ۔۔۔ سربریدہ تو سبھی تھے کوئی بھی قاتل نہ تھا

جب بھی دی خورشید تو نے اس کی رحمت کو صدا
کشتِ ویراں اس نے سینچی جب کوئی بادل نہ تھا

وہ روٹھ جاتا ہے لیکن خفا نہیں لگتا ۔۔۔ کہ اس کا روٹھ بھی جانا بُرا نہیں لگتا

چمک چمک کے ستارے تو تھک بھی جاتے ہیں ۔۔۔ مگر یہ سوچ کا جگنو تھکا نہیں لگتا

ہوا ہوں لذتِ غم سے میں آشنا اتنا ۔۔۔ کوئی بھی درد ہو مجھ کو کڑا نہیں لگتا

ہے شب کے بعد بھی کچھ کچھ فضا میں تاریکی ۔۔۔ مجھے سحر کا یہ منظر بھلا نہیں لگتا

ہر ایک پھول کے دامن میں خار لپٹے ہیں ۔۔۔ خوشی کا راستہ غم سے جدا نہیں لگتا

دل و نگاہ کی ٹھنڈک وہ درد و غم کی بہار ۔۔۔ بتاؤں تم کو میں کیسے وہ کیا نہیں لگتا

عجیب شخص ہے خورشید جو ملے تو خوشی
مگر نہ ملنا بھی جس کا سزا نہیں لگتا

★

میجر بلال اصغر

جی ہاں ۔۔۔ محبت کی بھی درجہ بندیاں ہوتی ہیں ۔ بلکہ کی جا سکتی ہیں ۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم ۔ یہ سلسلہ ہائے کم و بیش ہیں کہ جاری و ساری رہتے ہیں ۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فوج میں رہتے ہوئے تربیت کچھ اس طریقے سے کی جاتی ہے کہ ماں اور دھرتی سے محبت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور یہی وہ ادا ہے جو سود و زیاں کے تمام اندیشے مٹا کر موت کو گلے لگانے کا اسلوب سکھا دیتی ہے ۔ جناب بلال اصغر فوج کے ایک ایسے ہی جوان ہیں جو اس پاک پوتر دھرتی کی چاہت اور خواہش میں اس مقام تک جا پہنچے ہیں جہاں ماں کی گود میں سر چھپانے کو جی چاہتا ہے ۔

میجر بلال اصغر ۱۶ جون ۱۹۶۱ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے آباؤ اجداد مغلوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہے ہیں ۔ یعنی اسلحہ بنا کر فوج کو سپلائی کیا کرتے تھے اور ان کی بنائی ہوئی کمانیں خاص طور پر بڑی دور دور تک مشہور تھیں ۔

جناب بلال اصغر نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ، نارووال اور اٹک سے حاصل کی ۔ پھر گورنمنٹ کالج جہلم میں داخلہ لے لیا ۔ جہاں آپ کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں ۔ شاعری کی ابتداء میٹرک کے دوران ہو چکی تھی ۔ کالج میں آ کر افسانہ نگاری بھی شروع کر دی ۔ جمعیت طلبہ اسلام کے اہم رکن اور پھر عہدیدار رہے ۔ یہیں سے اخبارات اور رسائل میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ادبی ذوق کو فروغ ملا ۔ بالآخر خواہشوں اور ارمانوں کو دامن میں سمیٹے فوج میں آ گئے اور مارچ ۱۹۸۳ء کو آرٹلری کور میں کمشن حاصل کیا ۔ فوجی زندگی کی مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے تعلق قائم ہے ۔ اس ذوق کو سنبھالا ہوا ہے اور دو جہتوں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے واضح کرتے ہوئے قریب تر کر رہے ہیں ۔ آپ اپنی تمنائیں بڑے بھولپن سے بولی بولی کہہ دیتے ہیں ۔ نظم آپ بہت پیاری لکھتے ہیں لیکن غزل میں بھی پیچھے نہیں ۔ ○○○

میجر بلال اصغر

جی ہاں ۔۔۔ محبت کی بھی درجہ بندیاں ہوتی ہیں ۔ بلکہ کی جا سکتی ہیں ۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم ۔ یہ سلسلہ ہائے کم و بیش ہیں کہ جاری و ساری رہتے ہیں ۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فوج میں رہتے ہوئے تربیت کچھ اس طریقے سے کی جاتی ہے کہ ماں اور دھرتی سے محبت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور یہی وہ ادا ہے جو سود و زیاں کے تمام اندیشے مٹا کر موت کو گلے لگانے کا اُسلوب سکھا دیتی ہے ۔ جناب بلال اصغر فوج کے ایک ایسے ہی جوان ہیں جو اس پاک پوتّر دھرتی کی چاہت اور خواہش میں اس مقام تک جا پہنچے ہیں جہاں ماں کی گود میں سر چھپانے کو جی چاہتا ہے ۔

میجر بلال اصغر ۱۶ جون ۱۹۶۱ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے آباؤ اجداد مغلوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہے ہیں ۔ یعنی اسلحہ بنا کر فوج کو سپلائی کیا کرتے تھے اور ان کی بنائی ہوئی کمانیں خاص طور پر بڑی دور دور تک مشہور تھیں ۔

جناب بلال اصغر نے ابتدائی تعلیم جڑانوالہ، نارووال اور اٹک سے حاصل کی ۔ پھر گورنمنٹ کالج جہلم میں داخلہ لے لیا ۔ جہاں آپ کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئی ۔ شاعری کی ابتداء میٹرک کے دوران ہو چکی تھی ۔ کالج میں آکر افسانہ نگاری بھی شروع کر دی ۔ جمعیت طلبہ اسلام کے اہم رکن اور پھر عہدیدار رہے ۔ یہیں سے اخبارات اور رسائل میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور اَدبی ذوق کو فروغ ملا ۔ بالآخر خواہشوں اور ارمانوں کو دامن میں سمیٹے فوج میں آ گئے اور مارچ ۱۹۸۳ء کو آرٹلری کور میں کمشن حاصل کیا ۔ فوجی زندگی کی مصروفیات کے باوجود شعر و اَدب سے تعلق قائم ہے ۔ اس ذوق کو سنبھالا ہوا ہے اور دو جہتوں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے واضح کرتے ہوئے قریب تر کر رہے ہیں ۔ آپ اپنی تمنائیں بڑے بھولپن سے ہولی ہولی کہہ دیتے ہیں ۔ نظم آپ بہت پیاری لکھتے ہیں لیکن غزل میں بھی پیچھے نہیں ۔ ○○○

غزلیں

گھونسلے ٹوٹ گئے پھول بھی سب بکھرے ہیں — رات بھر زرد ہواؤں نے شجر نوچے ہیں
پاس لپٹی ہوئی فصلوں کو تو پیاسا رکھیں — کیسے دریا ہیں کہ اپنی ہی طرف بہتے ہیں
ہاتھ کا لمس تو ہے پھل کا مقدر اے دوست — ٹہنیوں کے تو نصیبوں میں فقط ڈھیلے ہیں
ہاتھ ملتا ہی نہیں کھینچنے والا ان کو — حوصلے کب سے کمانوں میں تنے بیٹھے ہیں
منتظر ہوں کہ کوئی چیخ پکارے مجھ کو — ہر گھڑی پاؤں رکابوں میں دھرے بیٹھے ہیں

اب کوئی صور ہی پھونکوں کہ اذاں کیا ہوگی
شہر والے تو عقیدوں پہ جھگڑ بیٹھے ہیں

جانے کیا چوپالوں سے سرگوشی سن آئے ہیں — سارے بچے ماؤں کے سینوں سے آ لپٹے ہیں
اندھیارا تو جگنو بن کر در تک چھوڑ گیا ہے — شام گئے گھر آنے پر دروازے بند ملے ہیں
لوگوں نے بھی شہر پناہ کی درزیں اب دیکھی ہیں — دشمن کے گھوڑے جب دیواروں تک آ پہنچے ہیں
اپنی پوریں پانی میں گاڑوں تو یوں لگتا ہے — دھیرے دھیرے بہتے دریا سازش سوچ رہے ہیں

بارش برس کے دریاؤں کو اونچا کر جاتی ہے
بستی کے سب اندھے کنوئیں پیاسے رہ جاتے ہیں

میجر محمد اعظم اختر (اعظم کمالوی)

محمد اعظم اختر جو اعظم کمالوی کے ادبی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ۲۹ جون ۱۹۵۹ء کو کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پیدا ہوئے۔ اگر میں علم نجوم کا ماہر ہوتا تو یہی کہتا کہ آپ جس گھڑی پیدا ہوئے آپ کا ستارہ اس وقت آپ کے لئے رفعتوں کا پیغام لئے کہیں عروج پر کھڑا مسکرا (دمک) رہا تھا۔ کیونکہ جس دن آپ پیدا ہوئے وہ عیدالضحیٰ کا مبارک دن اور صبح کا شبھ لمحہ تھا۔ آپ کے والد چوہدری محمد علی اپنی برادری کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔

محمد اعظم اختر نے ابتدائی تعلیم تلمبہ ضلع خانیوال سے حاصل کی۔ سیکنڈری سکول سرٹیفکیٹ گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول کمالیہ سے حاصل کیا۔ اور کمالیہ کالج سے ہوتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ کچھ عرصہ گھر پر گزارا اور پھر فوج میں آگئے۔ ۱۰ جون ۱۹۸۳ء کو آفیسرز ٹریننگ سکول منگلا سے آرٹلری میں کمشن پایا۔ اور ایک مایہ ناز یونٹ " بجلی توپخانہ " سے بحیثیت سیکنڈ لیفٹننٹ اپنی عسکری زندگی کا آغاز کیا۔

جناب اعظم کمالوی کو طالب علمی کے دور سے ہی لکھنے کا چسکا تھا۔ میرے خیال میں تلمبہ کے ادبی ماحول نے آپ کے ذہن میں یہ بیج بوئے ہوں گے جواب پھل دے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اس شوق کی ابتدا بچوں کے رسائل میں لکھنے سے کی۔ بعد ازاں دوسرے جرائد اور اخبارات میں لکھنے لگے۔ ایک مدت سے نثر اور نظم دونوں سے انصاف کر رہے ہیں یہ الگ بات ہے کہ آپ مطمئن نہیں۔ کراچی کے قیام کے دوران آپ نے ڈرامہ کی طرف توجہ دی اور چند ایک ڈرامہ کراچی ٹیلی ویژن سے نشر بھی ہوئے۔

آپ سے میری ملاقات جب کوئٹہ میں ہوئی تھی تو آپ پی ٹی وی کوئٹہ مرکز کے لئے کسی سیریل کے لکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ واللہ اعلم اجازت ملی یا نہیں۔

شعر و سخن میں آپ نے آزاد نظم زیادہ لکھی ہے۔ اور گیت سے آپ کو ایک خاص لگاؤ ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ " ساحل کی بھیگی ریت پر " ہے۔ جس نے آپ کو شعر و سخن کی محفلوں میں متعارف کرانا ہے۔ آپ کی شاعری میں کچھ محبت کے قصے، کچھ محرومیوں کا ذکر اور کچھ ماضی کی یادیں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ آپ نے اپنی ہی زندگی کو منظوم کیا ہے۔ دریچوں سے باہر جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ٭٭٭

گیت

کبھی بیتے دنوں کی خوشبو جب مرے آنگن میں آجاتی ہے
تو بوہت مجھے تڑپاتی ہے--- بے چین مجھے کر جاتی ہے
جب دیر گئے تک راتوں کو ہم چاند سے کھیلا کرتے تھے
اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم باہم جھگڑا کرتے تھے
اب یاد ان چاندنی راتوں کی--- پھر دل کو مرے تڑپاتی ہے
بے چین مجھے کر جاتی ہے
وہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر نت ملنا نئے بہانے سے
وہ آدھی بات کا رہ جانا کسی اور کے پھر آجانے سے
اب یاد ان پیاسے لمحوں کی--- پھر دل کو مرے تڑپاتی ہے
بے چین مجھے کر جاتی ہے
وہ تیرے پیارے پیارے خط جو میرے نام سے آتے تھے
اس دل کے سونے صحرا میں خوشیوں کے پھول کھلاتے تھے
اب یاد ان سوہنے وقتوں کی-- پھر دل کو مرے تڑپاتی ہے
بے چین مجھے کر جاتی ہے
تو پہن کے آج سوہا جوڑا جب پیا کے گھر جا بیٹھی ہے
اور بچپن کی معصوم سی ہر اک یاد کو ٹھکرا بیٹھی ہے
ہر بات تری دستوری سی--- اب بہت مجھے تڑپاتی ہے
بے چین مجھے کر جاتی ہے
کبھی بیتے دنوں کی خوشبو جب مرے آنگن میں آجاتی ہے
تو بوہت مجھے تڑپاتی ہے----
بے چین مجھے کر جاتی ہے

سکواڈرن لیڈر سید اشفاق نقوی

اُردو ادب کی ایک جانی پہچانی شخصیت، جنہیں دیکھ کر یا ان کی تحریریں پڑھ کر آدمی تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ اس سراپا ادب کو کس پہلو سے فوجی لکھا یا بتایا جائے۔ ایئر فورس کے اس شگفتہ، ہنس مکھ، رعنا اور تازہ چہرے پر سختی کی کوئی شکن دکھائی نہیں دیتی بلکہ نرم و نفیس سلوٹیں نظر آتی ہیں۔

جناب سید اشفاق حسین نقوی کو آج ہر اُردو دان طبقہ جانتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ آپ نے سکول کے زمانے سے شعر کہنا شروع کئے۔ دوسرے لفظوں میں آپ پیدائشی شاعر ہیں یہ ایک خداداد صلاحیت تھی۔ جسے آپ نے استعمال کیا اور بہر حال ضائع ہونے سے ہر صورت محفوظ رکھا۔ آپ نے اردو اور پنجابی زبان میں ساتھ ساتھ شاعری شروع کی۔ اردو میں آنسو اور پنجابی میں پریمی تخلص کیا۔ کالج میں آئے تو فکر و خیال میں نیا پن آیا اور مختلف رسائل میں چھپنے لگے۔ جن میں "رادی" "احسان" اور "شہباز" وغیرہ شامل ہیں۔ شعر و سخن اور تعلیم دونوں کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ۔۔۔ آپ نے ایئر فورس جوائن کر لی۔ یہاں سرکاری فرائض کے علاوہ ادب کی خدمت کا بھی خوب موقع ملا جسے آپ نے جاری رکھا۔ لیکن اب کے بار آپ نے شعر کی نسبت نثر کو زیادہ وقت دیا۔ اب آپ نے فوجی رسائل کو بھی اپنی تحریروں سے نوازا اور اہلِ ذوق کو محظوظ کرنے کے علاوہ نئی سوچ بھی دی۔

سکواڈرن لیڈر سید اشفاق نقوی کی شاعری ہمارے اِرد گرد اس دھرتی پر جا بجا پھیلے ہوئے مسائل اور الجھنوں سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جذباتی سطح پر آپ کی شاعری ایک بچے کی مانند ہے جو خاموش جذبوں کی ترجمان بھی ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ آپ نے اشفاق تخلص کے تحت جو کہا ہے اس میں دل کی بات بڑے مدھم لہجے میں سامنے لائی ہے۔ آپ کے الفاظ ایک آئینے کی صورت ہیں جن میں جگہ جگہ اجتماعی دکھوں کا عکس جھلملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ OOO

غزل

فسانے لاکھ ہوں غم کی کہانی اور ہوتی ہے — حدیثِ دردِ دل کی ترجمانی اور ہوتی ہے
زبانِ شوق کی ہوتی ہے رنگیں داستاں لیکن — کسی خوش رُو کے لب کی خوش بیانی اور ہوتی ہے
سنا سکتی نہیں ہے داستاں مجبور ہے بلبل — زباں والوں کی لیکن بے زبانی اور ہوتی ہے
اگرچہ دل نشیں ہے عاشقوں کی سخت جانی بھی — مگر اے دوست مرگِ ناگہانی اور ہوتی ہے

کہانی سنتے رہتے ہو کہانی تو سنی ہو گی
مگر اشفاق جیسوں کی کہانی اور ہوتی ہے

منزلیں گر ہیں نہاں چلتے چلو — آ ہی جائے گا مکاں چلتے چلو
راستہ دشوار بھی گر ہے تو کیا — عزم اپنا ہے جواں چلتے چلو
مڑ کے نہ دیکھو کسی امید پر — کون ہے اپنا یہاں چلتے چلو
گر کے اٹھ جاؤ عمل کی راہ میں — لے کے عظمت کے نشاں چلتے چلو
ہے عبث گر وقت پر پہنچے نہ ہم — جل نہ جائے آشیاں چلتے چلو
منزلوں کا راستہ تھوڑا سا ہے — کچھ نہیں ہے درمیاں چلتے چلو
تھے کبھی ان راستوں پر آدمی — گرگ ہیں اب تو نہاں چلتے چلو

تیز تر اشفاق باصد احتیاط
تاک میں ہیں آندھیاں چلتے چلو

★

سکواڈرن لیڈر کنور نسیم

علی گڑھ کو تحریکِ پاکستان میں ایک روشن مقام حاصل ہے۔ یہاں سر سید احمد خاں نے ایک سکول کی بنیاد رکھی جو ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی بن گئی۔ یہاں سے بہت سے ایسے مسلم لیڈر نکلے جنہوں نے قسمتوں کے فیصلے کئے۔ یہیں پر ایک نجیب الطرفین راجپوتوں کے معزز شخص راؤ خورشید علی خاں کے گھر یکم جون ۱۹۳۹ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام کنور ارشاد احمد رکھا گیا۔ لیکن بعد میں یہ کنور نسیم کے نام سے پہچانا جانے لگا۔

جناب کنور نسیم نے ابھی سکول جانا شروع ہی کیا تھا کہ ہند کی تقسیم ہو گئی اور آپ نے ۱۹۴۷ء میں والدین کے ہمراہ پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ یوں ابتدائی تعلیم جو علی گڑھ سے شروع ہوئی تھی مظفر گڑھ آ کر پوری کی۔ اور پھر ایمرسن کالج ملتان سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۰ میں آپ نے پاک فضائیہ میں کمشن پایا۔ اور تعلیم کے سلسلے کو پھر سے جوڑا۔ ایم اے (اردو) کیا۔ ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں لاہور اور ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کلر کہار کے مقام پر دشمن کے خلاف حصہ لیا۔ سروس کے دوران ہی امریکہ سے ایجوکیشن میں ڈپلومہ لیا۔ اور تیس سال پاک فضائیہ سے وابستہ رہنے کے بعد یکم جون ۱۹۹۰ء کے سکوارڈن لیڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

آپ کو لکھنے کا شوق کالج کے زمانے سے تھا اس دور میں آپ کالج میگزین کے لیے لکھتے تھے۔ اردو اور فارسی ہر دو زبانوں پر آپ کو مکمل عبور ہے اور دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ انگریزی پر بھی آپ کو خوب دسترس ہے۔ اردو شاعری میں آپ کا مجموعۂ کلام "زنجیرِ حنا" کے نام سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ "غزل میں آپ نے اپنی ہی دھرتی کے رہنے والوں کے ساتھ پیار کا مخلصانہ اظہار کیا ہے۔ جو دلپذیر بھی ہے۔ تصنع سے پاک بھی اور تکلف سے بے نیاز بھی"۔ "نظم میں نیچرل، ملی اور اسلامی شاعری کی قوسِ قزح کے رنگ نمایاں ہیں"۔ OOO

حمد

آنکھوں میں کس کی دید کی اس درجہ پیاس ہے
دل میں یہ کس کے عشق کی ایسی بھڑاس ہے

اے ربِ کائنات گنہگار میں سہی
پھر بھی نہ کوئی فکر نہ خوف و ہراس ہے

ق

بڑھ کر ہے ماں کے پیار سے گر تیرا پیار تو
ماں کی محبتوں سے یہ دل روشناس ہے

مانا کہ دور ہے مری نظروں سے تو مگر
پھر بھی مرے قریب ہے تو میرے پاس ہے

ہر عیب سے ہے پاک تری ذات اے خدا
ہم میں ہزار عیب ہیں، تیری ہی آس ہے

ہر کیفیت سے دل کی مرے باخبر ہے تو
تیری ہی دسترس میں مرا ہر قیاس ہے

یہ لطفِ بندگی ہے کہ رکھتا ہے مطمئن
دل میں نہ کوئی رنج، نہ چہرہ اداس ہے

غزل

یہ شخص بھی صوفی و قلندر کی طرح ہے
شاعر ہے کہ باہر سے بھی اندر کی طرح ہے

جس بات کا مطلق تمہیں احساس نہیں ہے
وہ بات مرے قلب میں خنجر کی طرح ہے

شعروں میں تراشے ہے صنم نوکِ قلم سے
شاعر کا قلم تیشۂ آذر کی طرح ہے

اک تیرا تبسم ہے کہ بجلی سی گرائے
اک تیرا تکلم ہے کہ منتر کی طرح ہے

پھولوں کی طرح نرم ہے نازک ہے حسیں ہے
سینے میں مگر دل ہے کہ پتھر کی طرح ہے

خادم ہے نسیم آپ کا اے جانِ تمنا
لگتا تو مگر دیکھئے افسر کی طرح ہے

★

سکواڈرن لیڈر سید محمد عبدالعلی (عبدالعلی شوکت)

خاندانی نام سید محمد عبدالعلی لیکن ادبی حلقوں میں عبدالعلی شوکت کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام سید شاہ محمد تھا۔ جو اسلامیہ ہائی سکول جالندھر کے "منیٔ پردٔنے" استاد تھے۔ جناب عبدالعلی شوکت ۳۱ مارچ ۱۹۲۳ء کو جالندھر شہر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم اسلامیہ ہائی سکول جالندھر میں حاصل کی۔ ان دنوں مسلمانوں کا وہاں کوئی کالج نہ تھا چنانچہ ڈی اے وی کالج جالندھر سے بی اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں جنرل ہیڈ کوارٹر نئی دہلی سے بطور کلرک عملی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن ایک سال بعد اسے چھوڑ کر انڈین ریزرو کور کی ایک یونٹ میں سویلین سکول ٹیچر مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۷ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک روزنامہ آزاد لاہور میں بطور نیوز ایڈیٹر ملازمت کی۔ کچھ عرصہ روزنامہ "الحجاز" لاہور کے چیف ایڈیٹر رہے۔ جہاں اداریہ میں شذرات و نکاتِ یہ کالم بھی لکھتے رہے۔ ۳۱ مئی ۱۹۴۸ء کو پاک فضائیہ میں فلائیٹ سار جنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ چند برس بعد وارنٹ آفیسر بنا دیئے گئے۔ اسی عرصہ میں آپ نے پشاور یونیورسٹی سے ایم اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے جرنلزم میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو فلائنگ آفیسر کے عہدے پر آپ کو کمیشن ملا اور بطور ماہرِ نفسیات (سائیکلوجسٹ) تقرری ہوئی۔ ملازمت کا زیادہ عرصہ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ کوہاٹ میں گزارا۔ ۱۹۸۴ء میں جبکہ آپ پی اے ایف انفارمیشن و سلیکشن سنٹر لاہور میں تھے، ریٹائر ہو گئے۔

ابھی آپ میٹرک کے طالب علم تھے کہ شاعری کا ذوق اثر دکھانے لگا۔ جنگِ عظیم دوم کے اوائل میں تحریکِ آزادیٔ ہند سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ علامہ اقبالؒ، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے ترقی پسندانہ خیالات سے آپ کافی متاثر ہوئے۔ اسی لیے ہمیشہ جبر، گھٹن اور آمریت کے خلاف نظمیں لکھیں۔ آپ نے غزلوں میں بھی اسی ضمن کی علامتی شاعری کی ہے۔

آپ کی تحریریں اردو کے عظیم ادبی پرچوں "تخلیق"، "ماہِ نو"، "غنیمت" وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ "لرزاں ساعتیں" آپ کا خوبصورت مجموعہ کلام ہے۔ ○○○

غزلیں

ذہن کی بنجر زمیں میں کچھ نمی کی ہے تلاش
زیست کے صحرائے اعظم میں خوشی کی ہے تلاش

برق رفتاری نے ٹیڑھا سب توازن کر دیا
زندگی کو آج آہستہ روی کی ہے تلاش

کس نے چھینا کوہ و دشت و در سے نور آفتاب
سب گھروں کی تیرگی کو روشنی کی ہے تلاش

میری خوشیاں میرے احساسات سے وابستہ ہیں
میرے احساسِ محبت کو کسی کی ہے تلاش

کچھ کنائے کچھ اشارے ہیں زباں کے ترجماں
کچھ سمجھ میں آگئی کچھ اُن کہی کی ہے تلاش

دونوں جانب فاصلوں کی وسعتیں مٹتی ہوئی
خواہشوں کے پل پہ ان سے دوستی کی ہے تلاش

مشکلاتِ ربط باہم کا سرا ملتا نہیں
قوم کو زنجیر کی ٹوٹی کڑی کی ہے تلاش

وقت کا شوکت سنو بے عیب سادہ سا سوال
آدمی ہو آدمیت کی کبھی کی ہے تلاش

پتھر نما لگی ہے کبھی دوستی کی آنکھ
حیرت سے پڑھ رہا ہوں میں اک اجنبی کی آنکھ

کچھ پل محبتوں کے اجالے ہوئے تو تھے
جب وہ گیا تو ساتھ گئی روشنی کی آنکھ

بنتے ہیں لوگ مدح و ستائش کے دائرے
اندھی رُتوں میں ڈوب گئی برتری کی آنکھ

ہم ہی میں کچھ عیوب نمایاں تھے اس لئے
برداشت کر گئے ہیں تری بے رخی کی آنکھ

خوف و ہراس ذہن کی میراث بن گئے
کس نے بجھائی بستے گھروں زندگی کی آنکھ

منظوم کر رہا ہوں نگینے خیال کے
چنتا ہوں شعر جیسے کسی جوہری کی آنکھ

شوکت سبھی بدن ہیں کسی خوف سے تپاں
وا کر رہا ہے مہر ستم دشمنی کی آنکھ

سکواڈرن لیڈر عبدالعزیز

"ذوقِ آگہی" ٹیلی ویژن کا مقبول و معروف پروگرام جو بڑی کامیابی سے ایک عرصے تک چلتا رہا۔ اور ناظرین کے ذہنوں کو معلومات کا ایک خزانہ سونپتا رہا۔ اس کے بارے تو لوگوں کو علم ہے۔ لیکن یہاں میں جس "ذوقِ آگہی" کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ پاک فضائیہ کے سکولوں اور کالجوں کا ایک مرکزی مجلہ ہے۔ عام شہریوں کے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے جس طرح ادبی جرائد اور رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح افواجِ پاکستان بھی اپنے جوانوں کے ذہنی ارتقا اور ادبی ذوق کے فروغ کے لئے اردو اور انگریزی زبان میں بے شمار رسالے شائع کرتی ہیں۔ صرف جوانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے ماتحت جتنے بھی سکولز اور کالجز ہیں۔ ان کے طلبا کو بھی اس طرف راغب کرنے کے لئے بہت کام ہو رہا ہے۔

"ذوقِ آگہی" ایک ایسا ہی مجلہ ہے۔ میں اس کے گیٹ اپ، خوبصورتی اور مواد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اور دل سے اس کی ترقی کی دعا نکلی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا کریڈٹ اس کے ایڈیٹر کو جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میدانِ جنگ میں جان تو سپاہی کی جاتی ہے لیکن نام کمانڈر کا ہوتا ہے۔ اور یہ حسین کارکردگی اور پیشکش ہے جناب سکواڈرن لیڈر عبدالعزیز کی۔ جنہوں نے اس میگزین میں شامل تحریروں کی نوک پلک ہی درست نہیں کی اسے خوبصورت بنا کر خوبصورت انداز میں پیش بھی کیا۔

سکواڈرن لیڈر عبدالعزیز ایک عمدہ شاعر اور بہترین نثر نگار بھی ہیں۔ شاعری میں آپ عزیز ہی تخلص کرتے ہیں۔ آپ جہاں اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہاں انگریزی ادب بھی آپ کی نگارشات سے محروم نہیں۔ آپ اردو شاعری میں نظم کہنے میں عافیت سمجھتے ہیں اور دل کی روداد بآسانی کہہ دیتے ہیں لیکن غزل بھی آپ بھرپور کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب آپ کے ذہن و قلب پر کوئی عمدہ خیال، گہرا مشاہدہ اور عمیق تجربہ انکشاف کرتا ہے تو اپنے اظہار کے لئے لفظی پیکر تراشتے ہیں ؎

پھر ندا آئی خیمہ دل سے
سر پر آئی ہے کربلا جاگو

شب یلدا نگل گئی مجھ کو
مجھ سے کہتا رہا خدا جاگو

OOO

طفلِ مکتب کا دکھ

مجھے میری معصوم بیٹی نے پوچھا
کہ ابو
مجھے بھی
نماز تہجد کا پڑھنا سکھائیں
مجھے اس نے پوچھا
زبورِ عجم کے معانی بتائیں
اسے اپنے دادا کی اقبال بینی سے رغبت بہت ہے
اسے میں نے اکثر کہا ہے
تو بیٹی نہیں
میری بانگ درا ہے
وہی پیاری معصوم کمسن کلی
آج مکتب سے آئی
تو آزردہ جاں تھی
رواں چشمِ پُرنم سے اشکوں کے دھارے
بہت مضطرب تھی
اسے آج مکتب سے
اک دردِ پنہاں کا تحفہ ملا تھا
اسے میں نے پوچھا
نماز تہجد۔۔۔ زبورِ عجم اور اقبال۔۔۔ بانگِ درا؟
چاند بیٹی
یہ سب کیا ہوا؟
اُس نے مجھ سے کہا
سے ابو
دیانت، امانت، ذہانت، یہ مکتب
فریبِ یقیں ہے
جہاں ملتا درسِ خودی یہ وہ مکتب نہیں ہے
مجھے میرے دادا سے کہہ کر
زبورِ عجم اور نمازِ تہجد کا رسیا
کوئی اک معلم تو لا دیں
ذرا میرے مکتب میں جا کر تو دیکھیں
ذہانت کی جو درجہ بندی ہوئی ہے
دیانت، امانت کا جو درس مجھ کو ملا ہے
وہ اقبال بینوں کو جا کر بتا دیں
مجھے پھر سکھا دیں
نماز تہجد کا پڑھنا
زبورِ عجم کے معانی

☆☆

سکواڈرن لیڈر عثمان خاور

غالباً ۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ایک مشاعرے میں عثمان خاور کو سننے کا موقع ملا۔ شعر اور پڑھنے کے انداز نے مل کر ایک سماں باندھ دیا تھا۔ اس پر پڑھنے والے کی شخصیت مزید بر آں کہ دو بھائی اس مشاعرے میں اپنے کلام کا جادو جگا رہے تھے۔دوسرے تھے سلمان باسط۔

اس کے آٹھ سال بعد کوئٹہ جانا ہوا تو ایئر فورس بیس پر لائبریرین سے ملاقات ہوئی تو اس نے عثمان خاور کا تعارف سکواڈرن لیڈر اور شاعر کی حیثیت سے کروایا۔ لیکن یہ غائبانہ تعارف تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ عثمان خاور ٹی وی پروڈیوسر ایوب خاور کے بیٹے ہیں۔میں نے جب دونوں کی عمروں کا سنِ پیدائش کو سامنے رکھتے ہوئے حساب لگایا تو اتنا فرق تھا کہ اتنی کم عمری میں شادی اور پھر بیٹے کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ بہر حال یہ تو بر سرِ راہے بات آگئی۔

جناب عثمان خاور ۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری کے حصول کے بعد ایئر فورس میں کمشن پایا۔

پروفیسر اجمل صدیقی آپ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "عثمان خاور فن میں ہئیت پر مواد کو ترجیح دیتے ہیں ۔ تاہم ہئیت کے تقاضوں کو بھی خوش اسلوبی سے پورا کرتے ہیں۔اور شعر کے حسن کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ان کے اشعار میں شاعر کا وژن اور اس کا فنی کمال ایک ہی سطح پر کار فرما نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں انسان دوستی کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔وہ اپنی ذات، عقیدے، حبِ وطن، سائنسی اور فنی ارتقار ۔ امن اور جنگ، تہذیب او زبان ۔ سب کو انسانی رشتوں کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ان کا اندازِ بیان دھیما، بے خروش اور دلنشین ہے۔اس میں فکر کی گہرائی، جذبے کی سچائی اور زبان کی رعنائی ملتی ہے۔"

اجمل صدیقی کی اس تحریر کی سچائی کے لئے تو ہمیں عثمان خاور کی کتاب "جھیل میں کنکر" دیکھنی پڑے گی۔ آیئے فی الحال ان کے کلام کا نمونہ دیکھئے اور اندازہ لگایئے۔ ○○○

غزلیں

گلاب اور یاسمن کی صورت مرے چمن میں کھلا کرو گے
جو کھو گئے تم تو لفظ بن کر مرے لبوں پر رہا کرو گے

دکھوں کے جنگل میں پھرتے پھرتے عجیب گزریں گے دن ہمارے
اداس راتوں کی خاموشی میں تم اپنے آنسو پیا کرو گے

گزرتے لمحوں کی تیز آندھی ہر ایک منظر بگاڑ دے گی
بہار رت جب گزر چکے گی تو خشک پتے چنا کرو گے

تمہارے دل کے سلگتے جذبے کبھی نہ اشکوں سے بجھ سکیں گے
حسین ساون کی بھیگی راتوں میں آگ بن کے جلا کرو گے

گئی رتوں کا خیال اک دن تمہارے آنگن میں آ بسے گا
بچھڑنے والوں کو پھر سے ملنے کے خواب دل میں بنا کرو گے

تمہاری آنکھوں سے قطرہ قطرہ دکھوں کی شبنم ٹپک رہی ہے
میں سوچتا ہوں خزاں کے یہ دن کبھی نہ بدلے تو کیا کرو گے

جہاں میں خاورؔ سکونِ خاطر کی کوئی تم کو کمی نہ ہوگی
اگر تمنا کے سب پرندے تم اپنے دل سے رہا کرو گے

مفلسی کی دھوپ، کچھ غازہ غمِ حالات کا
کس قدر سنولا گیا چہرہ مرے دیہات کا

رنج و غم کی بارشیں ایسی ہوئی ہیں شہر میں
جابجا پانی کھڑا ہے درد کی برسات کا

یہ بھی ممکن ہے تجھے بھی بھول جاؤں ایک دن
کیا بھروسہ ہے بھلا انسان کے جذبات کا

راستہ دشوار ہے منزل بھی ان دیکھی سی ہے
ہر قدم پر خوف بھی ہے سنگدل آفات کا

چاندنی کے دیس میں اک دن پہنچ جائیں گے ہم
کوئی تو انجام ہوگا اس اندھیری رات کا

پھر مری آنکھوں سے خاورؔ جوئے خون بہنے لگی
پھر کسی نے خوں کیا ہے میرے احساسات کا

لیفٹننٹ کمانڈر محمد صدیق قریشی

یہاں میں ایک بار پھر الجھن کا شکار ہوں۔ محمد صدیق قریشی نامی دو شخصیات میرے سامنے ہیں کبھی میں سوچتا ہوں کہ کہیں ایک ہی شخصیت کے دو چہرے نہ ہوں۔ جو دھوکا دے رہے ہیں۔ بہر حال مجھے تو اس شخصیت سے غرض ہے۔ جس نے کہا ہے ؎

فرض ہے بحری جواں کا حفظِ ناموسِ وطن
قابلِ صد فخر ہیں جس کی روایاتِ کہن
دندناؤ تم ہمیشہ باندھ کر سر سے کفن
اپنے ہر دشمن کو دکھلاؤ وغا کا بانکپن
رزم گاہِ بحر کا تو غازیِ پُر جوش ہے
جذبۂ شوقِ شہادت میں کفن بردوش ہے

ہاں تو اردو ادب کے حوالے سے دوسری شخصیت جو لیفٹننٹ کمانڈر محمد صدیق قریشی کی ہم نام ہیں وہ ہیں پروفیسر محمد صدیق قریشی۔

زیرِ تبصرہ محمد صدیق قریشی کا تعلق ناموسِ وطن کے محافظوں یعنی پاک بحریہ سے ہے۔ جنہیں اپنی روایات پر فخر ہی نہیں۔ بلکہ ہر لمحہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آمادہ اور تیار ہیں اور شوق شہادت میں ہر لمحہ کفن بر دوش ہیں۔ آپ حقائق اور جذبوں کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ مبالغے سے اکثر پرہیز کرتے ہیں۔ آپ کا تعلق پاک بحریہ کے ان جری اور بہادر افسروں سے ہے جو قولاً اور فعلاً اپنی حیاتِ مستعار کو اس پاک پوتر دھرتی کی سمندری حدود کی حفاظت کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی تلخ یادیں آپ کے ذہن پر وڈیو کی صورت رواں ہیں۔ لیکن آپ نے جہاں ان یادوں کو روگ بنا کر سینے سے لگایا ہے وہیں ان سے سبق بھی حاصل کیا ہے۔ اور اپنی نسل کو ایسے ہی پیش آنے والے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔ آپ نے اپنی تحریروں سے جہاں اپنے Subordinates کو ماضی کی یادوں سے مربوط رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں نبرد آزمائی کے طریقے سکھانے کی کوشش بھی ہے۔ آپ نے اپنی بحریہ کے نئے تجربات سے جوانوں کو روشناس بھی کرایا اور اُن کے دلوں میں عزم و ہمت کی شمع بھی روشن کی۔ آپ نے احساس دلایا ہے کہ ؎

تو وقار و عظمتِ ملت کا ہے زندہ نشاں　　سر زمینِ پاک کے ساحل کا پُر دل پاسباں
خوف مت کھانا کبھی جمعیتِ کفار سے　　ملتی ہے نصرت ہمیشہ عظمتِ کردار سے

حقیقتِ منتظر (تضمین)

غمِ زندگی کا ظہور ہے مرے دل کے سوز و گداز میں
خمِ بندگی کا سرور ہے مرے عشقِ جلوہِ ناز میں
مرا ذوقِ دید ہے مضطرب ترا حسن پردہِ راز میں
"کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں"

رہِ ارتقائے شعور میں میرا قلب کیسے خموش ہو
دلِ دردمند کی شان ہے کہ عمل میں جوش و خروش ہو
یہی امتیازِ حیات ہے کہ وہ صدق و عدل بدوش ہو
"طرب آشنائے خموش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا جو چھپا ہوا ہو سکوتِ پردہِ راز میں"

میرے اشتیاقِ جلال نے جو کہا خودی سے کہ لا الہ
میرے اعترافِ جمال نے اسے پیشِ اِلاّ جھکا دیا
ہوا اضطرابِ شکستِ دل تو وہیں سروش نے دی صدا
"تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں"

دمِ عقلِ خود بیں کا ہے فسوں کہ بشر ہے محوِ فریبِ تن
اسی مکر و فن کے ستم سے ہی دل و جاں کا چاک ہے پیرہن
میرا ذوقِ دید کشاں کشاں گیا بہرِ جلوتِ انجمن
"دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں"

کہیں مہر و سلطاں کے خوف سے مجھے خلق لرزہ بجاں ملی
کہیں سیم و زر کے خمار سے مجھے روحِ شعلہ فشاں ملی
کہیں اشتراکی نظام سے مجھے مزدِ برقِ تپاں ملی
"نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں"

یہ فسادِ چشمِ غلط نگر ہے کہ رونما ہیں تباہیاں
یہ ہوائے حرص و ہوس تو ہے کہ خزاں کی زد میں ہے گلستاں
کہیں نورِ مہر و وفا نہیں نہ خلوصِ قلب ہے ضوفشاں
"نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں"

دلِ محوِ عیشِ نشاط کو کبھی یاد آئی نہ انتہا
یونہی عمرِ کشتی چلی گئی غمِ فکرِ فردا نہیں ہوا
یہ فریبِ نفس تھا بالیقیں مجھے خوب جس کی ملی سزا
"جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں"

✯

بوالعجبی تحسنا ہیا

لیفٹننٹ کمانڈر خضر اقبال

ہنسی ہنسی میں سچّے کی بات کہہ جانا بھی ایک فن ہے اور یہ فن بہت کم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ودیعت ہوتا ہے اور پھر ۰۰۰ اس فن میں مزید چمک پیدا کرنے کے لئے اپنی بات کو مزاح یا طنز کے لہجے میں کہنا ۰۰۰ تو ۰۰۰ اس کا کیا کہنا ۰۰۰ ایسے ہی ایک فنکار کا نام خضر اقبال ہے۔ جو سچ بات کہنا بھی جانتا ہے اور وہ انداز بھی جسے شاعری کا روپ سمجھ کر دل لو بہلایا بھی جا سکے اور ضمیر میں ایک خلش بھی محسوس کی جائے۔ آپ کا کلام پڑھ کر قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ آپ زمانے کی پیچیدگیاں، سیاست کی چالبازیاں، سماج کی جکڑ بندیاں اور نظام کی بے قاعدگیاں بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں اور انہیں سمجھانا بھی جانتے ہیں۔ لیکن سمجھانے کا فن قدرے مختلف ہے۔ کڑوی کسیلی بات کو منہ پر صاف صاف کہہ دینا اور مخاطب کے چہرے پر سلوٹیں بھی نہ پڑھنے دینا گویا کہ ایک ڈاکٹر کی طرح ناپسندیدہ دوائی صحت کی بحالی کے لئے پلاتے ہیں۔ شاعری میں گو آپ کا میدان مزاح ہے لیکن اس مزاح میں سنجیدہ بات کہنے کا ہنر بھی آپ کو آتا ہے ؎

آدمی کی کمی نہیں لیکن ۔۔۔ آدمیت کا کال ہے پیارے
پوجتے ہیں فقط اسی کو لوگ ۔۔۔ جس کے پلے میں مال ہے پیارے

جناب خضر اقبال اچھے عمل کو ایپریشیئیٹ (Appreciate) بھی کرتے ہیں اور حوصلہ و ہمت بھی بندھاتے ہیں۔

ہماری تاریخ میں اوجڑی کیمپ کا سانحہ ایک دکھ اور درد لے کر آیا۔ جس پر جہاں عوام نے اظہارِ تاسف کیا وہاں شعراء کرام نے بھی اپنا فرض سمجھتے ہوئے بہت کچھ لکھا۔ آپ نے بھی اپنی بہادر فوج کے کارنامے کو سراہا ؎

مدد کو آگ کے قلزم سے گزرے ۔۔۔ بہادر ہیں یہ فوجی کس بلا کے
بپا ہر سمت شعلے تھے دھواں تھا ۔۔۔ یہ پہنچے جان کی بازی لگا کے

000

دولت کا اثر

لڑکی والے آئے ہیں لڑکے کے گھر   تا کہ دیکھیں کس قدر ہے مال و زر
شکل و صورت پر نہیں کچھ اعتراض   لازماً ہو شان و شوکت کروفر
منحنی سا جسم ہے تو غم نہیں   قد ہے گر بالشتیہ تو کیا ہے ڈر
دیکھنا ہے کار، کوٹھی، رعب داب   بس یہی اوصاف ہیں پیش نظر
ذات کا یا خانداں کا ذکر کیا   سب سے اونچا خانداں ہے سیم و زر
بوڑھا ہو دولہا تو رہتا ہے جواں   خوں میں ہو سکوں کی حدت کا اثر
پست ہے کردار تو ہوتا رہے   بس ستارہ بخت کا ہے اوج پر

خواندگی کا خانہ ہے خالی تو کیا
علم سے ہے مال و دولت معتبر

شلوار یا پتلون

کون سے نسخے سے رک سکتی ہے رشوت کی وبا   یہ کوئی معمولی بیماری نہیں، طاعون ہے
اک زمانے سے مروج ہے خوشامد کا چلن   آپ یہ سمجھے کہ شاید یہ نیا مضمون ہے
آجکل چلتا ہے خالص اپنا اپنا فلسفہ   آج کل ہر شخص اپنی جا پہ افلاطون ہے
فائدہ افسر کا ہو تو دل ہے منعم کا سخی   فائدہ ماتحت کا ہو تو بہت قارون ہے
گاڑیوں کے حادثے ہوں، یا دھماکہ خیزیاں   کہ زمیں کا جس قدر ہو بوجھ یہ ممنون ہے

یوں تو سب ہی جانتے ہیں محترم قومی لباس
آپ کو کیا معتبر شلوار یا پتلون ہے؟

لیفٹننٹ کمانڈر حافظ محمد مستقیم

میرے خیال میں کسی شاعر کے لئے سب سے مشکل گھڑی وہ ہوتی ہے۔ جب اسے نعت کہنے کو کہا جائے۔ کیونکہ نعت گوئی، پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

باخدا دیوانہ باش، با محمدؐ ہوشیار

لیکن بڑے دھن والے ہیں وہ شعراء جو صرف نعت نبیؐ کے لئے ہی وقف ہو کر رہ گئے۔ غالباً یہ ان حضرات کا کمال نہیں بلکہ نعت والے کی نگاہِ کرم ہے۔ جس نے انہیں چن لیا۔

ایک دن چند احباب نعت گو شعراء کے حوالے سے بات کر رہے تھے تو جناب محمد مستقیم کا نام بھی آیا۔ میرے پوچھنے پر جواب ملا کہ آپ پاکستان بحریہ میں بحیثیت لیفٹننٹ کمانڈر فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ کا نام محمد مستقیم اور مستقیم ہی تخلص کرتے ہیں۔ آپ کے والد صوفی عبدالغفور نام کے ہی نہیں بلکہ حقیقتاً ایک صوفی بزرگ ہیں۔ آپ اپنے گھرانے کے ہمراہ قیام پاکستان کے وقت اکبر آباد سے ہجرت کر کے کراچی شہر میں آکر آباد ہوئے۔ اسی شہر کے تمدنی و ثقافتی ماحول میں ۲۸ اگست ۱۹۵۷ء کو بمقام ناظم آباد حافظ محمد مستقیم پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ لیکن والد صاحب کی خواہش پر مذہبی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ اب موصوف درسِ نظامی کے فارغ شدہ عالم ہیں۔ پھر آپ نے سیاسیات میں ایم اے کیا۔ اور پاک بحریہ میں آگئے۔

جناب حافظ مستقیم ابتداء میں اپنے والد محترم کے ساتھ ایسی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ جن میں ہادیِ برحق حضرت محمد مصطفیؐ کو اپنی فکری کاوشوں کا مرکز بنایا۔

جیسے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ نعت والے کی نگاہِ کرم ہوتی ہے جس کو چن لے۔ لیکن شاعر کی اپنی کاوش یا وہ چینل جو اس در تک پہنچانے کا سبب ہوتا ہے، بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جناب محمد مستقیم، شاہ انصار الہ آبادی کے دستِ بیعت ہیں۔ لہذا آپ کی رغبتِ نعت گوئی میں ان کا روحانی فیض بھی شامل ہے۔ شعری رموز آپ نے بشیر احمد واصل دہلوی مرحوم سے سیکھے۔ اور انہیں سے استفادہ فن کرتے رہے۔ آپ کے نعتیہ مجموعہ ہائے کلام "معراجِ سخن" اور "تاجِ سخن" نعتیہ ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ ○○○

نعت

آدمیت کو شرح و بیاں مل گئے ۔۔۔ وہ ملے کیا کہ دونوں جہاں مل گئے
تھم گئے پاؤں تو چل پڑا دردِ دل ۔۔۔ ضعف سے مجھ کو تاب و تواں مل گئے
ذرہ ذرہ مہ و مہر کا ترجماں ۔۔۔ مجھ کو رازِ رہِ کارواں مل گئے
اس ادا سے چبھے راہِ طیبہ میں خار ۔۔۔ خلد کے گلستاں، بوستاں مل گئے
شبِ اسریٰ کی تقدیر چمکے نہ کیوں ۔۔۔ عرش پر آج دو رازداں مل گئے

مستقیمؔ ان کے در سے اٹھایا جو سر
خود بخود عظمتوں کے نشاں مل گئے

ہر اک ذرہ نہ کیوں چمکے متاعِ دو جہان ہو کر ۔۔۔ کوئی تشریف لایا ہے خدا کا ترجماں ہو کر
کہیں خاموشیاں بن کر کلیجے میں سمائی ہیں ۔۔۔ کہیں گونجی ہے ان کی بات تاثیرِ اذاں ہو کر
ہر اک غنچہ برنگِ گل ادب سے مسکراتا ہے ۔۔۔ چمن میں کون آپہنچا بہاروں کی زباں ہو کر
غبارِ راہِ طیبہ آنکھ میں آئے تو گل بن کر ۔۔۔ کلیجے میں اتر آئے مگر بے تابیاں ہو کر
کسی دن تو کرم ہوگا ہوائے کوئے طیبہ کا ۔۔۔ کبھی تو حاضری ہوگی غبارِ کارواں ہو کر

انہی کی نعتِ والا ہے انہی کی نذر ہوتی ہے
کسی کو کیا سناؤں مستقیمؔ خوش بیاں ہو کر

★

کیپٹن عبدالصمد (قمر صدیقی)

علامہ رضا علی وحشت اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ آپ کا شمار اپنے دور کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اور آپ نے اپنے پیچھے شاگردوں کی ایک قطار چھوڑی ہے۔ آپ کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک معروف نام قمر صدیقی بھی تھے۔

جناب عبدالصمد جو دنیائے ادب میں قمر صدیقی کے نام سے ابھرے۔ ۱۹۰۷ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علم و فضل دوست گھرانے میں حاصل کی اور پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک کا امتحان بڑے اچھے نمبروں میں پاس کیا۔ کلکتہ ہی چونکہ آپ کا آبائی شہر تھا لہٰذا وہیں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی اے کی ڈگری لی۔ کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے کئے۔ وہیں آپ نے بی ٹی کا امتحان پاس کیا اور کلکتہ میں ہی پروفیسری سے اپنی عملی زندگی کی ابتداء کی۔

جناب قمر صدیقی کو خدا تعالیٰ نے تندرستی و صحت اور توانا جسم عطا فرمایا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں انگریز کو برصغیر سے جوانوں کی سخت ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے یہاں بھی اور رضا کارانہ بھرتی شروع کی وہاں پڑھے لکھے ہندوستانیوں کو کمیشن بھی دیا۔ چنانچہ جناب عبدالصمد نے بھی فوج کی ملازمت قبول کرلی۔ آپ تقسیم ہند سے پہلے ہی کیپٹن کے عہدے پر ترقی پا چکے تھے۔ اور بقول سید ظفر ہاشمی جب آپ نے رحلت فرمائی تو میجر کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن میری معلومات کے مطابق آپ کیپٹن ہی تھے یا ہو سکتا ہے آپ ٹمپریری میجر پروموٹ ہو گئے ہوں۔ آزادی کے بعد آپ راولپنڈی آ گئے۔ اور پھر آپ کا ٹرانسفر ڈھاکہ ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ آپ زیادہ عرصہ تک اس دنیائے فانی میں نہ رہ سکے۔ اور ۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اتفاقیہ حرکتِ قلب بند ہونے کے سبب وہ عسکری اور ادبی محفلوں کو ویران کر گئے۔ آپ کے استاد علامہ رضا علی وحشت نے آپ کی تاریخ وفات کہی "زینتِ فردوس قمر صدیقی"۔ قمر صدیقی بڑے استاد پرست اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کا کلام سرتا پا استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا بالکل ویسے ہی ۔۔۔ کہ اگر کل کائنات دل ہے تو اس کا مرکزی عنصر محبت ہے۔ اور اس محبت کے بنیادی اجزائے تشکیل صداقت خلوص و جذبہ کی حرارت اور غم ہیں اور یہی چیز یہاں دونوں کے کلام کا حصہ ہے۔ گویا ایک عام قاری استاد اور شاگرد کے کلام میں خاص فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ OOO

نمونۂ کلام

ہر روز ہے وعدۂ شام ان کا اور دل میں چراغ امیدوں کا
ہر صبح جلایا جاتا ہے ہر شام بجھایا جاتا ہے

اے باغبان برق کی زد میں ہیں [illegible] ایک
تیرا چمن ہوا کہ مرا آشیاں ہوا

قمرؔ کب تک ہجومِ غم سے محرومی کا افسانہ
مزہ آتا جو کچھ تیری غزل میں فلسفہ ہوتا

غزل

نگاہِ شوق نے اک بے خودانہ کام کیا
کہ لطفِ جلوۂ پنہاں کا راز عام کیا

ملا نہ ایک بھی شاید ادا شناسِ جمال
جو اس نے خلوتِ رنگیں کو بزمِ عام کیا

کبھی کبھی رہی امید کی بھی رنگینی
اگرچہ خون ہوس یاس نے مدام کیا

نہ میں حرم سے گیا اور نہ دیر کو چھوڑا
خدا کو سجدہ کیا تو بتوں کو رام کیا

حریمِ ناز میں آیا نہ جب قرار اس کو
تو اپنے جلوۂ پنہاں کو نذرِ عام کیا

ہجومِ جلوہ سے پردہ تھا ایک چادرِ نور
یہ اس نے چہرہ کشائی میں اہتمام کیا

نگاہِ یاس سے یہ چشمِ ناز کہتی ہے
کہ تو نے شوق کا افسانہ کیوں تمام کیا

سکونِ انجمنِ ناز میں خلل آیا
مری نگاہِ محبت نے دل کا کام کیا

مزاج اور بھی اُس مہ وش کا تند ہوا
جو میں نے آج اسے اے قمرؔ سلام کیا

★

کیپٹن سردار خورشید علی

سردار خورشید علی کے والد کا نام سردار اشرف علی تھا۔ جو ہندوستان کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور لکھنو میں رہائش پذیر تھے۔ خورشید علی نے ابتدائی تعلیم مشن سکول قیصر باغ لکھنو میں پائی اور پھر اپنے خاندان کے ساتھ دہلی آ گئے۔ یہاں آپ نے عربک سکول میں داخلہ لیا اور کچھ عرصہ یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ لیکن ورنیکلر فائنل کا امتحان شملہ سے درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں علی گڑھ کو خیرباد کہا اور فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ اردو شاعری سے آپ کو کالج کے دوران شغف پیدا ہوا۔ اور یہ سلسلہ فوج میں آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ فوج میں آپ نے چند سال گزارے اور پھر اسے چھوڑ کر مانگرول چلے گئے۔ مانگرول ایک ریاست تھی جس کے والی عبدالخالق تھے۔ آپ بھی اردو کے ایک عمدہ شاعر تھے اور خالقؔ تخلص کرتے تھے۔ سردار خورشید علی کو اس ریاست میں خوب پذیرائی ملی اور آپ سٹیٹ فورس کے کمانڈر اور ایڈی کانگ مقرر ہوئے۔ یہی دور ہے جب آپ کی شاعری کے شوق کو فروغ ملا۔ والیِٔ مانگرول کی صحبت نے آپ کو نکھار دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس نئی مملکت سے محبت اور اسلام دوستی کے سبب آپ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔

بنیادی طور پر آپ غزل گو شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جس کی وجہ آپ کا سادہ اندازِ بیان کے ساتھ سماجی شعور ہے۔ جس نے آپ کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رہنے دیا بلکہ فرد کے غم کو اپنا سمجھنے پر مجبور کیا ہے۔ آپ نے غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو دل کو بھاتا ہے۔ جس میں شاعری کو روایات کی لڑی سے پروئے رکھا ہے۔ اور حسن و عشق کے قصے، درد و غم کی داستانیں شامل کی ہیں اسی طرح جب آپ غمِ جاناں کے پردے میں غمِ دوراں یا اپنی ذات کا دکھ بیان کرتے ہیں تو اشعار آپ کے اندرونی کرب کا مظہر بن جاتے ہیں۔ ○○○

غزلیں

یہ دلبروں کے لئے ہے نہ مہوشاں کے لئے
تمام رنج ہیں عشاقِ خستہ جاں کے لئے
شہیدِ تیغِ ادا ہو کے جاوداں ہو جا
تڑپ رہا ہے عبث عمرِ جاوداں کے لئے
سمجھ کے توڑنا گلہائے باغ اے گلچیں
بہارِ عالمِ ہستی ہے امتحاں کے لئے
کبھی بنیں گے یہی برقِ صد نشیمن سوز
جو تنکے لائے ہیں چن چن کے آشیاں کے لئے
وفورِ شوق میں ہم ایسے ہو گئے بے خود
ہزار بوسے ترے سنگِ آستاں کے لئے
مرا نصیب، نہیں آپ پر کوئی الزام
ستم ہے میرے لئے اور کرم جہاں کے لئے
نہ چہچہے نہ ترانے نہ زمزمہ خوانی
نوائے غم ہے فقط فکرِ نکتہ داں کے لئے
یہ بدگمان زیادہ ہیں ان سے بھی خورشید
نکالئے کوئی تدبیر پاسباں کے لئے

جبینِ شوق نذرِ آستاں ہوگی تو کیا ہو گا
ترے قدموں پہ اے جاناں یہ جاں ہوگی تو کیا ہو گا
سکوتِ اہلِ گلشن میں ہے بے شک مشکلیں بے حد
زباں جب حالِ دل کی ترجماں ہوگی تو کیا ہو گا
جلا کر خرمنِ دل کو مرے، برقِ تبسم سے
نگاہِ لطف پرور مہرباں ہو گی تو کیا ہو گا
حریمِ ناز سے چلمن اٹھا کر دیکھنے والے
نگاہِ شوق میری رازداں ہوگی تو کیا ہو گا
یہاں تکمیلِ ذوقِ بے خودی ہے منزلِ مقصود
خرد کی رہزنی گر درمیاں ہوگی تو کیا ہو گا
ابھی تو نکتۂ دل ہے ہماری ناگہاں الفت
مگر جب یہ مکمل داستاں ہوگی تو کیا ہو گا
غزل لکھنے کو اے خورشید لکھ دی ہے مگر ڈر ہے
کہ وہ مذبوحِ نقدِ شاعراں ہوگی تو کیا ہو گا

کیپٹن محمد محمود اختر

کیپٹن محمد محمود اختر کی والدہ اور والد دونوں شاعر تھے اور محبت میں بھی ایک مثالی جوڑی تھے۔ خوش قسمت اختر ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو پیار کے اس گہوارے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے والد خان بہادر محمد حسام الدین ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

محمد محمود اختر نے ابتدائی تعلیم گھر سے شروع کی۔ پڑھا لکھا ماحول تھا چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ادب کے حوالے سے باتیں ہوتیں اردو اور فارسی آپ نے ایسے ہی پڑھی۔ لیکن انگریزی پڑھنے کے لیے سکول میں داخلہ لینا پڑا۔ مدراس یونیورسٹی سے میٹرک، پھر ایف ایس سی دونوں امتحانات درجہ اول میں پاس کیے اس کے بعد ریاضی اور سائنس میں بی ایس سی کرنا چاہا لیکن آخری سال میں کسی وجہ سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ نے پھر تعلیم کے حصول کی طرف توجہ دی اور معاشیات میں بی اے کیا۔ پھر ایم اے اور ایم او ایل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نیز شوق کی تکمیل کے لیے منشی فاضل کا امتحان بھی دے ڈالا۔ اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ علاوہ بریں لندن کے اداروں چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف سیکرٹریز، کارپوریشن آف سیکرٹریز، انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹینٹس کے امتحانات پاس کیے اور محکمہ انجمن ہائے امدادِ باہمی میں ملازم ہو گئے کچھ عرصہ یہاں گزارا۔ لیکن جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو آپ نے فوج میں کمیشن لے لیا۔ آزادیٔ پاک و ہند کے بعد آپ پاکستان آرمی میں منتقل ہو گئے اور ۱۹۴۹ء میں فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ پھر پاکستان میں کام کرنے والے ممتاز غیر ملکی اداروں میں اکاؤنٹس اور مالیات کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اوائل ۱۹۶۳ء میں مغربی پاکستان کے پانی اور بجلی کے ترقیاتی ادارہ موسوم بہ واپڈا میں ملازم ہو گئے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے جب پاکستان پر حملہ کیا تو آپ نے اپنی خدمات دوبارہ فوج کو پیش کیں یہ آپ کا جذبۂ حب الوطنی تھا کہ آپ نے ملک کے اندر رہنے پر محاذِ جنگ پر گولیوں کے سامنے دشمن کے خلاف لڑنے کو ترجیح دی۔ اور یہ وہ جذبہ ہے جو ہر مسلمان اور بالخصوص ہر فوجی مجاہد میں بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ چاہے وہ جس حال میں بھی ہو۔ لیکن کمانڈر انچیف نے آپ کو لکھا کہ "وقت آنے پر آپ کی خدمات سے استفادہ کیا جائے گا۔ ہماری افواج میں ابھی سر کٹوانے کا جذبہ ہے۔ آپ لوگ اپنے فرائض بااحسن ادا کریں اور دعائیں کریں" ○○○

نمونۂ کلام

آج ہر قلب تجلی گہہ اندیشہ ہے — آج ہر ساز میں ہے نغمۂ باطل ساقی
ناخدا رہینِ تذبذب نظر آتا ہے مجھے — وہی کشتی وہی موجیں وہی ساحل ساقی
تنگ ہے دل کے لئے مسلکِ دیرینۂ عشق — درد کی مے نہ رہی جام کے قابل ساقی

...

پریشاں خاطری کے پیرہن میں ہم وہ جوہر ہیں — مثالِ بوئے گُل زینت دہ گلزار رہتے ہیں

...

کیا نرالے ہیں حسن کے انداز — خامشی بھی کلام ہوتی ہے

...

اعتبارِ دل کو اندیشہ ہے بہکانے سے کیا — دوست داری کو غرض دشمن سے مل جانے سے کیا

...

ترا کام اندیشہ کاری نہیں — خلل آگیا تیرے ایمان میں
بڑھاتا چلا جا سفینے کو تو — خدا لاج رکھ لے گا طوفان میں

...

شوق میں باقی تمیزِ موجہ و ساحل نہیں — مرحبا اے دل کہ ہنگامہ ترا باطل نہیں

...

ہراساں نہ ہو بحرِ مواج میں — کہ ڈوبے سفینے ابھرتے بھی ہیں

...

اک نگاہِ غلط انداز اِدھر بھی ساقی — کوئی مے نوش تہی جام لئے بیٹھا ہے

...

روح پرور ہے خاطرِ ناشاد — عشق میں وہ مقام آ ہی گیا

...

بے نور ہے چراغ فسردہ سی بزمِ شوق — اکتا چلے ہیں اہلِ تمنا ترے بغیر

...

جاوداں غم کے بخشنے والے — تیرے اکرام کا حساب نہیں

کیپٹن نذر محمد (ن۔م راشد)

جب ہم آزاد نظم کی بات کرتے ہیں تو ہماری نظر انگریزی شاعری پر جا ٹھہرتی ہے۔ابتداء میں اس طرزِ سخن کو منحرف المرکز سے معنون کیا گیا۔اسی طرح جب اردو شاعری میں یہ صنف داخل ہوئی تو یہاں بھی اس کی مخالفت کی گئی۔اور اس کی وجہ غالباً اس کی بے راہروی ہے۔کیونکہ آزاد نظم کے سب سے بڑے علمبردار جناب ن۔م راشد ہیں۔ جن کا پورا نہیں تو تقریباً آدھا کلام جنس و جذبات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ آپ کے تمام مجموعہ ہائے کلام یعنی "ماورا"، "ایران میں اجنبی (اول)" "ایران میں اجنبی (دوم)"، "لا=انسان"، اور "گمان کا ممکن" سارے پڑھ لیجئے ڈھونڈے سے کوئی دو چار ہی پابند نظمیں ملیں گی۔ ورنہ سارا کلام آزاد نظم میں ہے۔اور اسی باعث آپ کو آزاد اردو نظم کا امام کہا جاتا ہے۔ آپ ان شعراء کی صف میں گنے جاتے ہیں۔ جنہوں نے قدیم روایات سے بغاوت کی۔اردو نظم کو قافیہ و ردیف کی جکڑبندیوں سے آزاد کیا اور اسے ایک نئی ہیئت دی۔

جناب ن م راشد کا پورا نام نذر محمد اور تخلص راشدؔ ہے۔ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ آپ کی جائے پیدائش اور نیویارک جائے وفات ہے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اکنامکس میں ماسٹر کی ڈگری لی پھر کچھ عرصہ تک ماہنامہ شاہکار لاہور کی ادارت سنبھالے رکھی۔یہاں سے ہٹے تو کمشنر ملتان کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔یہ دور آپ کی زندگی کا تلخ ترین دور ہے۔آپ کی شاہکار نظم "شاعرِ درماندہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔کچھ عرصہ بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہو گئے دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں فوج کے محکمہ نشر و اشاعت میں ملازمت کر لی اور کیپٹن کے عہدے پر فائز ہو کر قاہرہ، تہران اور لنکا میں مقیم رہے۔ کچھ عرصہ ریڈیو ٹرانزکھل کے ڈائریکٹر رہے اور پھر ۱۹۵۳ء میں امریکہ نے اردو پروگراموں کے لیے آپ کی خدمات حاصل کر لیں جہاں مرتے دم تک آپ نیویارک میں مقیم رہے۔ ○○○

گناہ اور محبت

گناہ کے تُند و تیز شعلوں سے روح میری بھڑک رہی تھی
ہوس کی سنسان وادیوں میں مری جوانی بھٹک رہی تھی
مری جوانی کے دن گزرتے تھے وحشت آلود عشرتوں میں
مری جوانی کے میکدوں میں گناہ کی مے چھلک رہی تھی
مرے حریمِ گناہ میں عشق دیوتا کا گزر نہیں تھا
مرے فریبِ وفا کے صحرا میں حورِ عصمت بھٹک رہی تھی
مجھے خسِ ناتواں کے مانند ذوقِ عصیاں بہا رہا تھا
گناہ کی موج فتنہ ساماں اٹھا اٹھا کر ٹپک رہی تھی
شبابؔ کے اولیں دنوں میں تباہ و افسردہ ہو چکے تھے
مرے گلستاں کے پھول جن سے فضائے طفلی مہک رہی تھی
غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا میں
گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں

اور اب کہ تیری محبتِ سرمدی کا بادہ گسار ہوں میں
ہوس پرستی کی لذتِ بے ثبات سے شرمسار ہوں میں
میری بہیمانہ خواہشوں نے فرار کی راہ لی ہے دل سے
اور ان کے بدلے اک آرزوئے سلیم سے ہمکنار ہوں میں
دلیلِ راہِ وفا بنی ہیں ضیائے الفت کی پاک کرنیں
پھر اپنے "فردوسِ گمشدہ" کی تلاش میں رہ سپار ہوں میں
ہوا ہوں بیدار کانپ کر اک مہیب خوابوں کے سلسلے سے
اور اب نمودِ سحر کی خاطر ستم کشِ انتظار ہوں میں
بہارِ تقدیسِ جاوداں کی مجھے پھر اک بار آرزو ہے
پھر ایک پاکیزہ زندگی کے لئے بہت بے قرار ہوں میں
مجھے محبت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے
مجھے جوانی کی تیرہ و تار پستیوں سے اٹھا لیا ہے

کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی

جب گجرات کی بات تعلیم یا ادبی حوالے سے ہوتی ہے تو قلعدار کا قریشی خاندان ضرور زیر بحث آتا ہے جو کئی پشتوں سے علمی و ادبی خدمات میں ممتاز نظر آرہا ہے۔ آجکل احمد حسین قریشی جنہوں نے اردو پنجابی عربی اور فارسی میں بے شمار کتابیں لکھیں، نمایاں ہیں۔ ایک وقت تھا کہ آپ کے بڑے بھائی محمد رمضان گجرات کی معروف علمی اور ادبی شخصیت تھے۔ آپ تبسم قریشی کے نام سے مشہور تھے۔

آپ کے والد عبدالکریم قلعداری اپنے وقت کے علامہ تھے۔ تبسم قریشی ۱۴ جنوری ۱۸۹۹ء کو ترکھہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ جونیئر سپیشل کلاس ڈسٹرکٹ سکول کنجاہ سے اور پھر نارمل ہائی سکول سرگودھا سے ٹریننگ لی۔ ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۴ میں نارمل سکول لالہ موسیٰ سے ٹریننگ کے بعد محکمۂ تعلیم میں آگئے۔ کئی مقامات پر بشمول وزیر آباد اور زمیندار سکول گجرات استاد رہے۔

جناب تبسم قریشی کے بارے جب منیر سلیچ سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ کچھ عرصہ استاد رہنے کے بعد آپ فوج میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہو گئے۔ لیکن چند سال کے بعد آپ نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور واپس آ کر پھر محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ آپ نے اسی دوران ہومیو پیتھک کیا اور کلینک بھی کرنے لگے۔ چونکہ سر فضل علی کے قریبی ساتھی تھے۔ لہذا ان کے کالج (زمیندار) کے قیام میں اَن تھک محنت کی۔ اور بلا معاوضہ وہاں فارسی پڑھاتے رہے۔ آپ زمیندار کالج گجرات کے باقاعدہ سٹاف ممبر نہیں تھے لیکن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے بنیادی ممبر تھے۔ اسی دوران آپ ہفتے وار اخبار "محبِ کسان" کے مدیر بھی رہے۔

مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک آپ کو "پُرگو، مفید گو اور زود گو" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آپ ایک اچھے شاعر، بہترین ادیب اور عمدہ صحافی تھے۔ سید وحید الدین سلیم پانی پتی کے تلمیذ میں شامل تھے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے دوبارہ فوج کا رخ کیا اور کمشن پایا۔ لیکن کیپٹن تھے کہ ریٹائرمنٹ لے لی۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

"غم آشام"، خمخانۂ دل، جیبی لغات، ریاض مضامین، ضلع گجرات کی قلمی تصویر، دانتوں اور مسوڑھوں کی تکالیف کا مکمل ہومیو پیتھی علاج، ذہنی معالج، کالی کھانسی، اے خاصہ خاصانِ رسل ؐ، زمیندار اور ہڑتال، وغیرہ

علم و ادب کا یہ درخشندہ ستارہ اپنی تابناکی دکھا کر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو روپوش ہو گیا۔ ○○○

"وادیٔ غربت کے مسافر" سے چند اشعار

آ وادیٔ غربت میں قیامت کا سماں دیکھ　　گلزارِ سیادت میں چلی بادِ خزاں دیکھ
محشر بھی کہاں دیکھے گا یہ وحشتِ خوں ریز　　طوفانِ حوادث ہیں جواں برق تپاں دیکھ
کیا کیا نہ ستم توڑے گئے اہلِ رضا پر　　ہر ظلم پہ صد شکر رہی طرزِ فغاں دیکھ
دیتا ہے جو ہر ایک کو دامن میں پناہ آج　　آل اس کی نہیں پاتی یہاں امن و امان دیکھ
حق حق کی صدا اٹھی ہے ہر قطرۂ خوں سے　　ہر قطرے میں ہے قلزم ایثار عیاں دیکھ
ناحق نے کیا شیشۂ حق چور ستم سے　　اے دیدۂ دل شعبدۂ شیشہ گراں دیکھ
ظاہر میں جو ہارے وہی باطن میں ہیں جیتے　　سفاک پہ لعنت ہے یہاں دیکھ وہاں دیکھ

لب اس کے سزاوار تبسم ہیں ابد تک
جس دل میں بھی شبیرؓ کا ہے سوز نہاں دیکھ

غزل

جانے ساقی نے کیا پلایا ہے　　درد کو زندگی بنایا ہے
جامِ مے کا ہے کیا یہ کم اعجاز　　دل میں جو کچھ تھا لب پہ آیا ہے
دورِ گردوں سے پھر پلٹ نہ سکا　　عمر نے جو قدم بڑھایا ہے
محفلِ زندگی کا ہر مے کش　　اپنے حصے کی ساتھ لایا ہے
ایک عالم ہے نفسا نفسی کا　　کون محشر خرام آیا ہے

عارضی کیف تھا تبسم مے
جام پی کر فریب کھایا ہے

کیپٹن مرزا غلام سرور

جنگیں زمانے سے انسانی زندگیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ چھین لے جاتی ہیں۔ اور جاتے جاتے تباہیاں اور ویرانیاں دے جاتی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اجاڑ مقدر کر جاتی ہیں لیکن اگر سوچا جائے تو رہنے والوں کے لیے تجربے چھوڑ جاتی ہیں۔ کچھ محبتیں اور الفتیں دے جاتی ہیں۔ کچھ راہوں کا تعین کر جاتی ہیں اور منزل کی نشاندہی کر جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نئی زندگی سے آگاہ بھی کر جاتی ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم نے جہاں بہت بڑی تباہی مچائی وہاں ہمیں اعلیٰ پائے کے تربیت یافتہ فوجی بھی دیئے اور ساتھ ہی اچھے لکھاری بھی مہیا کئے۔ جنہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو اوراق پر بکھیر کر آنے والی نسلوں کو تاریخ کے ساتھ ساتھ بہترین ادب سے بھی نوازا۔ ایسے ہی لوگوں میں جناب مرزا غلام سرور بھی تھے۔ آپ دسمبر ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ سکندر اعظم کا آباد کردہ دریائے جہلم کے کنارے خوبصورت شہر جہلم آپ کا وطن ہے۔ یہیں تعلیم پائی اور پھر علاقائی روایات کے مطابق فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کی عملی ٹریننگ کے ہمراہ وجودِ پاکستان کے بعد اپنی خدمات عظیم وطن کے لیے وقف کردیں اور ایک عرصہ ملازمت کے بعد جب آپ ریٹائرڈ ہوئے تو کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔

مرزا غلام سرور کو شعر و شاعری کا شوق فوجی سروس کے دوران پیدا ہوا۔ وقت کے ساتھ چلتے رہے اور کبھی کبھار تسکینِ ذوق کے لیے شعر بھی کہتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب ذرا بہتر ماحول میسر آیا تو یہ شوق بھی تیز ہو گیا۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد مستقل طور پر جہلم میں سکونت اختیار کی تو ادبی محفلوں میں آنا جانا شروع ہوا۔ مختلف رسائل و جرائد میں لکھنے لگے اور نثر نگاری پر بہ نسبت زیادہ توجہ دی۔ جس سے آپ ایک اچھے افسانہ نویس کی حیثیت سے ابھرے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان سے اردو زبان میں تراجم بھی کئے ایک ناول "زخمہ" لکھا جو بہت مشہور ہوا۔ OOO

غزلیات

عارضِ روشن کو وقفِ زلفِ پیچاں کردیا
کیوں سحر کو قیدیِ زنجیرِ زنداں کردیا

آرزو صدقے نظر پر دل تبسم پر نثار
دل کے ویرانے کو دم بھر میں گلستاں کردیا

حسرتوں کا خون ہونے پر بھی دل تھا مطمئن
آپ کی شفقت نے اس کو پھر پریشاں کردیا

اُف یہ حالِ زار اپنا اور بیدادِ نصیب
دیکھنے والوں کو بھی ہم نے پریشاں کردیا

عشق نے فرزانگی سے بخش کر دیوانگی
دوستوں کو بھی مری حالت پہ خنداں کردیا

جوشِ تکمیلِ ہوس میں یہ جنوں یہ سرکشی
آدمی نے آدمیت کو بھی حیراں کردیا

یاس کا عالم تھا سرورؔ اور اندھیرے چھا گئے
آپ نے آکر مرے گھر میں چراغاں کردیا

تڑپ کر رہ گئی بجلی چمک کر آشیانے پر
اگر آیا تو میرا جذبۂ ناکام کام آیا

جسے تم ہار سمجھے تھے وہی تو جیت تھی اپنی
گریباں چاک تیری بزم سے میں شاد کام آیا

تلاطم ہے تموّج ہے تھپیڑوں میں سفینہ ہے
سنبھل اے ناخدا تیرے سنبھلنے کا مقام آیا

تصور نے حقیقت کی فضا رنگین کر ڈالی
مرے خوابوں کی لے کر آڑ وہ نازک خرام آیا

جسارت عہدِ ماضی کی عیاں ہو پھر جبینوں پر
سفینے اب جلا دینے کا سرورؔ پھر مقام آیا

کیپٹن عبدالخالق بھٹی

جناب عبدالخالق بھٹی پہلی عالمی جنگ کے ان دنوں میں پیدا ہوئے جبکہ وہ اختتامی مراحل میں تھی یعنی ۱۰ جنوری ۱۹۱۹ء آپ کا یوم پیدائش ہے۔ جہلم کی سرزمین آپ کی جنم بھومی ہے۔ یہیں سے آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ۰۰۰ لیکن آپ کا آبائی وطن کشمیر ہے جب اسلامیہ ہائی سکول سے فارغ ہوئے تو دوسری جنگِ عظیم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لہٰذا آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس جنگ میں آپ مصر، فلسطین اور شام بھی گئے اور خوب گھومے پھرے۔ جب واپس لوٹے تو جونیئر کمشنڈ افسر تھے۔ ان دنوں ڈیرہ دون اکادمی سے میٹرک پاس لوگ دھڑا دھڑ کمشن حاصل کر رہے تھے۔ آپ نے بھی قسمت آزمائی اور قدرت نے آپ کا ساتھ دیا۔ افسر بننے کے بعد فوجی ضرورتوں کے تحت آپ کو فیروز پور میں متعین کیا گیا۔ لیکن جلد ہی برصغیر میں آزادی کا سورج طلوع ہوا اور آپ وطنِ عزیز پاکستان میں آگئے۔ آپ کے داماد سے جب میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا کہ نجانے آپ نے پاکستان میں آکر کتنے عرصے تک فوج میں ملازمت کی۔

آپ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے ریٹائرمنٹ کے بعد جہلم میں ہی اپنا مطب کھولا لیکن نئی راہیں آپ کی منتظر تھیں آپ نے کوشش کی اور لندن کا ویزہ لے کر وہاں جا بسے۔ اور اب تو وہ عمر کی اس حد میں ہوں گے کہ بس اللہ ہو کا ورد ہو گا اور تسبیح کا منکا۔ بشرطیکہ صحیح راستے پر ہوں۔ لیکن یہ صرف میری سوچ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آج بھی اتنے ہی زندہ دل ہیں جتنے جوانی میں تھے۔ بلکہ ادبی حلقوں میں بھی بڑے شوق اور اہتمام سے حصہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

ایک وہ ہیں جن کی خاطر قصر ہیں ایوان ہیں
ایک ہم ہیں سائے کی خاطر نہیں دیوار بھی
عاشقی کو مصلحت سے کام کیا بندہ نواز
عاشقی میں صبر بھی لازم ہے کچھ ایثار بھی

جناب عبدالخالق بھٹی نے موت اور زندگی کو بڑا قریب سے دیکھا ہے۔ دنیا گھومے ہیں لیکن جہاں جی لگایا وہاں سے اٹھنا پڑا۔ جس محفل میں بیٹھے اٹھا دیئے گئے۔ اسی وجہ سے آپ کے لہجے میں غم اور محبت سے محرومی کا عنصر ہے۔ یہ دکھ ہی تو ہے جنہوں نے آپ کو شاعری کی سوغات بخشی اور محرومیوں نے آپ کے لہجے کو کھنک اور سوز دیا۔ خدا جانے آپ لندن کی فضائیں کیسے تک گئے ۰۰۰

نعت شریف

فقیری میں شہنشاہی کا مظہر ... بشر، پاپوش بھی ہیں جسؐ کے اطہر
حقیقت زمرۂ لایحزنوں کی ... وہؐ بخشش لاالہ کے اک فسوں کی
ہے سیرت اسؐ کی ملت کی ضرورت ... ہے صورت اسؐ کی سب سے خوبصورت
خدا نے عرش پر اسؐ کو بلایا ... رخِ زیبا اسےؐ اپنا دکھایا
سکھائے عقل کو اسرار اسؐ نے ... کیا ہے عشق جوہردار اسؐ نے
وہؐ ساقی کوثر و تسنیم کا ہے ... خدا کے بعد وہؐ سب سے بڑا ہے

سمندر علم کا عالی گہر ہے
وہؐ خالق دین کا خیر البشرؐ ہے

غزل

جدھر دیکھتا ہوں الم دیکھتا ہوں ... محبت بعنوانِ غم دیکھتا ہوں
سمجھتا ہوں گُل کوئی تازہ کھلے گا ... اگر اپنی آنکھوں میں نم دیکھتا ہوں
مناسب ہے خنجر بھی لیتا چلوں اب ... کہاں تک ہے قاتل کا دم دیکھتا ہوں
تجھے جانتا ہوں کہ تو لامکاں ہے ... تماشائے دیر و حرم دیکھتا ہوں
نہ بدلو نگاہوں کا عالم نہ بدلو ... مئے درد میں کیف و کم دیکھتا ہوں

بیاں کیا کروں وسعتِ دل کا خالق
جسے غم پہ غم تازہ دم دیکھتا ہوں

کیپٹن منظور حسن

کون ایسا مسلمان ہو گا جسے بیت اللہ اور حرم نبویؐ کی زیارت کی تمنا نہ ہوگی۔ لیکن یہ اللہ رب العزت کی رضا پر ہے۔ کچھ لوگوں کو بغیر کسی محنت اور جدوجہد کے بلاوا آجاتا ہے اور کچھ لوگ زندگی بھر تگ و دو کرتے اور بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ان کا مقدر ہوتی ہے۔

جناب منظور حسن ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اس طلب اور خواہش میں اپنی زندگی گزار دی۔ آپ کئی سال تک لگاتار درخواست دیتے رہے۔ لیکن قرعہ کبھی بھی ان کے نام نہ نکلا اور آپ ہر سال یہ کہہ کر خاموش ہو رہتے کہ ؎

اس سال بھی قرعہ نہ مرے نام کا نکلا

اور جب قرعہ نکلا تو آپ بستر مرگ پر تھے اور زندگی کے بقیہ دن گن رہے تھے۔ پھر کیا ہوا جس بلاوے نے ہر ذی روح کو آنا ہے وہ آگیا اور آپ مالکِ حقیقی کے گھر کی زیارت کی بجائے خود اس سے جا ملے۔

جناب منظور حسن کے رشحاتِ فکر اکثر رسائل میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنی وفات یعنی ۱۹۷۴ء تک شعر و ادب کی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ آپ کو شعر و ادب اور زبان و لغت پر جو عبور حاصل تھا وہ ہماری نسل کے لیے رہنما بھی ہے اور عنقا بھی۔

کیپٹن منظور حسن نے عشق رسولؐ میں ڈوب کر نعتیہ غزلوں کی جو صنف آغاز کی تھی۔ اس میں ان کا اپنا مقام تھا۔ فنِ تاریخ گوئی میں آپ ایک استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر آپ کی ایک جامع تصنیف شائع ہو کر اہل علم حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ آپ کی قومی نظمیں ملی درد اور حب الوطنی کے جذبات کا بھرپور اور اثر انگیز مرقع ہیں۔ آپ نے غزل میں بھی خود کو پیچھے نہیں رہنے دیا اور "شوقِ رسوا" جیسی غزل لکھ کر اپنا مقام غزل گو شعراء میں بھی منفرد بنالیا۔ لیکن آپ کی نعت گوئی کا انداز اور محبت رسولؐ کا جذبہ بالکل انوکھا رہا۔ ○○○

رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

اَیا ارضِ بلند اختر جہاں تجھ سے منوّر ہو
ہما پا یہ ترے پرچم کا سایہ بحروبر پر ہو

تجھے ہے خدمتِ اسلام کی بخشی گئی عزت
غریبوں کے سروں پر تیرا دستِ لطف پرور ہو

اساس اس مملکت کی جبکہ ہے حق و صداقت پر
تو پھر کیوں اہلِ باطل کی شرانگیزی سے کچھ ڈر ہو؟

ملا اسلاف سے صبر و توکل کا سبق ان کو
ترے خوددار فرزندوں کا دل کیونکر مکدر ہو

خدا خود میرِ ساماں خود ہے اربابِ توکل کا
مسلمانوں کو پھر کیوں حاجت دینار و گوہر ہو؟

شکم کی پروری ہی زندگانی کا نہیں مقصد
خدا والوں کا نصب العین ان چیزوں سے برتر ہو

نہیں مایوس کر سکتی غریبی ان کو دنیا میں
نمونہ سامنے ان کے اگر خُلقِ پیمبرؐ ہو

وہؐ مزدوروں غریبوں کا سہارا بن کے آیا تھا
سلام بے شمار اسؐ رحمت اللعالمینؐ پر ہو

محمدؐ سید الکونینؐ والثقلین شان اس کی
خوشا وہ قوم جس کو حق نے بخشا ایسا رہبر ہو

شفیع المذنبینؐ سردارِ کلؐ ختم الرسلؐ آیا
جہاں میں یوں نہ وہ خلق خداوندی کا مظہر ہو

امامِ دو جہاں وہ دردمندِ عاجزاں ٹھہرا
درودِ بے حساب اسؐ پر سلام اسؐ پر مقرر ہو

نہ تھا اس کے قدِ دلجُو کا سایہ، قولِ حق یہ ہے
سراپا نور ہو جو جسم سایہ اس کا کیونکر ہو

مساوات و اخوت کی عطا تعلیم کی اس نے
کتاب ایسی نہیں دنیا میں جو قرآں سے بہتر ہو

مٹایا فرق رنگ و نسل قرآں کی حکومت نے
برابر اس کی نظروں میں ہے اسود ہو کہ احمر ہو

کوئی ایسا تو دکھلائے ہمیں حامی غریبوں کا
شکم پر بھوک کی شدت میں باندھا جس نے پتھر ہو

رسولِؐ پاک کی تعلیم سے جو بھی مزیّن ہے
سراپا صدق ہے، افلاس کا وہ گرچہ پیکر ہو

جو ہو سر سے قدم تک مظہرِ ایثار و حق گوئی
دکھا دو تو کوئی گر ثانی صدیق اکبرؓ ہو

مثال ایسی مساوات و اخوت کی نہ پاؤ گے
عمرؓ ہو خادم اشتر تو اشتر بان افسر ہو

یہی تعلیم دی عثمان ذوالنورینؓ نے آکر
حیا و حلم و ایماں میں کوئی کب اس کا ہمسر ہو

وہ حق کا عسکری توڑے گا ہر معبود باطل کو
علیؓ کا بازوئے خیبر شکن جس کا بھی یاور ہو

کوئی لائے تو دنیا میں نظیر ایسے صحابہؓ کی
چراغ و سجدہ گہ کوئی، کوئی محراب و منبر ہو

ترے ہر عسکری کی جب جبیں روشن ہے سجدے سے
نہ کیوں اُن کا علَم دنیا میں منصور و مظفر ہو؟

مٹا سکتا نہیں کوئی اسے دنیا کے نقشے سے
نگہبان و محافظ جس زمیں کا رب داور ہو

نہیں ہے معتقد منظور تو شاید قیامت کا
عمل تیرے ہوں کیوں ایسے اگر کچھ خوف محشر ہو

کیپٹن ظفراللہ پوشنی

وفات جون 2022ء

"مجیدہ بھرگری جب پہلی بار ہمیں حیدر آباد جیل میں ملنے کے لیے آئیں تو کافی تحفے تحائف ساتھ لائیں۔ عدم واقفیت کے باوجود یہ خلوص ہمیں بہت بھایا۔ میں نے سوچا کہ کوئی تحفہ ہمیں بھی پیش کرنا چاہیے۔ لہٰذا دوسری ملاقات پر یہ اشعار تحفتاً میں نے ان کی خدمت میں پیش کئے۔

بسی ہے جب سے قمیصِ مفلس میں تحفۂ سیمتن کی خوشبو
فضائے زنداں میں موجزن ہے ہوائے باغِ عدن کی خوشبو
خود ان کا آنا تو تھا مبارک مگر تھی یہ بات اس سے بڑھ کر
کہ آرہی ہے جلو میں ان کے وفائے اہلِ وطن کی خوشبو
نہ انگبیں میں مٹھاس ایسی ظفر کہ جو اس زبان میں ہے
تلاش کی پر ملی نہ گل میں، حضور کے پیرہن کی خوشبو

زنداں میں بحالتِ بیکسی خلوص کا جواب خلوص سے دینے والے جناب ظفراللہ پوشنی ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ خطۂ بے نظیر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم انگریزی سکولوں میں ہوئی اور ملازمت کا آغاز برٹش آرمی سے کیا۔ جہاں افسران کی سرکاری زبان بھی انگریزی تھی۔ یوں انگریزیت میں پلا پوسا یہ نوجوان پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد اردو زبان کے دائرے میں داخل ہوا۔ اور پھر ۔۔۔ "زندگی زنداں دلی کا نام ہے" لکھ کر اردو دانی کو اردو دان حلقوں میں منوالیا۔

۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو جب کہ آپ کیپٹن بن کر ہنوز نوجوانی کے مزے لوٹنے کے پیٹے میں تھے۔ پنڈی سازش کیس کی زد میں آکر گرفتار ہوگئے۔ ۱۹۵۳ء تک بے جرم و خطا سزا بھگتتے رہے۔ اور پھر جب عدالت نے مجرم ثابت کیا تو ۴ سال قید بامشقت نیز ملازمت سے برطرفی کی سزا سنائی گئی۔ ۲۵۰ روپے جرمانہ بھی سزا کے طور پر دینا تھا۔ اور عدم ادائیگی کی صورت میں ۶ ماہ قید بامشقت کی سزا بھگتنا تھی۔ لیکن آپ مقررہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی ۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا کر دیئے گئے۔

آپ کا میدان تو نثر ہی ہے جس میں حقائق، جوانی کا چلبلا پن اور مزاح کی کچھ پرسنٹیج (Percentage) شامل ہے۔ لیکن آپ نے جو شاعری کی اس میں بھی کوئی سقم نہیں رہنے دیا۔ آپ کی شاعری میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر کے طبقے کا مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ جس کو میں ماحول کا اثر ہی کہوں گا۔ جو جیل میں ان لوگوں کے ہمراہ رہنے سے ہوا۔ لیکن آپ کی شوخ فطرت نے آپ کی شاعری میں شوخی اور محبت شامل کر کے ان ترقی پسند شعراء سے آپ کو تھوڑا سا علیحدہ کر دیا۔

ooo

غزلیات

شیوۂ شیفتگاں مہر و وفا ہے کہ جو تھی
دلبروں کی بھی وہ ہی طرزِ جفا ہے کہ جو تھی

آج بھی عقل سے بیگانہ ہیں عشاق تمام
دشمنِ ہوش حسینوں کی ادا ہے کہ جو تھی

رنگِ نو یار نے اپنایا، پر اے وضعِ قدیم
اس سیہ آنکھ کی فطرت میں حیا ہے کہ جو تھی

اجنبی دیس میں، میں وقفِ الم ہوں، یعنی
ہر حسیں چیز یہاں تیرے سوا ہے کہ جو تھی

خندہ زن دشتِ غریباں پہ وہی بادِ سموم
موجزن گلشنِ ثروت میں صبا ہے کہ جو تھی

وہی بے چارگیٔ قافلۂ قوم ہنوز
وہی آوارگیٔ راہنما ہے کہ جو تھی

اے ظفر غور کیا ہم نے بہت پہروں تک
عقل کی حد سے پرے ذاتِ خدا ہے کہ جو تھی

کیا کریں ضد ہے ملوکیتِ شاہاں سے ہمیں
ورنہ الفت تو نہیں ہے درِ زنداں سے ہمیں

ہم غمِ زیست کے قیدی، وہ محبت کے اسیر
کوئی نسبت ہی نہیں، یوسفِ کنعاں سے ہمیں

ہو گئیں دل پہ گراں اہلِ دول کی صبحیں
یوں پڑا سابقہ کچھ شامِ غریباں سے ہمیں

حاکمِ شہر نے گو دور قفس میں پھینکا
بوئے گل آتی رہی بادِ گلستاں سے ہمیں

تلوے چھل چھل کے ہوئے آبلہ پائی کے حریف
خوف آئے گا بھلا خارِ مغیلاں سے ہمیں؟

خواہشِ حور نہیں اور نہ دوزخ پہ یقیں
ناصحا! باز نہ رکھ لذتِ عصیاں سے ہمیں

کیا یہ ممکن ہے انہیں اپنی جفا یاد آئی؟
آج جو کچھ نظر آتے ہیں پریشاں سے ہمیں

غیر کی بزم میں گو بھیس بدل کر پہنچے
یار پہچان گیا چاکِ گریباں سے ہمیں

میں ظفر ہوں، جی وہی آپ کا دیرینہ غلام
اس طرح دیکھئے مت دیدۂ حیراں سے ہمیں

کیپٹن صدیق کلیم

انگریزی اور اردو لٹریچر پڑھنے والوں میں سے اکثر لوگ پروفیسر صدیق کلیم کو تو جانتے ہیں۔ لیکن ان میں سے شاید ایک فیصد قاری بھی کیپٹن صدیق کلیم سے واقف نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخصیت کے دو عکس ہیں۔ گو کیپٹن صدیق کلیم بہت کم عرصہ یعنی صرف چار سال خاکی یونیفارم میں رہے۔ لیکن اقارب کے قرطاسِ دل پر نقش ہو کر رہ گئے اور پی ایم اے کاکول میں آج بھی جب اچھے اور معتبر فوجی اساتذہ کا ذکر چلتا ہے تو ان میں آپ کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔

جناب صدیق کلیم ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ دسمبر کے ذکر سے میں سوچنے لگ گیا ہوں کہ کیا دن بھی اچھے یا بُرے ہو سکتے؟ کیا تاریخوں کے سر بھی الزام تھوپے جا سکتے ہیں؟ ایسے الزام جو تاریخ کا حصہ بن جائیں۔ خیر ۔۔۔ چھوڑیئے اس تذکرے کو ۔۔۔!

آپ نے امرتسر سے ہی اپنی تعلیمی مسافت شروع کی اور ۱۹۴۱ء میں ایم اے او کالج امرتسر سے بی اے آنرز کی ڈگری لے کر باہر کی سوچی۔ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا اور پھر وطن کو پدھارے۔ جہاں ایم اے او کالج امرتسر سے ہی اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ جب برصغیر کی تقسیم ہوئی اور مسلمانانِ ہند کو اپنا علیحدہ وطن نصیب ہوا تو آپ بھی پاکستان آگئے اور پھر فوج میں کمشن لے لیا۔ ۴ سال تک کاکول میں بطور انسٹرکٹر کام کیا۔ چونکہ آپ تحقیق کرنا چاہتے تھے اور فوج میں رہتے ہوئے یہ کام ذرا مشکل تھا۔ اس لیے فوج سے مستعفی ہو گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ جہاں انگریزی ادبیات تقریباً ۱۸ سال تک یعنی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۱ء تک پڑھاتے رہے۔ اسی عرصے میں آپ نے ۱۹۶۰ء میں لندن یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی ادبیات) کی ریسرچ ڈگری حاصل کی۔ یہ ریسرچ شیلے اور اوے نائٹس کے مسئلے پر کی۔ جو انگریزی ادبیات اور برطانوی تاریخ معاشرتی ترقیات میں فکر انگیز اضافہ شمار ہوئی۔ پھر ۱۹۷۱ء میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج لاہور کے کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اُردو اور انگریزی ادبیات میں تنقید آپ کا موضوع ہے۔ لیکن آپ نے اردو میں شعر بھی کہے۔ جو مقبول ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں "دمِ نیم سوز" (شاعری)، "شیکسپیئر"، "نئی تنقید"، "روشنیوں کا سفر" (شاعری)، اور "آگ کا سنگیت" (شاعری) شامل ہیں۔ OOO

شام و سحر

جو بات بات پر بگڑے وہ بات بنتی ہے — چمک چمک کے حسین شام رات بنتی ہے
کبھی تو گزرے گا منزل سے قافلہ دل کا — حیات اپنے سفر میں ممات بنتی ہے
خوشی کا رقص اداسی کا نغمہ ہے گویا — نگاہِ لطف و کرم واردات بنتی ہے
لبوں پہ مہرِ خموشی دلوں میں گویائی — فریبِ طرزِ سخن ہو تو بات بنتی ہے
فسردہ کیف نظارہ، فروغِ حسنِ بتاں — شعورِ زیست کی یوں کائنات بنتی ہے

تمام کیف ہو پھولوں کا دردِ کانٹوں کا
وصالِ شام و سحر سے حیات بنتی ہے

اداس شامیں

اداس شامیں اداس منظر اداس راہیں اداس پیکر
طویل تر ہے طویل شب ہے ہماری صبحوں کی یہ اداسی
نہ صبر ہم کو دفورِ غم سے نہ آس ہم کو ہنسی خوشی سے
کہ دھیرے دھیرے بہت بڑھی ہے یہ ہم نشینوں کی نامرادی
جوان راتیں، شباب کے دن، اداسیوں میں گزر رہے ہیں
کبھی طبیعت ہے غیر حاضر کبھی کشش زندگی کی کم تر
نہ کیفِ محفل نہ سوزِ خلوت نہ سود و سودا نہ بے نیازی
نہ جستجو کی مہم پہ مائل نہ کاوشِ فکر میں مگن ہیں
ہزار دھندے ادھر ادھر کے مگر زباں کوش سوز و فن ہیں
ہمیں فراغت نصیب بھی ہے مگر قرار و سکوں نہیں ہے
جمود چھایا ہے زندگی پر ہماری قسمت جنوں نہیں ہے

کیپٹن ایم ایف رحمان

"کل" کاایک لمحہ (جی ہاں! وہ ایک لمحہ ہی تھا) ایسا بھی گزرا ہے کہ جب بھی اسے دل کے آئینے میں جھانک کر دیکھتے ہیں تو اسے لہو رنگ دیکھ کر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے باہر نکلنے لگتا ہے۔ کیا زمانہ تھا جب پاکستان مکمل تھا اور اس کے مشرقی اور مغربی بازو دونوں سلامت تھے ۰۰۰ بھائی یعنی خونی رشتے بھلا کس کو پیارے نہیں ہوتے ۰۰۰ یہ سانحہ (مشرقی پاکستان) پاکستانی عوام کے لیے بالخصوص اور تمام عالم اسلام کے لیے بالعموم ایک عظیم المیہ تھا۔ جس کے زخم کا لہو تاحشر ہماری رگوں سے ناسور کی صورت رِستا رہے گا۔ بشرطیکہ ہمارے ضمیر کی یہ رگیں بالکل مردہ نہ ہو جائیں یا کاٹ کر پھینک نہ دی جائیں۔ آج جب ہم ۱۹۷۱ء کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہ حالات ایک بھیانک خواب کی شکل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اتنے ڈراؤنے ہوتے ہیں کہ وجود کپکپانے لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صدیوں پرانی کسی اندوھناک غار میں داخل ہو چکے ہوں۔ یہ خوف ہمیں نجانے کیوں اندر ہی اندر گھن کی صورت کھائے جا رہا ہے۔ یہ ہماری بزدلی نہیں بلکہ سیاست کی کرشمہ سازی تھی۔ اقتدار کے بھوکے سیاست دانوں نے "تم اُدھر ہم اِدھر" کی شمشیر سے حصے بخرے کر دیئے اور اس کھیل کا شکار پاک فوج کو بننا پڑا۔ پچانوے ہزار افراد جنگی قیدی ہوئے ان خوفناک اور اذیت دہ لمحات کا اظہار ادبا اور شعراء بھی ایک فرض سمجھ کر کرتے رہتے ہیں اور اپنے تاثرات کو، متفقہ دکھوں کو، قوم کی سوچ کو، وطن کے باسیوں کے خیالات کو لفظوں میں لپیٹ کر ہم تک پہنچاتے رہتے ہیں۔

کیپٹن ایم ایف رحمان ایک عسکری اور شاعر ہونے کے سبب بھلا پیچھے کیسے رہتے۔ آپ کے پاس مشاہدہ بھی ہے اور اظہار کے فن سے واقفیت بھی۔ آپ نے اکثر اپنی نظموں سے ان تجربات و مشاہدات سے قوم کو آگاہ کیا ہے۔ آپ نے کبھی بزدلی کی بات نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ حوصلے کی بات کی ہے۔ آپ نے نئے جذبوں اور نئی امنگوں کی بات کی ہے۔ آنے والی نسلوں کو باہمت سوچ اور پُر تر خیالات دیئے ہیں۔

آپ کی ایک بڑی پیاری نظم میں نے منتخب کی ہے۔ جس میں ایک بہن کے تاثرات ہیں۔ جس کا بھائی شہید ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بہن کے ایک بھائی کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کی بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کی آواز ہے۔ ○○○

تمہیں رہے نہ مرا فکر اے مرے بھیا

شہید بھیا ! مرے بھیا ! اے مرے بھیا
تمہارے واسطے الفت کے پھول لائی ہوں
خزاں کی زد میں نہ آئے کبھی ہمارا چمن وطن کی خاک میں تو نے لہو بکھیرا ہے
اندھیرے دور ہوئے اب تمام راہوں سے پلٹ گئی ہے شب ظلم اب سویرا ہے
بہت ہی دور ہو مجھ سے مگر مرے بھیا
طمانیت ہے مجھے ، مسکراتی آئی ہوں
ہزاروں بہنوں کے بھائی ہو تم مرے بھیا تمہیں ہزاروں ہی مائیں سلام کہتی ہیں
کئی سہاگ بچائے ہیں تو نے جاں دے کر کئی خموش نگاہیں سلام کہتی ہیں
ہیں میری پلکوں پہ آنسو مگر خدا کی قسم
شہید بھیا ! میں سر بھی اٹھا کے آئی ہوں
وہ خاکی وردی پہ پھیلا ہوا تمہارا لہو اسے دوپٹے پہ اپنے سجا لیا میں نے
تمہارے چہرے پہ بکھرا ہوا وہ عزم جواں اسے حیات کا حاصل بنا لیا میں نے
تمہیں رہے نہ مرا فکر اے مرے بھیا
میں آج تم کو فقط یہ بتانے آئی ہوں
کہ اس وطن کے سبھی مرد میرے بھائی ہیں وطن پر مٹنے کی قسمیں جنہوں نے کھائی ہیں
یہ جانتے ہیں کہ جاں کس طرح کریں قرباں بلند ہمتیں ان کی ہیں ، حوصلے [illegible]
کسی غنیم نے اپنا قدم بڑھایا کبھی کسی بھی سانپ نے سر کو اگر اٹھایا کبھی
مجھے یقیں ہے یہ اس کو مٹا کے رکھ دیں گے اسے تباہ کریں گے جلا کے رکھ دیں گے
میں آج تم کو فقط یہ بتانے آئی ہوں
تمہارے واسطے الفت کے پھول لائی ہوں
شہید بھیا ! میرے بھیا ! اے مرے بھیا

کیپٹن اختر حسین (اختر جعفری)

اختر حسین جعفری، اختر حسین جعفری اب اختر حسین اختر اور اختر حسین جعفری موجودہ اختر جعفری تینوں الگ شخصیات ہیں اور اردو شاعری میں تینوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ زیرِ تذکرہ اختر جعفری ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء کو دائرہ دین پناہ کے ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد فقیر نور محمد جعفری اردو اور سرائیکی زبان کے شاعر تھے۔ یوں یہ جراثیم آپ کو والد کی طرف سے ورثے میں ملے۔ جناب اختر حسین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے کتابیں جن کا اوڑھنا بچھونا اور اسناد کا حصول شوق ہوتا ہے۔ جو کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے بلکہ کچھ اور بھی حاصل کرلو، کے چکر میں رہتے ہیں۔ آپ نے تعلیم کے حصول میں بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے ایم اے اردو کیا۔ لیکن جی نہ بھرا تو فارسی کے ماسٹر ہو گئے۔ اسے بھی کم جانا تو ایم اے فلاسفی کیا درس و تدریس کی طرف رخ کیا تو اردو کے اور پھر فارسی کے لیکچرار رہے۔ یہاں سے جی اکتایا تو فوج کی طرف آ گئے اور ۱۹۶۷ء میں کمشن لے لیا۔ پھر وطن کی حفاظت اور خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر عسکری خدمات میں جت گئے۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں آپ بھی اسیر ہوئے اور دشمن کی قید و بند کی صعوبتیں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بخوشی برداشت کیں۔ بلکہ حوصلہ اس قدر تھا کہ آپ نے وہاں سے اہلِ وطن کو پیغام بھیجا ؂

ہم جو بھی کر رہے ہیں یہ وقت کی صدا ہے
احسان تو نہیں ہے یہ فرض کی ادا ہے
یہ ظلمتِ اسیری کوئی ستم نہیں ہے
ہوں لاکھ جو مصائب ان کا بھی غم نہیں ہے

واپس لوٹے تو فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ کیپٹن اختر جعفری نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کبھی نظم، کبھی رباعی، کبھی سانیٹ تو کبھی قطعہ کہا۔ لیکن آپ نے غزل پر زیادہ توجہ دی۔ ابتدا میں آپ لمبی بحر کی غزل کہتے تھے لیکن بعد میں زیادہ تر چھوٹی بحر استعمال کی فارسی چونکہ آپ کا مضمون رہا ہے اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی تراکیب اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کی غزل کو حسین بنا دیتی ہیں۔ رومان پرور تخیل، نرم و نازک اور چنچل جذبے، سرمستی اور رعنائی کی کیفیتیں، محبت کی لازوال خواہشیں اور ہجر و فراق کی لذتیں آپ کی شاعری کا مرکز و محور ہیں۔ گویا کہ زندگی اور اس کی حقیقتوں کو اپنی تمام تر خوش فہمیوں اور المیوں سمیت غزل کا موضوع بنایا ہے۔ ○○○

غزلیں

تمہاری نیندیں اچاٹ ہوں گی تمہارا دل بے قرار ہو گا
نہیں ہے ہم سے اگر ستم گر تمہیں کسی سے تو پیار ہو گا
ہمارے دل سے تمہیں گلہ ہے تمہاری راہوں میں کیوں جلا ہے
ہمارے پہلو میں دل کہاں ہے کوئی چراغِ مزار ہو گا
چمن امیدوں کا لٹ گیا ہے جلا نشیمن تو کیا ہوا ہے
اگر گری ہے یہاں پہ بجلی کہیں تو رقصِ بہار ہو گا
خبر نہ تھی یونہی دل جلے گا پلک پلک سے لہو گرے گا
کوئی ستم پہ ستم کرے گا کوئی وفا پر نثار ہوگا
ہوا ہے کیا جو شکستہ پا ہیں تمہاری محفل میں بے صدا ہیں
کبھی تو کروٹ زمانہ لے گا کبھی تو ہم پہ نکھار ہو گا
پریشاں زلفیں نگاہیں ویراں لبوں پہ آہیں اداس چہرہ
کہیں ملے تو سمجھ ہی لینا وہ اخترِ دل فگار ہو گا

ہر کلی بے کلی سی لگتی ہے
آگ دل میں دبی سی لگتی ہے

آپ کو زندگی کہوں کیسے
زندگی عارضی سی لگتی ہے

جھلملاتی ہے لو چراغوں کی
رات کچھ آخری سی لگتی ہے

یہ ستم یہ کرم زمانے کے
ہر ادا آپ کی سی لگتی ہے

کون گزرا ہے دل کے صحرا سے
دور تک چاندنی سی لگتی ہے

جستجو میں تمام عمر کٹی
جستجو آگہی سی لگتی ہے

کیا مکمل فریب ہے اختر
دشمنی دوستی سی لگتی ہے

کیپٹن انور مقصود زاہدی

انور مقصود زاہدی ۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ایک پرانے حوالے کے مطابق آپ ۹ جولائی ۱۹۴۵ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے اور پاکستان بننے پر کم سنی میں ہی اپنے والد سید مقصود زاہدی کے ہمراہ خطہ پاک میں آگئے۔۰۰۰ گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان سے ۱۹۶۳ء میں بڑے اچھے نمبروں میں ایف ایس سی کیا۔ اس دوران آپ کالج کے مجلہ "اللیلُ السحر" کے مدیر رہے۔ ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اور پھر نشتر کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۷۰ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ آپ نشتر میڈیکل کالج کے میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۷۱ء میں جب مادرِ وطن کو اپنے ہر بیٹے کے خون کی ضرورت پڑی تو آپ نے میڈیکل کور کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ یوں ۲۷ نومبر ۱۹۷۱ء کو آپ بحیثیت لیفٹننٹ کمشن پا کر پاک فوج میں شامل ہو گئے۔ تقریباً تین سال خدمات سرانجام دیں۔ جب دیکھا کہ اب حالات بالکل معمول پر آگئے ہیں تو مستعفی ہو گئے۔ اور پھر آپ ایران چلے گئے۔ جہاں تقریباً چار سال گزارے۔ واپس آکر کچھ عرصہ ملتان میں پریکٹس کی اور پھر اسلام آباد آگئے۔ اور کیپیٹل ہسپتال کو جوائن کر لیا۔ جہاں لگ بھگ سابقہ ۱۲ سال سے مریضوں کی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور زاہدی نثر نگار اور شاعر دونوں حیثیتوں سے ابھرے اور چھا گئے۔ شاعری کے جراثیم آپ کے پورے خاندان میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کے والد سید مقصود زاہدی ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ بلکہ قطعہ اور رباعی میں تو آپ کا جواب نہیں۔ آپ کی ہمشیرہ ماہ طلعت زاہدی نے شاعری میں اپنا ایک الگ مقام بنا رکھا ہے۔ انور زاہدی پاک و ہند کے تقریباً تمام ممتاز پرچوں کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ آپ جدید طرزِ احساس کے شاعر ہیں۔ زیادہ تر نظم کہتے ہیں۔ جن میں ایک اشارہ ہوتا ہے۔ اور یہی اشارہ آپ کو ممتاز ٹھہراتا ہے۔ نئے لفظ اور معانی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور نئے نئے رنگ لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کتب "دریچوں میں ہوا"، "سنہرے دنوں کی شاعری"، بارشوں کا موسم"، عذابِ شہر پناہ" ہیں۔ ○○○

اجنبی بستیوں کا فسوں مجھ سے گویائی بھی لے گیا

اجنبی بستیوں کا فسوں، جاننے کا تجسس
مجھے اپنے گھر سے بہت دور
ویران رستوں، فلک چھونے والے پہاڑوں، حسیں وادیوں
پُرسکوں ساحلوں، خوشنما اجلے شہروں میں لے کر گیا
میں نے جنگل میں روتی ہوا کو سُنا
پتھروں سے گلے مل کے گاتے ہوئے بہتے جھرنوں کے نغمے سنے
برف پر جھلملاتی ہوئی دھوپ کا نقرئی رقص آنکھوں میں میری اتر تا گیا
وقت کے ہاتھوں پتھرائے چہرے
مجھے اجنبی بستیوں میں بھی اکثر ملے
دلربا لڑکیوں کی حسیں ساعتوں کی رفاقت ملی
شوخ دل نوجوانوں کے ہمراہ مل بیٹھ کر قہقہوں کی سعادت ملی
سارے جذبے وہی
مسکراتے ہوئے آتشیں لب وہی
تمتماتے ہوئے سرخ چہروں پہ جذبات کی دھوپ بھی
قہقہے بھی وہی
شورِ محفل بھی ایسا ہی اکثر رہا
اور بچھڑتے ہوئے آنسوؤں سے بھری چشمِ پُرنم وہی
اجنبی بستیوں سے میں گھر آگیا
مجھ سے جو بھی ملا
اس نے یہ ہی کہا
تم کہاں رہ گئے
کون سے دشت میں جا کے گم ہو گئے
سر کے بالوں میں چاندی سجائے ہوئے اتنی جلدی بڑھاپے میں تم کھو گئے
تم نہیں تھے یہاں

شہر میں کتنے طوفان آئے
گھروں سے گزرتے گئے
ہم تمہیں ڈھونڈتے
چاند، تاروں سے، سورج سے پوچھا کئے، راہ تکتے رہے
تم بھی کب آئے ہو
جب قیامت سروں سے گزر بھی گئی
شہر میں اک ہری کین آکر گیا
شہر کے سب سے چھتنار برگد کو جو کھا گیا
شہر اب بھی وہی
شاہراہوں پہ اک سیل ہر دم رواں
چمنیوں سے نکلتا ہے اب بھی دھواں
اجنبی بستیوں کا فسوں، جاننے کا تجسس
مگر مجھ سے گویائی بھی لے گیا

☆

کیپٹن مسعود احمد عباسی

شعر جذبات و احساسات کا عکس ہوتا ہے جو زندگی کا ترجمان اور اظہارِ خیال کا ایک عمدہ و نفیس ذریعہ ہے۔ اس ذریعے کو اکثر لوگ اپناتے ہیں اور بڑے دلکش پیرائے میں دل کی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فوج میں خدمات انجام دینے والے افراد ماحول اور تربیت سے اسے بدل دیتے ہیں کہ وہ جذبات واحساسات کو قطعی طور پر فراموش کر دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک فوجی کے سامنے ہر وقت صرف ملک و قوم کے تحفظ اور وطن کی خدمت کا فرض ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا سراسر زیادتی ہے کہ یہ اشخاص جذبوں کی کیفیات سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرائمری ٹاسک سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ سیکنڈری ٹاسک کے بارے سوچیں۔ اور جب کبھی وقت ملتا ہے تو پھر دل و دماغ کے اندر دبے لاوے کو باہر لاتے ہیں اور دھڑنے سے لاتے ہیں۔ اور دنیا دیکھتی ہے کہ کوئی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ یہ دل کے نہاں خانے میں پوشیدہ لطیف جذبات جب لفظوں کی صورت ابھر کر سامنے آتے ہیں تو دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ کیونکہ دشمن کے خلاف ہاتھوں کو استعمال کرنے والے یہ صاحبان، دل و دماغ کو جب استعمال کرتے ہیں تو اس میدان میں بھی فتح و ظفر کے جھنڈے گاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک پاکستانی سپاہی کبھی شکست کا لفظ اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتا۔ وہ ہر میدان میں سرخروئی چاہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ قسمت اسے کوئی اور نتیجہ دکھادے۔

بہرحال بات ادب کی ہو رہی ہے تو جناب مسعود احمد عباسی ادب کے ایک درخشندہ ستارے ہیں۔ آپ نے اپنے پرائمری ٹاسک سے تھوڑا بہت وقت نکال کر سیکنڈری ٹاسک بھی پورا کرنے کی کوشش کی اور اس میں شاعری کو انتخاب کیا۔ جس میں صنفِ غزل میں اپنے پوشیدہ جذبات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی غزل پڑھ کر یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ محبت کو آپ کلیدی جذبہ سمجھتے ہیں۔ اور دراصل یہی کلید ہی دل کے اندر موجزن لہروں کو کواڑ کھول کر کنارِ دل سے باہر لاتی ہے۔ ○○○

غزلیات

پنکھ بن پنچھی بھلا کیوں مائلِ پرواز ہو
جو بہاروں میں لئے کیوں قائلِ اعجاز ہو

ان کا مٹنا اپنا لُٹنا پل دو پل کا حادثہ
کھو گئے صحرا میں جیسے جرس کی آواز ہو

خاکِ ویرانہ چھپا لے ان کو یہ ممکن نہیں
صورتِ لالہ و گل میں کوئی شاید راز ہو

رُک نہیں سکتا مرے غم سے نظامِ کائنات
میرے بچھڑوں سا مگر دنیا میں کوئی شاذ ہو

رنج و غم، یاس و الم، آہ و فغاں یہ کس لئے
ان کا ماتم کفر ہے جن پر خدا کو ناز ہو

آہیں بھرنے سے نہیں مسعود کوئی فائدہ
ہو روش تیری وہی، ویسا ترا انداز ہو

★

میری جاں یہ حجاب کیسا ہے
رُخ پہ آخر نقاب کیسا ہے

سات پردوں میں جو رہے مخفی
تم ہی کہنا شباب کیسا ہے

آکے برسیں مگر رہیں پیاسے
لوگ پوچھیں سحاب کیسا ہے

میری ہر التجا کے بدلے میں
اس کا ہنسنا ، جواب کیسا ہے

حسنِ جاناں ہے دیدہ زیب بہت
عشق اپنا جناب کیسا ہے

کیپٹن محمد نسیم ارشد (باصر نسیم)

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک کورس کے سلسلے میں جانا پڑا۔ وہاں ہمارے ساتھ ایجوکیشن کور کے ایک کپتان صاحب بھی تھے۔ مجھے پڑھے لکھے لوگوں سے بلا تفریق ایک اُنس سا ہے۔ لہٰذا میں پہلے دن ہی ان سے ملا۔ بات چیت کے دوران میں نے ایجوکیشن کور کے کئی ایسے نام گنوائے جن کو میں پڑھ چکا تھا۔ جب باصر نسیم کا نام ہونٹوں پر آیا تو انہوں نے جھٹ پوچھا۔ "آپ کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے ان کی چند غزلیں پڑھی ہیں۔ جو صاف ظاہر ہے مجھے پسند آئیں۔ تبھی تو نام یاد ہے۔ بس بات آئی گئی ہو گئی۔ القصہ کہ چند دنوں بعد جب دوبارہ ذکر ہوا تو انہوں نے اپنا تعارف باصر نسیم کے حوالے سے کرایا۔ جناب محمد نسیم ارشد ولد حاجی محمد قسیم ۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء صوبہ سرحد کے مرکزی شہر پشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ پشاور سے تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج پشاور سے بی اے کیا اور پھر پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے اسلامیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ البتہ ایم اے اردو ریگولر سٹوڈنٹ کی حیثیت سے اور ملازمت کے دوران ایم اے اسلامیات پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔

۱۹۸۴ء میں پاک فوج میں آپ نے کمشن لیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے سے آرمی ایجوکیشن میں نئی زندگی کی شروعات کیں۔

باصر نسیم کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ آپ پشاور میں ہندکو زبان کی تنظیم ہندکو آرٹس کونسل کے بانی اراکین میں سے ہیں۔ جس کے آپ نائب صدر بھی رہے۔ پھر ۱۹۸۰ء میں اپنی تنظیم ہندکو لٹریری آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی۔ جو آپ کی عدم موجودگی میں بھی برسرِ عمل ہے۔ آپ نے پشاور ریڈیو اور ٹی وی کے کئی پروگراموں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ آپ نثر اور نظم دونوں اصناف میں قلم ماری کرتے ہیں اور آپ کی تحریریں "جمہور" (ایبٹ آباد)، فیضان (پشاور)، دیدہ ور (پشاور)، کیڈٹ کالج کوہاٹ کے میگزین اور فوج میں چھپنے والے مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کی کوئی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ اجتماعی مجموعے "کلیاں" اور "زخمِ دل" میں آپ کا کلام موجود ہے۔ آپ نے اپنے بیان کی تصدیق یوں کی ہے ؎

جو کہا آپ نے نسیم درست

آپ سا محرمِ حیات کہاں

غزلیات

ایک ہی موسم مری آنکھوں میں تھا
زندگی بھر کا سفر آنکھوں میں تھا

جب جلا دامن تو اندازہ ہوا
رات بھر میرا ہی گھر شعلوں میں تھا

اونچے پیڑوں کی جڑیں کمزور تھیں
یا بلا کا شور طوفانوں میں تھا

بے لباسی کی ہوا ایسی چلی
شوقِ عریانی گھنے پیڑوں میں تھا

ہر دریچہ بند ہونٹوں کی طرح
کیسا سناٹا مرے شہروں میں تھا

کرب کا بادل مری تقدیر کیوں
اے خدا میں بھی ترے بندوں میں تھا

جسم کی دیوار تو محفوظ تھی
میں پسِ دیوار کچھ خطروں میں تھا

زلزلوں سے کھل گیا صیاد پر
کیسا شورِ آگہی پنجروں میں تھا

باصر اس کی آنکھ بھی نم تھی یہاں
جس کا رہنا سہنا ہی پھولوں میں تھا

نہ کام آئے مرے روشنی کے سرمائے
اندھیرا اوڑھنے والا سویرا ٹھکرائے

یہ کیسی رت ہے گلستاں میں الاماں توبہ
کچل کے رکھ دیئے پیڑوں نے اپنے ہی سائے

یہ ملنگے تلنگے کا سکہ نہیں وجود میرا
کہ تری ذات کے کشکول سے لپٹ جائے

لہو پکار سنیں یا تری رضا پوچھیں
یہ کشمکش ہی رہی فیصلہ نہ کر پائے

انا پرست رہی وہ انا کو بیچ کے بھی
انا فروش بنے وہ جو سر کٹا آئے

کئی عذاب سہے پھر بھی ہم رہے زندہ
بس ایک بار بکے اور پھر نہ جی پائے

یہ کیسا حبس مرے گھر میں آج اُترا ہے
کہ آنکھ روئے مگر بوجھ بڑھتا ہی جائے

کیپٹن محمود الرحمٰن

ساغر کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

نجانے یہ شعر کس ساغر کا ہے ساغر صدیقی کا یا ساغر نظامی کا۔ دونوں کے کلیات میں یہ شعر غالباً ایک آدھ حرف کے ردوبدل سے موجود ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کرنل محمد خان کے تعارف میں کسی طالب علم نے اپنے پرچۂ امتحان میں محمد خان ڈاکو اور کرنل موصوف کو گڈمڈ کر دیا تھا۔

"تحریک آزادی کے شاعر" اور "کلیاتِ داغ" پڑھ کر یہ سوچ میرے ذہن میں ابھری کہ کل کا نوجوان شاید میری طرح تذبذب کا شکار ہو کہ یہ کتابیں کس ڈاکٹر محمود الرحمن کی لکھی ہوئی ہیں۔

بہرحال ۰۰۰ ڈاکٹر محمود الرحمن جو میرے زیرِ قلم ہیں، ایک اچھے مقرر، قاری، حافظِ قرآن، جسمانی اعضاء و میڈیکل ڈاکٹر اور ایک عمدہ شاعر ہیں اور نوجوان ہیں۔ جبکہ دوسرے محمود الرحمن جو کئی کتب کے مصنف ہیں، پی ایچ ڈی ڈاکٹر اور ڈھلتی عمر کے جوان ہیں۔

کیپٹن محمود الرحمن نے ۱۹۷۶ء میں پشاور بورڈ سے جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو بورڈ بھر میں آپ کی پہلی پوزیشن تھی۔ ایف ایس سی بھی اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور پھر ایم بی بی ایس میں داخلہ لے لیا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد کچھ عرصہ گزار کر آپ فوج میں آ گئے۔ جہاں ۱۹۸۵ء میں آپ کو بحیثیت کیپٹن کمشن دیا گیا۔

آپ سکول اور کالج لائف کے تمام شوق سینے سے لگائے رواں دواں ہیں۔ تقریری، مباحثی اور قرأت کے مقابلوں میں اکثر نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ شعر گوئی کا شوق بھی نبھا رہے ہیں۔ کیونکہ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آپ کی شاعری روایت اور جدیدیت کا حسین سنگم ہے۔ غزل میں آپ نے غزل کے فطری رجحان کو اپنے انداز میں ڈھالا ہے اور اس انداز کو ساتھ لے کر چلے ہیں۔ ○○○

غزلیں

تو نے اک بار جسے پیار سے دیکھا ہوگا — اس نے کیا کیا نہ ترے بارے میں سوچا ہوگا
میں یہ سمجھا تھا کوئی اور تماشا ہوگا — کیا خبر تھی سرِ محفل مرا قصہ ہوگا
اس کی آنکھوں میں جچے گا نہ کبھی حسنِ قمر — جس کی آنکھوں میں ترا روپ سمایا ہوگا
جس طرح میں نے محبت میں بہایا ہے لہو — اس طرح ابر لگاتار نہ برسا ہوگا
رات کی تلخ حقیقت سے نہ گھبرا محمودؔ
تیرے افکار سے دنیا میں اجالا ہوگا

پھر سے بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہو — کس لئے گزرے زمانے کو صدا دیتے ہو
ہم جلاتے ہیں امیدوں کے دیئے راہوں میں — تم کہ دامانِ تغافل سے بجھا دیتے ہو
زندگی ایک سلگتا ہوا ویرانہ ہے — کتنے بے رحم ہو جینے کی دعا دیتے ہو
ہم سے وعدہ ہے فقط، غیر سے ملنا تیرا — جرمِ الفت کی بہت خوب سزا دیتے ہو
اس پہ بھی زعم کہ اشعار تمہارے محمودؔ
کوئی کہتا ہے غزل تم تو سنا دیتے ہو

کیپٹن جاوید اقبال خان

پوسٹ گریجوایشن کے بعد جاوید اقبال نے اپنا مستقبل فوج کے حوالے کر دیا اور ۱۹۸۵ء میں آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن حاصل کیا۔ درس و تدریس کے اس شعبے میں آپ نے کئی ایک مقامات پر اور مختلف عہدوں پر فرائض کو نبھایا اور نبھا رہے ہیں۔ شاعری کبھی کبھار کرتے ہیں اور ٹھیک کرتے ہیں۔ اس میں آپ کو نظم پسند ہے۔ جس میں اچھوتے اچھوتے خیالات اور سندر سندر سوچیں لے کر آتے ہیں۔ جو پہلی بار پڑھنے پر خواب اور دوسری بار مطالعے سے تعبیر دکھائی دیتی ہے۔ کہنے کو یہ نظم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی چاشنی اور لذت غزل جیسی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گویا غزل کے سفر سے گزر رہے ہیں۔ غزل کے سفر سے گزرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ نے کبھی غزل کہی بھی ہے تو اس میں نظم سا لطف پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

اٹھ ہی جائیں گے تیری محفل سے ‏ ‏ آ کے بیٹھے ہیں دو گھڑی کے لئے
یہ کلیسا، یہ بت کدہ، یہ حرم ‏ ‏ سو خدا ہیں اک آدمی کے لئے
حور و غلمان کوثر و تسنیم ‏ ‏ کیا تکلف ہے شیخ جی کے لئے

لیکن کیپٹن جاوید اقبال خان کی نظم پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک الگ تشخص رکھتے ہیں اور آپ کی شخصیت مختلف محاکات اور موضوعات سے ابھرتی ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ دکھ ایک جزوِ حیات ہے۔ پھر بھی اس سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ جھیلتے ضرور ہیں لیکن روگ نہیں بننے دیتے۔ ماضی کی یادوں کو سرمایہ تو سمجھتے ہیں لیکن اس کا تعلق حال اور مستقبل سے جوڑ کر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ ماضی کو عذاب کہتے ضرور ہیں لیکن سراب کی حد تک۔ ایک ایک لمحے کو ایک ایک صدی کی شاعرانہ تعلی میں بند کرتے ہوئے حسین لمحوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور جب اسے بھلانے میں ناکام رہتے ہیں تو انہی لمحوں سے دل کو خوش کر کے عقیدت کی لو بڑھا لیتے ہیں۔ اور اس پوری داستان کو روحانیت کا سفر سمجھ کر پھر ل بیٹھنے کی تراکیب نکالتے ہیں۔ آوازوں کا پیچھا بھی کرتے ہیں اور ان سے بچ کر اپنا سفر بھی جاری رکھتے ہیں۔ ○○○

وہ ایک لمحہ

وہ ایک لمحہ عذاب بن کر مری رگوں میں اتر رہا ہے
وہ ایک لمحہ سراب بن کر مری نظر میں مچل رہا ہے

وہ ایک لمحہ

اُس ایک لمحے میں بند صدیاں
حسین جذبوں کی بہتی ندیاں
وہ ایک لمحہ کہ جس کو کب سے
بھلانا چاہوں
بھلا نہ پاؤں

وہ ایک لمحہ

کہ چاند راتوں کے رتجگے کا خراج مانگے
گھنیری زلفوں کی ظلمتوں کا حساب مانگے
پرانی یادوں کے وا دریچوں سے چھپ کے جھانکے

وہ ایک لمحہ

کہ جس کی کروٹ میں پربتوں کا وقار بھی ہے
حسین وادی کے ہر شجر کی ادا کا ٹھہرا خمار بھی ہے

وہ ایک لمحہ

کہ جس نے سندر شباب کی ہر مہک کو پہلو میں ڈھانپ رکھا
کہ جس نے پل پل ہمارے آنگن کی ساری خوشیوں کو بھانپ رکھا

وہ ایک لمحہ

مری عقیدت کی لو بڑھائے
کبھی وہ روٹھے کبھی منائے

وہ ایک لمحہ -

مجھے پکارے تجھے پکارے
کہ لوٹ آؤ، کہ لوٹ آؤ

کیپٹن عبیداللہ خان (خاور نیازی)

کیپٹن عبیداللہ خان ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء کو چینہ وٹہ
خاور نیازی کے نام سے پہچانے جانے والے کیپٹن عبیداللہ خان ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء کو چینہ وٹہ
ضلع میانوالی میں صوفی امیر عبداللہ خان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ میانوالی کے ایک معزز خاندان سے
تعلق رکھتے ہیں۔ ایک راز کی بات بتاتا چلوں چونکہ آپ کا قد کافی لمبا ہے تو اس بناء پر ایک ادیبہ
"نزہت گردیزی" نے آپ کو کالج کے عالم چنا کا خطاب دیا تھا۔ اور کہنے والے کہتے ہیں کہ لاہور کے
ناور کی مناسبت سے آپ کا تخلص خاور پڑا۔

بقول ڈاکٹر اجمل نیازی، "عبیداللہ خان کے اندر ایک پٹھان بچے کی ساری خامیاں ہیں مگر اس
میں پٹھانوں والی خوبیاں بہت کم ہیں اور یہی اس کی واحد خامی ہے۔ عبیداللہ کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے
اور ایک ہاتھ میں قلم، وہ تلوار سے بھی قلم کا کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ کامیاب کوشش کرتا ہے
اسی لیے ناکام رہتا ہے۔ شمشیر زنی سے شاعری تک اسے کسی خاص مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا۔ دونوں
کاموں کے لیے میدانِ جنگ کی حدیں کوچۂ محبوب سے آگے نہیں بڑھیں۔"

آپ نے اپنا تعلیمی سفر روائتی ماحول میں شروع کیا سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک، ایڈورڈ کالج
پشاور سے ایف اے، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور ایم اے کیا۔

خاور نیازی کی شاعری کی ابتداء کالج سے ہو چکی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین "راوی"
میں آپ لکھتے رہے اور اب تو "ماہِ نو" تک رسائی ہو چکی ہے۔ زیادہ تر غزل کہتے ہیں۔ آپ کی تحریر
میں چینہ وٹہ کی خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں۔ جو صاف و شفاف معانی کی آئینہ دار ہیں۔ آپ وحشتوں
اور اداسیوں کے باوجود مطمئن ہیں اور آپ کی نظر کل پر ہے۔ جو کل آنے والا ہے لیکن اس کل سے
آپ مایوس نہیں ہیں۔ اس میں ظلمات کو ڈھلتے اور روشنیوں کو پھیلتے دیکھ رہے ہیں۔ مقدر کی نارسائی
کا رونا لے کر آپ بیٹھ نہیں گئے بلکہ اس کے رسا ہونے کے منتظر ہیں۔ اور یہ صرف خوش آئند سپنے
نہیں بلکہ خوبصورت تعبیریں ہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ ○○○

غزلیات

حالات کی دہلیز پہ مجبور کھڑا ہے — جنگاہِ زمانہ میں جو اک عمر لڑا ہے

جس برگ نے سورج کی طرف آنکھ اٹھائی — اب دھوپ کے تپتے ہوئے صحرا میں پڑا ہے

ہر سمت ذرا دیکھ کے، ہر پاؤں سنبھل کے — رسوائی کا ہر گام پہ اک سنگ گڑا ہے

تم ہاتھ اٹھائے رہو ہر لمحہ دعا کو — ٹل جائے بلا، زیست پہ یہ وقت کڑا ہے

یکبارگی اُس چہرے سے ٹکرائیں جو نظریں — ماتھے پہ گھٹاؤں کے، لگا، چاند جڑا ہے

انساں میرے اندر کا ڈرا ہے کبھی خود سے — وقت آنے پہ پربت کے مقابل بھی اڑا ہے

شاکر یہ سبھی عقل کے ہیں حیلے بہانے
کب عشق نے دیکھا ہے کوئی کچا گھڑا ہے

اذیتِ جسم و جاں میں رہ کر رفاقتوں کا خیال لکھنا
ہمارا ہی خاصہ ہے یہ قصہ ہائے حسن و جمال لکھنا
کدورتوں کے غبار سے دل کے آئینے کو بچا کے رکھنا
ستم گروں کے ستم بھی سہنا مگر انہیں خوش خصال لکھنا
محبتوں کے امیں ہمیں ہیں وفاؤں کے راہوار بھی ہم
ہمیں نہیں ہے یہ زیب دیتا فسانۂ قیل و قال لکھنا
جو بے بسی بے کسی کی باتیں اگر کبھی لب پہ آ بھی جائیں
تو خوبصورت حروف لے کر مسرتوں کے مآل لکھنا
جو اپنے ہیں ان کے واسطے تو امان اور پیار لے کے چلنا
مگر عدوئے وطن کی قسمت میں لمحہ لمحہ زوال لکھنا
ستمکشوں کے لئے قلم کو لیا ہے ہاتھوں میں جب سے شاکر
کبھی اصولِ تفنگ لکھنا کبھی روایات ڈھال لکھنا

کیپٹن ارسلان معظم رانا [1]

آفیسرز ٹریننگ سکول میں تربیت کا عرصہ اتنا کم تھا کہ تمام ہم جولیوں سے واقفیت ہی نہ ہو سکی۔ پھر جب "ھما" مجلّہ چھپا تو چند لکھنے والے کیڈٹس سے تعارف ہوا۔ میری نعت کے ساتھ ہی ایک غزل چھپی تھی۔ شاعر کا نام تھا "ارسلان" بڑا مختصر سا۔ چھاتی پر سجی ہوئی نیم پلیٹ کی طرح۔
یہی ۱۹۸۹ء کا کیڈٹ ارسلان آج کا کیپٹن رانا ارسلان معظم میرے سامنے ہے۔ جو اتنا تیزی سے ادبی منزلیں طے کر رہا ہے کہ مجھے کچھ۔۔۔ گمان سا ہونے لگا ہے۔۔۔

جناب ارسلان ۲۱ جولائی ۱۹۶۸ء کو گکھڑ میں رانا محمد معظم کے ہاں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک وہیں تعلیم پائی اور پھر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں داخلہ لے لیا۔ کچھ عرصے کے بعد اسلامیہ کالج گوجرانوالہ اور بالآخر گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اپریل ۱۹۸۹ء میں آرمڈ کور کی ایک رجمنٹ میں کمشن ملا۔ یونٹ میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ دنیا کے سب سے اونچے محاذِ جنگ سیاچن پر بھیج دیئے گئے۔ جہاں سے تمغۂ سیاچن کے ساتھ لوٹے۔

رانا ارسلان سکول و کالج کے دور سے ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ آپ انٹر پاکستان سکولز کے بہترین مقرر، آل پاکستان کالجز کے بہترین مقرر و شاعر۔ دو دفعہ آل پاکستان تقریری مقابلہ میں پہلا انعام، آل پاکستان کالجیٹ مشاعروں میں ایک دفعہ پہلا اور ایک دفعہ دوسرا انعام حاصل کیا۔ مختلف ادبی تنظیموں کے عہدے دار بھی رہے۔ آل پاکستان انٹر کالجیٹ پنجابی مشاعرہ میں ایوارڈ اور مباحثہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔ ۱۹۹۳ء میں پاکستان آرمی کے تقریری مقابلہ میں پہلا انعام حاصل کر کے آرمی کے بہترین مقرر قرار پائے۔

فوج میں آنے سے پہلے آپ کئی ادبی رسالوں اور اخبارات میں لکھتے رہتے تھے۔ لیکن فوج میں شمولیت کے بعد عسکری مصروفیات کے باعث اس شوق کو اس پابندی سے جاری رکھنے میں کچھ ناکام رہے۔ اردو شاعری میں آپ محسن نقوی اور سید ضمیر جعفری سے اصلاح لیتے ہیں۔
انگریزی زبان میں ایک ناول لکھ رہے ہیں جبکہ اردو زبان میں ایک ناول اور ایک شعری مجموعہ طباعت کے مراحل میں ہے۔ OOO

۱۔ آپ ۱۹۹۴ء میں کراچی میں ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غزلیں

کون روتا ہے اب جدائی میں　　لوگ مرتے ہیں آشنائی میں
عظمتوں کو گنوا کے دیکھ لیا　　کتنی لذت ہے جگ ہنسائی میں
گرمیِ سانس میں جو رہتا تھا　　اب تو وہ بھی نہیں رسائی میں
آپ سے کس قدر مراسم ہوں　　ہم نے سیکھا ہے دلربائی میں
سانحہ آپ پر گزرنا تھا　　ایسا ہوتا ہے بے وفائی میں
ایک قسمت سنوار دینے سے　　فرق آتا نہیں خدائی میں

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
عمر اب قید ہے رہائی میں

بے کسی، بے خودی، غزل خوانی　　رسم الفت ہے چاک دامانی
راحتِ جاں ہے تلخیِ خوباں　　داغِ ذلت گریز سامانی
رنگ لے آئے گا کسی دن یہ　　اشک ہے آسمان کا پانی
حسنِ محبوب ہے حجابِ نظر　　چشمِ خیرہ ہے وقفِ حیرانی
حسن جاگا ہے لے کے انگڑائی　　نیلے بادل نے کی گل افشانی
دل میں جھانکا کسی کے آنچل نے　　کوئے دل میں در آئی عریانی
کس نے چھیڑا سرودِ جادو اثر　　بہتے دریا کا تھم گیا پانی

آؤ ایسے میں اک غزل کہہ دیں
تلخ یادوں کو سینچ دیں پانی

کیپٹن سید شاہد رسول

بریگیڈیئر (ر)

"جہاں بھی جاؤ محبت کا بیج بوؤ تاکہ کبھی ادھر سے دوبارہ گزرو تو ایک شجرِ سایہ دار و ثمر بار تلے آرام و فرحت محسوس کر سکو" ۔

" زبان اور سانپ میں بس ایک فرق ہے وہ یہ کہ زبان کے زہر کو شہد میں بدلا جاسکتا ہے "

یہ خوبصورت اور غور طلب اقوال ایک جواں سال مفکر کے ہیں ۔ جسے لوگ سید شاہد رسول کے نام سے جانتے ہیں ۔ آپ یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو نوشہرہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد سید رسول ایک دینی و علمی گھرانے کے فرد ہیں ۔ جنہوں نے آپ کی تربیت اسلامی ماحول میں کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ "کتاب الصلوۃ" جیسی تحریر آپ کے قلم نے اگلی ۔ جس کی انفرادیت یہ ہے کہ نماز پر لکھی گئی یہ کتاب با تصویر ہے ۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا اور بی اے کے بعد قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم اے عربی کیا ۔ کچھ عرصہ سعودی کلچرل سنٹر میں بطور ترجمان خدمات سرانجام دیں ۔ ۱۹۹۰ء میں آپ نے پاکستان ملٹری اکیڈمی سے مختصر عسکری تربیت کے بعد آرمی ایجوکیشن کور میں کمشن لیا ۔ ادب کے ساتھ آپ کو شروع ہی سے لگاؤ ہے ۔ دورانِ تعلیم یونیورسٹی اور کالج کے جریدوں میں آپ کی تحریریں چھپتی رہیں "کوہسار" "NIML" میگزین اور "POLY GLOT" شاہد کے شاہد ہیں ۔ آپ علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح ہیں اور اسی انس اور لگاؤ کے سبب اپنا ایم اے کا مقالہ عربی زبان میں علامہ اقبال پر ہی لکھا تھا ۔

کیپٹن شاہد رسول زیادہ تر آزاد نظم کہتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ توجہ نثر کو دیتے ہیں ۔ OOO

حیاتِ بے ثبات

کل شب کو تھا چراغاں
آنگن میں گھر کے میرے
تھے قمقمے بھی روشن
دیئے بھی جل رہے تھے
پروانے آ رہے تھے
لیکن ڈھلی جو شب تو

در دل کے تھے مقفل
ویراں تھا میرا آنگن
دیئے بھی بجھ چکے تھے
پروانے مر چکے تھے
امشب تو کچھ نہ ہوگا
کل شب تو تھا چراغاں

ضرورت

کسی زردار کی
جب آنکھ کی بینائی جاتی ہے
نئی وہ آنکھ دولت کے عوض بازار سے لے کر
سجالیتا ہے
جب دل چھوڑ جائے کام تو وہ بھی نیا منگوا کے پیسوں سے
لگالیتا ہے
اور
جب کوئی گردہ کام سے انکار کر دے تو
کسی مونس سے چند سکوں کے بدلے
لے کے گردہ بھی لگالیتا ہے
لیکن
کیا؟
یہ ایسا بھی کہیں ممکن ہے؟
دولت مند کی جب بھوک کم ہو جائے
تو
درکار ہو مفلس کا بھوکا پیٹ بھی اس کو
کبھی اے کاش
ایسا بھی تو ہو جائے

کیپٹن شہباز انور چوہدری

خاندانی نام: شہباز انور چوہدری　　ادبی نام: شہباز انور

ولدیت: چوہدری محمد رمضان　　تاریخ پیدائش: ۱۳ نومبر ۱۹۶۷ء

جناب شہباز انور فیصل آباد، جسے پاکستان کا مانچسٹر کہتے ہیں اور کبھی لائل پور کے نام سے مشہور تھا، میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آٹھ بازاروں کے اسی شہر میں حاصل کی اور پھر پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں جونیئر کیڈٹ کی حیثیت سے داخل ہو گئے۔ جہاں فوج میں کمشن کے حصول کے ساتھ ساتھ بی اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔

آپ بتاتے ہیں کہ "میرے گھرانے میں ادبی شوق کسی کو نہیں تھا۔ مگر معاشرے میں چند ایسے ناسور ہیں کہ جنھوں نے مجھے اس طرف مائل کر دیا۔ یعنی وہ ناانصافیاں ہیں جو بیان سے باہر ہیں اور پھر اسلام کا نام ایک کھلونے کی مانند استعمال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ؎

کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

یعنی یہ چند ایک اسباب تھے جنھوں نے شہباز کو ایک شاعر بنا دیا۔ جس کی آڑ میں آپ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کرتے ہیں۔ دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ حالات بھی بتاتے ہیں اور راہوں کا صحیح استعمال ہی نہیں بلکہ درست سمت سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

بلینک ورس کی جب ابتدار ہوئی تھی تو اس کی بہت زیادہ مخالفت کی گئی اور ان شعراء کو بے راہرو کہا گیا اور یہ تھی بھی حقیقت لیکن بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ بلکہ بہت جلدی آزاد نظم میں مثبت تبدیلی آ گئی اور شعراء اسے پابند کی نسبت زیادہ استعمال میں لانے لگے۔ یوں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور کل کی یہ بغاوت آج کی روایت بن گئی۔ جناب شہباز انور بھی اپنی دلی کیفیات کے لیے آزاد نظم کا سہارا لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی غزل بھی کہتے ہیں۔ فی الحال صرف اخبار جہاں میں چند نظمیں شائع کروانے میں کامیاب رہے ہیں اور کسی رسالے یا اخبار کی طرف توجہ نہیں دی۔

اور ہاں! آپ ایک اچھے مقرر بھی ہیں اور تقریروں کے مقابلوں میں کئی انعامات جیت چکے ہیں۔ آپ کی شاعری اور تقریر کا انداز ایک ہی ہے۔ دونوں میں مبہوت کر دیتے ہیں۔ ○○○

بے چارگی

جھینپتی نگاہوں کے دو لٹے ہوئے آنسو
بھول دیتے ہوں گے لوگ
ہم سے یہ نہیں ہوتا
پیار جیسے جذبوں کو، پتھروں کے میزاں میں
تول دیتے ہوں گے لوگ
ہم سے یہ نہیں ہوتا
وقت ہو جوان اور آرزو کا دھارا ہو
یاس کے کنارے پر اک حسیں نظارہ ہو
اس طرف چلے جانا، مصلحت کی باتیں ہوں
دوسرے کنارے پر ایک ناتواں وعدہ
ذہن و دل کی کشمکش، کشتیوں کے بادباں
داہنی کنارے پر، کھول دیتے ہوں گے لوگ
ہم سے یہ نہیں ہوتا

غزل

کس کو یاد رکھتے ہو کس کو بھول جاتے ہو
ریت کے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہو

جن پہ فاختاؤں کے پر ہی ٹوٹ جاتے ہوں
تم بھی ان درختوں پر نام لکھ کے آتے ہو

اس کے لوٹ آنے کا خواب دیکھتی آنکھیں
شام سے دریچے میں رکھ کے بیٹھ جاتے ہو

راستے کی شام کے خوفناک تیور ہیں
کس لئے سفر میں تم گھر سا اک بناتے ہو

کیپٹن محمد اکرم رضاؔ

محمد اکرم ولد تاج محمد نے ۵ مئی ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی کی دھواں دھار فضا میں آنکھ کھولی جب شعور کی دنیا میں قدم رکھا۔ تو ہر طرف گاڑیوں کا شور، صحت کو کھا جانے والی آلودگی، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر، نفسا نفسی کا عالم، بے یقینی کی کیفیت، مشینی روپ، بناوٹی چہرے اور مرجھائی شخصیتیں نظر آئیں۔ ایسے ماحول نے آپ کو خود غرض بنانے کی بجائے آپ کے معصوم دل میں محبت واخوت کی سوچ، حب الوطنی کے جذبات اور احساسات کی ایک نئی روح پیدا کر دی۔ ابھی سکول میں ہی تھے کہ حساس طبیعت کے باعث شعر موزوں ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے دل کی بات نظم میں کہنی شروع کر دی راولپنڈی میں ہی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور پھر "فول ڈے" یعنی یکم اپریل ۱۹۸۶ء کو جونیئر کیڈٹ سکیم کے تحت سلیکٹ ہو کر پاکستان ملٹری اکیڈمی پہنچ گئے۔ یہاں سلسلۂ تعلیم اور فوجی تربیت جاری رہے اور بالآخر ۱۶ مارچ ۱۹۹۱ء کو آپ کمشن لینے میں کامیاب ہو گئے۔

جناب محمد اکرم رضا چونکہ بچپن سے ہی ادب سے لگاؤ رکھتے تھے اور سکول کے زمانے سے طبع آزمائی کر رہے تھے وہ سلسلہ جاری رہا۔ فوج میں آنے تک اسمیں فکر و خیال کی اہمیت اجاگر ہو گئی تھی نئے تجربات سے گزرنے پر نئی سوچیں جنم لینے لگیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ گویا جوان تصورات ذہن کے پردے پر ابھرنے لگے۔ یوں شاعری میں ایک آمیزش سی بن کر سامنے آئی۔ جوان دل، جوان امنگیں اور جوان سوچیں حتیٰ کہ درد و غم، محبت، فرقت، گلے، شکوے جو اس عمر کی شاعری کا خاصا ہیں۔ شاعری کی روح بن گئیں۔ اور کیپٹن اکرم رضا کی شاعری اس آمیزے سے پہچانی جانے لگی۔

آپ کی تحریریں "قیادت"، "ہلال"، "فلورنس" اور "مہک" وغیرہ میں کبھی کبھار چھپتی رہتی ہیں۔" ○○○

غزلیں

قریۂ جاں میں کسی کی آہٹیں سنتا ہوں میں — ریگزارِ خامشی سے وحشتیں چنتا ہوں میں
مصلحت کے موسموں میں حسرتوں کی راکھ سے — ازسرِ نو آرزو کے پیرہن بنتا ہوں میں
چھیڑتی ہیں یاد کے تاروں کو جب تنہائیاں — ذرے ذرے میں تری سرگوشیاں سنتا ہوں میں
چاندنی جب گنگناتی ہے حریمِ شام میں — رقص کرتی ہیں فضائیں اور سر دھنتا ہوں میں
وقت کی میزان سے جو گر گئے لعل و گہر
قریہ قریہ گھوم کر خاور وہی چنتا ہوں میں

خموشی کی صدا ہونا ہے اک دن — درِ امکاں کو وا ہونا ہے اک دن
تری چالاکیاں صیاد کب تک — پرندوں کو رہا ہونا ہے اک دن
مقدر نارسا ہے آج لیکن — اسے آخر رسا ہونا ہے اک دن
لبوں پر سسکیاں سہمی ہوئی ہیں — انہیں بھی پر کشا ہونا ہے اک دن
ہمیں آخر جدا ہونا ہے خاور
ستم یہ بھی روا ہونا ہے اک دن

کیپٹن طاہر وحید

اس عالم کی ناثباتی دکھ، اروتی ہوئی نحیف آوازوں کو آسانی سے سمجھ میں نہ آسکنے والی تسلیوں پر ختم نہیں ہوجاتی۔ بلکہ یہ ایک ازلی وابدی سلسلہ ہے۔ جو چلتا ہے۰۰۰ دکھ ۰۰۰ درد ۰۰۰ غم ۰۰۰ گلے ۰۰۰ شکوے ۰۰۰ یہ سب عناصر بھی زندگی کا حصہ ہیں اور اسے رنگین اور جاذب بناتے ہیں۔ پھر یہی زندگی ماحول اور معاشرے کو جنم دیتی ہے ۰۰۰ تو گویا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہاں ثبات اور سکون میسر ہو۔ ثبات اور سکون تو وہاں تھا جہاں حضرت آدم علیہ السلام ابتدا ءمیں رہ رہے تھے ۰۰۰ یہ تو اس نئی زندگی سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ تبھی ہمارے جدِ اعلیٰ کو یہاں رہنے کے لیے بھیجا گیا ۰۰۰ انسان اس سکون کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے ۰۰۰ شکایات کے دفتر کھولتا ہے اور دکھڑوں کے رونے روتا ہے۔ اور پھر انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے ۰۰۰ دو چار لمحے جب کہیں سے بہارِ جانفزاء کا تازہ جھونکا آتا ہے تو ثانیہ بھر کو ہونٹوں پر تبسم سجالیتا ہے۔ جس سے چہرے کی سلوٹوں میں پل بھر کے لیے کمی آجاتی ہے۔ یہی کچھ کیفیات ہیں جو طاہر وحید کی شاعری کا حصہ ہیں۔ آپ غمِ زمانہ پر آنسو بہانے کی بجائے غمِ جاناں میں الجھے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو انہی حالات کا ایک حصہ ہے۔ بات وہی ستم کی ہے ۰۰۰ ذکر وہی شکایات کا ہے ۰۰۰ ادا وہی روائتی ہے ۰۰۰ کبھی آنکھوں میں آنسو امڈتے ہیں تو کبھی حوصلہ وہمت کے باعث ہونٹوں پر مسکان آجاتی ہے اور اعلان کرتے ہیں کہ دیکھو! میری آنکھیں نم نہیں ہیں ۰۰۰ اور اسی غلط فہمی یا دلفریبی میں وقت ۔۔۔ ماحول اور زمانے کو رگیدنا شروع کردیتے ہیں اور اسے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا نام دیتے ہیں۔

کیپٹن طاہر وحید ۵ جون ۱۹۶۴ء کو پیدا ہوئے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں آئے تو ایک نئی جہت نے ان کے اندر سے کمسن طاہر وحید کی جگہ جوانمرد طاہر وحید کو لا بٹھایا۔ آپ نے نئی زندگی دیکھی اور اسی میں ڈھل کر ۱۱ ستمبر ۱۹۸۶ء کو کور آف آرٹلری میں جوانمردوں والی اس نئی زندگی کے ساتھ چل پڑے۔ جہاں فکر وخیال کی تبدیلی کے جوہرِ لازوال سے نوازے گئے اور جب قلم کو استعمال کیا تو یہ فکر لوگوں تک ایک خاص لہجے میں پہنچی۔ ۰۰۰

غزل

جن کی فطرت وفا سے عاری ہے
دل کی بازی انہی سے ہاری ہے

پہلوئے یار اور میں حیراں ہوں
کیوں طبیعت میں سوگواری ہے

شبِ فرقت کی وسعتیں مت پوچھ
لمحہ لمحہ صدی پہ بھاری ہے

بے وفا تم نہیں تو ہم ہوں گے
اپنی ہر چیز اب تمہاری ہے

دل کی دنیا اجاڑ کر رکھ دی
پوچھتے ہو کہ بیقراری ہے

تو نے چھوڑا جہاں ہمیں طاہرؔ
انہی راہوں پہ سفر جاری ہے

پتلون کی کرامات[1]

اب مہذب قوم کی پہچان ہے پتلون سے
مرد تو خیر عورتوں کی شان ہے پتلون سے

صاحبِ خانہ نے جب سے پہنا ہے ملبوسِ زن
قرب بیوی کو مہیا ہو گیا پتلون سے

اب دوپٹہ بھی کرے ہے بے حیائی کا گلہ
آشنا ایسی ہوئی ہیں عورتیں پتلون سے

باپ کو ڈیڈی کہا اور ماں کو ممی کہہ دیا
مرتبہ ماں باپ نے پایا ہے یہ پتلون سے

اپنی ساری پارسائی بھی ہماری چھن گئی
آشنائی ہو گئی ہم کو بھی اب پتلون سے

آنے والے وقت سے لگتا ہے ڈر طاہرؔ ہمیں
مردے بھی کہنے نہ لگ جائیں کفن پتلون سے

[1] ایک طنزیہ نظم ہے۔ لہٰذا اس میں سے قافیہ کی بجائے المیہ کو ڈھونڈیں۔

کیپٹن مسعود اشرف

نہ مصائب سے نہ آلام سے خوف آتا ہے
جانے کیوں مجھ کو ترے نام سے خوف آتا ہے

مجھ کو یہ گھر یہ نشیمن تو بڑا پیارا تھا
اب تو اس گھر کے درو بام سے خوف آتا ہے

راہبرو راہ دکھاؤ تو تمہیں مانیں گے
ہم کو اس راہ پہ ہر گام سے خوف آتا ہے

غمزدہ لوگ، یہ آہیں، یہ برستی آنکھیں
مجھ کو اس شہر کے انجام سے خوف آتا ہے

وقت نے زیست کے ہر موڑ پہ لوٹا ہے مجھے
اب تو ہر صبح سے ہر شام سے خوف آتا ہے

کل تو شاہین کی شہپر تھی سرِ چرخ مگر
آج شاہین کو حمام سے خوف آتا ہے

یہ غزل اتفاقی یا حادثاتی نہیں بلکہ آج جس دور اور جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں، گاہ گاہ تو اپنی آہٹ سے خوف آنے لگتا ہے اور جناب مسعود اشرف نے اسی قومی المیے کو یہاں پیش کیا ہے۔ بلکہ آپ اتنے حساس ہیں اور حالاتِ حاضرہ پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ آپ کی پوری شاعری وقت سے آگاہی ہے۔

کیپٹن مسعود اشرف یکم فروری ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ چند ہی ماہ کے ان معصوم کانوں نے دھماکے اور جنگی شور کو سنا جو جاکر تحت الشعور میں بس گیا۔ اور پھر ابھی آپ ۶ سال کے ہی تھے کہ دوبارہ ایسے حالات سے گزرنا پڑا۔ اور بچے کی یہ عمر وہ ہوتی ہے جو اپنے اندر مشاہدے اور تجربے کی بھرپور قوت رکھتی ہے۔ پھر یہ ۱۹۷۱ء کا سانحہ ایسا تھا کہ آپ کے کم سِن ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ جب آپ نے تعلیم مکمل کی تو تحت الشعور میں پوشیدہ ان واقعات اور ذہن پر منقش یادوں کے باعث آپ نے مستقبل کے لیے فوج کا انتخاب کیا۔ جس میں ایک ان دیکھا جذبہ دشمن سے نبرد آزمائی کا بھی مستور تھا۔ چنانچہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء کو آپ نے کمشن پایا۔ ان دنوں سیاچن کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ آپ کو بھی وہاں جانے کا موقع ملا۔

ستمبر ۱۹۸۷ء میں ایک حملے کے دوران کمانڈو بٹالین کے کچھ جوان شہید ہو گئے۔ جن کی لاشیں تقریباً ایک سال بعد ۱۹۸۸ء میں ملیں۔ جناب مسعود اشرف یہ لاشیں دیکھ کر بہت افسردہ ہوئے اور اس کا اظہار کچھ یوں کیا۔ ○○○

شہیدوں کی لاشیں دیکھ کر

وطن کے بیٹو! اے میرے پیارو
رہِ محبت کے شاہ سوارو
یہ کیسی چپ سادھ لی ہے تم نے؟
نہ کوئی شکوہ نہ کچھ شکایت
نہ اپنے انجام کی حکایت
نہ ذکر دشمن کی برتری کا
نہ اس کی کوتاہ ہمتی کا
نہ اپنی یلغار کی کہانی
عدو کے کردار کی کہانی
کہ جس کو تم نے بتا دیا ہے
سپاہِ اسلام کیا بلا ہے
یہ پاک وردی کلاہِ قرمز
یہ برق بازو یہ سرو قامت
کشادہ سینے، کھلی جبینیں
نظر میں شاہیں چھپے ہوئے سے
دلوں میں کعبے بسے ہوئے سے
لبوں پہ نعرے علیؓ علیؓ کے
نہ فکرِ امروز و دوش و فردا
فقط شہادت کا سر میں سودا
اے میرے پیارو! وطن کے بیٹو
وطن پہ تم نے جو جان واری
تو لاج رکھ لی گئی ہماری
کہ ہم نے بھی عہد یہ کیا تھا
عدو کو آگے نہ بڑھنے دیں گے
بزورِ شمشیر روک لیں گے
ہمارے دل میں بھی آرزو تھی
وفا کی راہوں میں جان دیں گے
مگر شہادت کا یہ خزینہ
یہ سرفروشی کا اک قرینہ
تمہاری تقدیر بن چکا تھا
تمہیں مبارک یہ پہل کاری
کہ لاج رکھ لی گئی ہماری
تمہیں شکایت ہو یہ کہ شاید
تمہاری لاشیں اٹھا نہ لائے
تمہیں اکیلا ہی چھوڑ آئے
مگر شہیدو عظیم لوگو
تمہیں یہ آسودگی مبارک
ابد کی یہ زندگی مبارک
یہ اک برس تھا کہ اک صدی تھی
ہر ایک ساعت بہت کڑی تھی
غمِ جدائی کی آزمائش
بہت کٹھن ہے بہت کڑی ہے
شہید ہونا بہت سہل تھا
مگر یہ جینا عذاب ٹھہرا
تمہاری چپ کا جواب ٹھہرا
وطن کے بیٹو! اے میرے پیارو
رہِ شہادت کے شہسوارو
لبوں کو کیوں سی لیا ہے تم نے؟
اے برف زاروں سے آنے والو
زباں سے اک بول تو اچھالو

کیپٹن عمران حیدر

کیپٹن عمران حیدر کے ساتھ چند دن رہنے کا اتفاق ہوا۔ جو پہلا تعارف آپ سے ہوا اس میں بحیثیت ایک کارٹونسٹ آپ میرے سامنے آئے اور حقیقتاً آپ کے بنائے ہوئے کارٹون دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ پھر آپ کو کرکٹ کے میدان میں باؤلنگ و بیٹنگ کرتے دیکھا تو آپ سے اور قریب ہونے کو جی چاہا اور جب قریب ہوا تو آپ کی شخصیت کی پرتیں ایک ایک کر کے کھلتی گئیں اور ہر تہہ کے بعد ایک نیا عمران حیدر میرے سامنے آتا رہا۔ ایک کارٹونسٹ، ایک کرکٹر، ٹینس اور ٹیبل ٹینس کا بہترین کھلاڑی، ایک ایتھلیٹ، ایک ہارمونیم نواز اور پھر ایک شاعر اگر چند دن اور ساتھ رہ جاتے تو نجانے عمران حیدر کے اور کتنے روپ میرے سامنے آتے۔

جناب عمران حیدر ۲ اگست ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایم آر نسیم بھی ایک شاعر ہیں۔ آپ کے پانچ بھائی بھی شعراء کی صف میں شامل ہیں۔ یوں جب آپ نے آنکھ کھولی تو گھر کے آنگن میں ہر طرف شعر ہی بکھرے ہوئے پائے اور پھر ایسے ماحول میں رہتے ہوئے آپ کے لیے ناممکن تھا کہ آپ دامن کو بچا کر رکھتے۔ یوں شاعری کی جونکیں آپ کو ہر سمت سے چمٹ گئیں۔ لہٰذا توصیف تبسم کے پڑوسی ہونے کا آپ نے خوب فائدہ اٹھایا اور ان سے اصلاح لینے لگے۔

عمران حیدر نے میٹرک آئیڈیل کیمبرج سکول راولپنڈی اور ایف اے اسلام آباد کالج سے کیا۔ بچپن میں ایک سال کراچی بھی گزارا۔ اور یہ دونوں ماحول یعنی کراچی اور اسلام آباد کے ایسے ہیں کہ خود بخود شعر کہنے کو جی چاہتا ہے جس سے عمران حیدر نے خوب فائدہ اٹھایا اور پھر اسی روگ کو پالے آپ فوج میں آگئے۔ آفیسر ٹریننگ سکول منگلا سے تربیت کی تکمیل پر ۷ اپریل ۱۹۸۸ء کو آپ نے کمشن پایا اور تمام شوق ساتھ لئے فیلڈ میں آگئے۔ جہاں آپ عسکری مصروفیات سے بچنے والے وقت کو سب میں تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیتے ہیں۔ یوں شاعری کو نسبت کے لحاظ سے بہت کم وقت ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ اسے نبھا رہے ہیں اور ثبوت کے لئے "خواب میں سراب" بھی لکھ ماری ہے۔ ٥٥٥

غزلیات

آخری ٹوٹا جب تیرا سہارا دیکھا
انہی صحراؤں سی آنکھوں میں بھی دریا دیکھا

بے بسی، دل کی تھکن اور سمندر سے سراب
جستجوؤں میں تری دل نے ہے کیا کیا دیکھا

پوچھ لیتے تھے ترے آنے کی بابت اس سے
راستہ میں جو صبا کا کوئی جھونکا دیکھا

ریگزاروں کے سرابوں میں بھٹکنے والو
ہم نے بہتے ہوئے دریاؤں میں صحرا دیکھا

قید کر پایا نہ صیاد مری سوچوں کو
جن کے ہر پل نے فقط عکس تھا ان کا دیکھا

دل نے جس ناز سے اس پیار کو رکھا برسوں
آج آنکھوں نے اسی پیار کو مرتا دیکھا

زرہ بکتر تو ستاروں سے مزین کرلی
پر مجاہد میں نہ اسلاف سا جذبہ دیکھا

تیرے قرب کا ہر اک لمحہ مجھ کو پیارا لگتا ہے
چند اک روز سے کتنا اچھا ساتھ تمہارا لگتا ہے

ٹوٹتی کشتی دور کنارا ایک سہارا تم ہی ہو
جسکی سنگت میں اس دِلکو پاس کنارا لگتا ہے

بادل آئے برکھا برسی موسم کی یہ تبدیلی
تیرے واپس آجانے کا ایک اشارا لگتا ہے

قرب کی لذت ایک نشہ تھا، دوری بھی ہے ایک مزہ
اور یہ فون پہ باتیں کرنا بھی تو پیارا لگتا ہے

انجانی سی راہوں پر میں بھٹکا بھٹکا پھرتا تھا
ساتھ ترا اب ان راہوں پر قطبی تارا لگتا ہے

حیدر کیا اس شخص کا کہنا جو کل تک انجانا تھا
آج وہی چہرہ اس دل کو جان سے پیارا لگتا ہے

کیپٹن عطا رسول (شاکر کنڈان)

"شاکر کنڈان کا سینہ سوزِ قومی سے گرم اور ان کی آنکھ حوادثِ وطن سے اشکبار ہے۔ آپ ملکی حالات اور معاشرے کی بے راہروی کے بارے سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں"۔

(رئیس امروہوی مرحوم)

"شاکر کنڈان کی شاعری بھی سپاہیانہ اوصاف کی حامل ہے۔ یعنی سلیس، پر شکوہ، بے سلوٹ، حبِ وطن کا چشمہ ان کی زمینِ سخن سے بار بار پھوٹتا نظر آتا ہے۔ یہ شاعری سیاچن کے گلیشیئر سے سینچی ہوئی ہے"۔ (سید ضمیر جعفری)

"شاکر کے گاؤں میں کوئی اہل قلم نہیں تھا مگر اس بنجر پس منظر نے انہیں پست ہمت کرنے کی بجائے جواں عزم بنایا ہے"۔ (ڈاکٹر یاسین رضوی)

"شاکر کے کلام میں جدید رنگ بھی ہے۔ احساس کی مٹھاس بھی ہے۔ فرسودہ روایات سے بغاوت بھی ہے۔ محبت اور عمل کی تلقین بھی ہے۔ اخوت پیار اور اخلاص کا پیغام بھی ہے"۔ (فاروق روکھڑی)

"شاکر نے اپنے دور کے المیوں کو شعری روپ دیا ہے۔ انہوں نے لگی لپٹی کے بغیر اور سادہ دپُر اثر اسلوب میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے"۔ (پروفیسر گلزار بخاری)

"شاکر کنڈان کول اک صاف ستھرا دل اے جیہڑا محبت، سادگی، خلوص تے سچائی نال بھریا ہویا اے۔ شاکر دے کلام وچ جتھے سادگی اے اوتھے اوہدے کول اجیہا سؤا وی اے جیہڑا اوہ معاشرے دی دکھدیاں رگاں تے رکھدا اے"۔ (ملک شاہ سوار علی ناصر)

شاکر کنڈان توپ و تفنگ را برائی خود و ملتش موجبِ افتخار و بقائی آن میداند و برائی کشورش آنرا باعث استحکام می پندارد و از طرفی عقیدہ دارد کہ ادبیات برائی انسان بودن و محبت از بس لازم است"۔

(شرر بخاری)

Shakir Kandan has dealt with eternal problems of life and love as well as the social milieu in which he lives. He loves his country passionately and has sung of his land in a most patriotic manner". (Dr. Muhammad Hamid)

غزل

میرے قاتل کو پکارو کہ گھٹا چھائی ہے — پھر سے مقتل کو سنوارو کہ گھٹا چھائی ہے
چہرۂ حسن پہ ہے سایہ غم کیوں رقصاں — بکھری زلفوں کو سنوارو کہ گھٹا چھائی ہے
اب تلک قوسِ قزح کے نہیں آثار ابھرے — ابھی بیٹھو مرے یارو کہ گھٹا چھائی ہے
روشنی دل میں اتر آئی صحیفہ بن کے — ابھی مت ڈوبو ستارو کے گھٹا چھائی ہے
وصل کی ایسی فضائیں بھلا کب ملتی ہیں — سجدۂ شوق گزارو کہ گھٹا چھائی ہے

جام ساقی نے اٹھایا ہے باندازِ ستم
رضاؔ ، اکرم کو بلاؤ کہ گھٹا چھائی ہے

تیری فرقت میں کیا سماں ہو گا — ہر طرف موسم خزاں ہو گا
اس کے ابرو کا اک اشارا بھی — کتنی غزلوں کا ترجماں ہو گا
اس کی آنکھوں کی ایک جنبش سے — زہدِ زاہد دھواں ہو گا
تیری فرقت کے زخم سہنے کو — میرا ہی قلبِ ناتواں ہو گا

چوٹ کھانے کو اور ہیں تیار
بے وفا کیسے مہرباں ہو گا

کیپٹن عمیر احمد

عمیر احمد، عمیر ولد ضیاء الدین احمد صوبہ سندھ کے شہر حیدر آباد میں ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا تعلق شعبہ تدریس سے تھا۔ جو AKBAR THE GREAT کی جنم بھومی عمر کوٹ میں اپنی خدمات ایک مدت تک سرانجام دیتے رہے۔ عمیر کا بچپن بھی عمر کوٹ کے مندر کے باہر ذرا فاصلے پر پڑے ہوئے اس پتھر کے ارد گرد کھیلتے گزرا۔ جس پتھر پر شہنشاہ ہمایوں کی بیوی نے بے بسی کی حالت میں ایک بچے کو جنم دیا تھا جو مغلِ اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ عمیر نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع تھرپارکر کے اسی شہر میں حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء میں بطور E کیڈٹ سلیکٹ ہو کر کراچی کا رخ کیا۔ جہاں N.E.D یونیورسٹی میں آپ کو داخلہ ملا۔ یہاں سے ۱۹۹۱ء میں الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور فوج میں آ گئے۔ مختصر عسکری تربیت کے بعد ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو آپ کو کمشن ملا اور آپ EME کور میں فرائض ادا کرنے لگے۔

کیپٹن عمیر احمد نے شاعری کی ابتداء N.E.D یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران کی۔ پہلے پہلے تو آپ غزل کو اپنائے رہے۔ لیکن جب دیکھا کہ دل کے پھپھولے غزل کی نسبت نظم میں بہتر طور پر جلائے جاسکتے ہیں۔ تو نظم کی طرف توجہ دی اور پھر "دسمبر کی بائیسویں رات"، "لو ان کیمپس"، "تاریخ میں یونہی ہوتا ہے"، "قربتیں فاصلے"، "تاجروں سے کہو" اور "وارننگ" جیسی بڑی طویل اور خوبصورت نظمیں کہیں۔ جن میں پیغام کے ساتھ ساتھ درس بھی ہے۔ غلطیوں کا انکشاف اور ان کا حل بھی ہے۔ معاشرے میں نت سامنے آتی ہوئی بے قاعدگیوں کا حوالہ اور ایک طنز بھی ہے۔ بہرحال عمیر نے نظم بڑی بامقصد اور ستھری کہی ہے۔ ادبی کم سنی کے باوجود آپ کے خیال کی رفعت اور اپروچ قابلِ ستائش ہے۔ آپ کی نظم پڑھ کر آپ کو آج کل کے جدید طرز کے شعراء کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ ایک نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔ ٹیلی فون پر بات ہو رہی ہے۔ ○○○

پوچھنا کہ کیسی ہو
اس کا سرد لہجہ میں
کہنا "رانگ نمبر" اور
فون بند کر دینا
نو ڈیجٹ (Digit) گھمانے میں
کتنی عمر لگتی ہے

دیکھا جائے تو کوئی
فاصلہ نہیں ہے یہ
رابطہ میسر ہے
ٹیلی فون کا ہونا
نامہ بر سے بڑھ کر ہے

★

غزل

معلوم ہے دونوں کو ہی بے کار جلیں گے　　تاعمر مگر صاحبِ پندار جلیں گے
یہ بحرِ انا دونوں کے مابین ہے کب تک　　وہ جلتے ہیں اس پار ہم اس پار جلیں گے
جلتا ہوا ماتھا ہے سلگتی ہوئی آنکھیں　　کب تک یوں مسیحا تیرے بیمار جلیں گے
ابروہیں کشیدہ سے دہکتے ہوئے عارض　　اس دید سے تو دیدہ خوں بار جلیں گے
پھر ماہِ دسمبر کی شبِ ہجر میں تنہا　　دلدادہ و جاں دادہ دلدار جلیں گے
اب جنسِ وفا شہر میں ارزاں نہیں یارو　　افلاس کے صحرا میں طلبگار جلیں گے
اشکوں نے تو لوٹا ہی تھا آنکھوں کے نگر کو　　باقی جو ہیں اس شہر کے آثار جلیں گے
اک آگ میں جل جائے گی جذبوں کی جوانی　　اک آگ میں خود خال و خد یار جلیں گے
مت چھیڑ فقیروں کو جو ہم موندے ہیں آنکھیں　　ڈالی جو نگہ ہم نے تو رخسار جلیں گے
یہ دولتِ درویشی بڑی چیز ہے اک دن　　ہم جیسے فقیروں سے یہ ردار جلیں گے

اے جانِ عمیر آئینہ خانے کو نہ جاؤ
بکھرے گی سقف ، سب در و دیوار جلیں گے

کٹتی ہے نہ جب تک یہ شبِ تار جلیں گے　　ہم بن کے یہاں نور کا مینار جلیں گے
دعویٰ ہے خدائی کا جنہیں آگ جلائیں　　ہم کو ہے ملی جرات انکار جلیں گے
اب تک تو جلے تیرے مرے جیسوں کے گھر اب　　دستار و قبا ، قصرِ شہر یار جلیں گے
سچ لکھیں مگر کیسے لکھیں اہلِ قلم سب　　سر ہوں گے قلم ان کے تو گھر بار جلیں گے

کاغذ پہ عمیر ان کو نہ تم بھول کے لکھنا
ورنہ یہ سلگتے ہوئے اشعار جلیں گے

فلائٹ لیفٹیننٹ سراج الدین ظفر

"راہبہ، وادیٔ قاف، لاشوں کا شہر، صدائے جرس، تخت باغ" یہ سب بیگم عبدالقادر ادیبہ کی تخلیقات ہیں۔ جن کا اپنے زمانے میں بڑا شہرہ تھا۔ اتنی مشہور افسانہ نگار کے بطن سے پیدا ہونے اور ایسی گود میں پرورش پانے والی شخصیت میں ادب کے جرثومے منتقل ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر تعجب کیا جاسکے۔

۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم شہر میں محکمہ ریلوے کے انجینئر عبدالقادر کے گھر میں ایک بچے نے جنم لیا۔ جس کا نام سراج الدین رکھا گیا۔ ابھی آپ لڑکپن میں تھے کہ والد وفات پا گئے۔ لہذا یہ یتیم لاڈلا ماں کے زیر سایہ پروان چڑھا اور ادب سے روشناس ہوا۔ بی اے کیا اور پھر شوقیہ جہاز اڑانا سیکھا۔ صاف ظاہر ہے کہ اخراجات والدہ نے ہی برداشت کئے کیونکہ آپ تو ابھی بے روزگار تھے۔ پھر قانون کی طرف راغب ہوئے۔ ایل ایل بی کیا اور پریکٹس شروع کر دی۔ شاعری کا آغاز بچپن سے ہو چکا تھا۔ تب آپ سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اسی دوران فیروز سنز لمیٹڈ کے مالک مولوی فیروز الدین کی لڑکی سے شادی ہو گئی۔ آپ نے وکالت کو چھوڑا اور ایئر فورس جوائن کر لی۔

جناب سراج الدین ظفر زبردست عالم اور ہمہ صفت موصوف انسان تھے۔ ادب سے گہرا لگاؤ تھا لیکن ائیر فورس میں آنے کے بعد ایک خلا سا آگیا۔ سو! آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی اور کراچی میں رہنے لگے جہاں وکالت شروع کر دی۔ اسی دوران "جسٹس آف پیس" کے اعزاز سے نوازے گئے اور تمغہ خدمت پایا۔ یہاں سے آپ کے سسرالی آپ کو لے گئے اور آپ کو اپنے شو روم کا مینیجر بنا دیا۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ ظفر نے ساری زندگی عیش و عشرت میں گزاری لیکن بڑھاپے میں جوان بیٹی اور داماد کے ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہونے نے آپ کو توڑ کر رکھ دیا۔ اور آپ سنبھل نہ سکے۔ یہ غم جان لیوا ثابت ہوا اور آپ ۱۹۷۲ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے تاریخ، شہریت، اردو اور انگریزی کی کتب نصاب تالیف کیں نیرنگِ خیال، اداکار، مرکز اور فوسیو جیسے رسالوں کے اعزازی مدیر رہے۔ پاکستان ریویو اور طرح نو کے ایڈیٹر رہے۔ آپ نے انگریزی زبان میں بھی نظمیں لکھیں جو امریکہ اور انگلینڈ کے میگزینوں میں شائع ہوتی تھیں۔ آپ نے علم نجوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ آپ نے دنیا کی سیاحت بھی کی اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "آئینے" اور شاعری کے دو مجموعے "غزل و غزال" اور "زمزمۂ حیات" کافی مقبول ہوئے۔

ooo

شہیدانِ وطن

دبے ہیں جو ترے سینے میں اے زمینِ وطن ۔۔۔ تجھے بھی یاد ہیں وہ غازیانِ شعلہ طراز
وہ تیرے درد کشانِ شرابِ آزادی ! ۔۔۔ وہ تیرے خلوتیانِ نگار خانۂ راز
وہ انقلاب کے آغوشِ نو کے پروردہ ۔۔۔ وہ حریت کے حریفانِ زلزلہ انداز
وہ جن کے خون سے سینچے گئے ترے ذرے ۔۔۔ وہ جن کے ہوش سے کانپے ترے نشیب و فراز
وہ جن کو موت نے کی پیش شہرتِ ابدی ۔۔۔ وہ جن کو عشق کی درگاہ سے ملا اعزاز
کبھی تھے وہ بھی گلستانِ رزم کے محمود ۔۔۔ کبھی تھے وہ بھی شبستانِ حریت کے ایاز
کبھی تھے ان کے فسانے بھی انجمن افروز ۔۔۔ کبھی تھے ان کے ترانے بھی زیب و زینت ساز
اسی ہوا نے بھرا ان میں جوشِ آزادی ۔۔۔ اسی فضا میں ہوا ان کو شوق کا آغاز
کسے خبر ہے کہ وہ ساکنانِ خطۂ عرش ۔۔۔ ہنوز یادِ وطن میں ہیں غرق سوز و گداز
کسے خبر ہے کہ ان کی شکستہ پَر روحیں ۔۔۔ ہنوز سوئے نشیمن ہیں مائل پرواز
صبا کے بھیس میں وہ مطربانِ بزمِ خیال ۔۔۔ سحر کے ساز پہ ہوتے ہیں زمزمہ پرداز
شفق کا روپ بدل کر وہ ترجمانِ سروش ۔۔۔ حریمِ دل میں جلاتے ہیں شمعِ راز و نیاز
کہیں وہ لالہ و گل میں ہیں داغ برسینہ ۔۔۔ کہیں وہ غنچۂ نورستہ میں ہیں کیف نواز
کہیں وہ پردۂ شبنم میں ہیں سرشک آلود ۔۔۔ کہیں وہ سبزۂ روئیدہ پر ہیں محو نماز
انہیں بھی اہلِ وطن سے ہے آرزوئے وفا ۔۔۔ انہیں بھی موت کی وادی سے دے کوئی آواز

انہیں بھی باغِ وطن سے پیامِ یار آئے
انہیں بھی یاد کرے کوئی جب بہار آئے

✡

فلائیٹ لیفٹیننٹ غالب احمد

اردو ادب کا مطالعہ کرنے والوں میں سے شاذ ہی کوئی ایسا شخص ہو جو غالب احمد کے نام سے واقف نہ ہو۔ کسی نہ کسی حوالے سے نثر ہو یا نظم آپ نے اردو کے تمام اچھے ادبی رسائل میں لکھا خواہ وہ آج سے برسوں پہلے شائع ہونے والا "ہمایوں" ہو یا آج کا "اوراق"، "ادبِ لطیف" یا "فنون" آپ کسی نہ کسی طرح ادب سے منسلک رہے۔ اور پھر جب آپ کا شعری مجموعہ "راحتِ گمنام" چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں آیا تو آپ زندۂ جاوید ہو گئے۔ ادبی حلقوں میں اتنی پزیرائی ہوئی کہ آپ راحتِ گمنام کو پاکر اس کی حقیقی لذتوں سے آشنا ہو گئے۔

جناب غالب احمد کی شاعری ہو یا نثر یک سوئی کا گمان لئے ہوئے ہے۔ جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں الفاظ کا استعمال فکر و خیال کے عین مطابق ہے۔ آپ کی شاعری پڑھ کر اور اس پر غور کرنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے جو لفظ جس خیال کی نیت سے استعمال کیا ہے اس سے بہتر کوئی لفظ بھی اس مقام کے لئے موزوں نہیں تھا۔ بلکہ اگر حسنِ تلفظ کے لئے اسے فٹ کر بھی دیتے تو وہ جچ نہ سکتا اور اسی خوبصورتی اور موزونیت نے آپ کو تضادات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ بلکہ مثبت رویوں کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے پڑھنے والوں کو اچھی اور اعلیٰ سوچ دی ہے۔ آپ نے کہیں کہیں نظم اور غزل میں استعاروں اور کنایوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ اور یہ اس وقت ضروری سمجھا جب حالات معاونت نہیں کر رہے تھے۔ لیکن سچ بات کا اظہار بھی ضروری تھا۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ غالب احمد پاک فضائیہ کے ہر دلعزیز افسروں میں گنے جاتے ہیں آپ نے ائیر فورس کے شعبۂ تعلیم میں دس سال تک مخلصانہ خدمت سرانجام دیں۔ جو لوگوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ ○○○

غزلیں

لاکھ کرتا رہے طوافِ حرم
دل بدستور ہے خود ایک صنم

جن رفیقوں نے غم کو اپنایا
وہ بھی آئے برائے پرسشِ غم

منتشر ہو رہا ہے ذوقِ نظر
رفعتِ آرزو کہاں ہیں ہم

روشنی کی رمق نہیں دل میں
تیرے ماتھے کی چاندنی کی قسم

ظلمتِ شب کی آنکھ کا تارا
میرا دل جس پہ دن کے لاکھ ستم

جب بھی ہونے لگا غموں کا علاج
دل ہوا بات بات پر برہم

وقت کی راگنی کو کون سنے
دل کی دھڑکن میں ہو گئی مدغم

اپنے گھر سے میرے گھر تک کچھ لمحوں میں آئے گا
اتنی مسافت میں لوگوں کو کتنے رنگ دکھائے گا

دھوپ تھی سرسوں کی کیاری میں دونوں مل کر سوئے تھے
یہ منظر بھی ساتھ ہمارے در در ٹھوکر کھائے گا

پھر وہ شاعر رات گئے اس شہر میں تنہا پھرتا ہے
اس کو کہنا صبر کرے ملنے کا موسم آئے گا

ساری رات وہ ساتھ رہا سائے کی طرح سے ہم سے دور
ہم بھی ساتھ لگے رہتے ہیں کبھی تو مل ہی جائے گا

رات کی کالی چادر لے کر دن بھر سوئے رہتے ہیں
دیکھیں کب وہ سورج بن کر ہمیں جگانے آئے گا

فلائیٹ لیفٹننٹ راجہ شمیم احمد سحرؔ

۳۱ مارچ ۱۹۵۲ء کی سحر مانسہرہ کے راجہ فضل خالق خان کے گھر شمیمِ جانفزا کا مژدہ لے کر آئی۔ نومولود کا نام شمیم احمد رکھا گیا۔ جبکہ سحرؔ اس نے خود اپنے لئے منتخب کیا۔

جناب شمیم احمد سحر نے عہدِ طالب علمی میں شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھا اور اس ادبی سفر میں سید اختر علی بیخودؔ کو اپنا رہنما بنایا اور یہ اسی رہبر کی صحبت کا اثر ہے کہ آپ کے کلام میں بیخودؔ مراد آبادی کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

سحرؔ نے ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے بی اے کیا اور پھر قانون کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں لاء کالج پشاور سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ لیکن یہ قانونی موشگافیاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی آپ سے ربط نہ جوڑ سکیں۔ اور آپ فروری ۱۹۷۷ء میں پاکستان ایئر فورس میں شامل ہو گئے۔

ملازمت کی مصروفیات اپنی جگہ بجا سہی لیکن آپ نے اپنے لڑکپن اور جوانی کے شوق کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ راجہ شمیم احمد سحر بادِ خزاں کے ہاتھوں پژمردہ ضرور ہو جاتے ہیں مگر نسیمِ سحر کے باعث مسرور و شادماں بھی رہتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ امید بھی ہے اور یاس بھی۔ بیم و رجا کا ایک انجان سا سلسلہ ہے جو آسمان سے شبنمی رشتہ بھی جوڑتا ہے اور زمین کی محبت کو دل میں جاگزیں بھی رکھتا ہے۔ آپ نے غزل میں مختلف حوالوں سے زندگی کے ان مسائل کو پیش کیا ہے جن سے آج کے دور کا انسان دوچار ہے۔ آپ ماضی اور حال سے مستقبل کا ایک راستہ متعین کرنے میں رواں دواں ہیں اور غزل میں دل کی ہر بات کہہ دینا چاہتے ہیں جس سے مخاطب کو سمجھانا بھی چاہتے ہیں۔ ○○○

غزلیں

تیرے جلووں نے عطا کی دل کی آزادی مجھے
اب کہاں ہے حسرتوں سے ہوشِ آزادی مجھے
سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتا جاتا ہوں میں
تیری آنکھوں نے اسی کا کر دیا عادی مجھے
میں کہ بے تابِ ازل ہوں اے مرے چارہ گرو
باعثِ تسکینِ جاں ہے میری بربادی مجھے
زندگی میری چمن ہے آپ ہیں مثل بہار
آپ کے قدموں نے پھولوں کی قبا لا دی مجھے
میں سحر ہوں آسماں سے شبنمی رشتہ بھی ہے
پر زمین کی چاہ نے زنجیر پہنا دی مجھے

حسن کے ہوتے ہوئے کب عشق بیگانہ رہا
جب تلک شمع جلی محفل میں پروانہ رہا
جو حقیقت ہے ہمیشہ ہی پسِ پردہ رہی
گلشنِ ہستی تو افسانے کا افسانہ رہا
آپ نے چاہا نہ چاہا آپ کو معلوم ہے
میرا دل تو آپ کا صدیوں سے دیوانہ رہا
تو شگفتہ گل تجھے معلوم کیا کوئی یہاں
تیرے کھلنے سے بھی پہلے تیرا دیوانہ رہا
اپنی ہی کوتاہیوں کا فیض ہے تشنہ لبی
ورنہ گردش میں ہمیشہ سے ہی پیمانہ رہا
موسمِ گل میں تمہاری یاد کی شدت بڑھی
دیکھ کر ہر پھول کو میں خود سے بیگانہ رہا
روح تھی میری جسے میں عمر بھر ڈھونڈا کیا
جستجوئے بت میں یعنی اک صنم خانہ رہا
زخم ہائے دردِ الفت بھی کھلے لیکن سحر
جانے کیوں موجود میرے دل میں ویرانہ رہا

فلائٹ لیفٹیننٹ محبوب حیدر مرزا

محبوب حیدر نام۔ مغل قوم سے ہونے کے باعث مرزا اور محبوب تخلص کرتے ہیں۔ آپ کے والد ضرغام حسین ضیغم جو ریلوے میں ملازم تھے۔ جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو آپ مراد پور ضلع مظفر نگر (یو پی) سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اور لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں آ کر آباد ہوئے اور ریلوے سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہومیو پیتھک کی سند لے کر ڈاکٹری کرنے لگے۔ آپ اہلِ زبان بھی تھے اور استاد شاعر بھی لیکن آپ کے کریڈٹ میں زیادہ تر نعت ہی جاتی ہے۔

محمد مصطفیٰؐ گو آئے سب نبیوں کے آخر میں
خدا کی شان دیکھو پھر بھی افضل مصطفیٰؐ ٹھہرے
زمیں نہ ہوتی فلک نہ ہوتے اگر نہ احمدؐ جہاں میں آتے
وجودِ عالم کی یہ نشانی ، یہ حدِ اولیٰ عیاں رہے گی

اردو کے اسی استاد شاعر ڈاکٹر ضرغام حسین ضیغم کے ہاں لالہ موسیٰ میں ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ جناب محبوب حیدر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لالہ موسیٰ میں حاصل کی۔ میٹرک سرگودھا سے اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا اور پی اے ایف کالج سرگودھا میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے ۱۹۷۸ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد ایئر فورس میں آ گئے اور ابتدائی تربیت کے بعد کمشن پا کر پائلٹ افسر بن گئے۔

سنا ہے کہ کسی حادثے میں آپ کے دونوں بازو شدید متاثر ہوئے اور یوں آپ کا پرموشن فی الحال فلائٹ لیفٹیننٹ پر آ کر رک گیا۔

جناب محبوب مرزا ہائی سکول میں تھے کہ شعر موزوں کرنے لگے۔ لیکن اپنے تک محدود رہنے دیئے۔ کالج میں آئے تو شعری محفلوں میں بھی سامنے آئے۔ "ابتداً اپنے والد کو کلام دکھاتے تھے لیکن ایک مشاعرہ میں آپ کے والد نے آپ کا ہاتھ جناب عزیز رزاقی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور آپ پھر ان سے اصلاح لینے لگے۔ جو کہ ایک کہنہ مشق اور اہلِ زبان شاعر ہیں۔ جن کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

جنہوں نے میری فطرت میں عجب خوئے یقیں رکھ دی
جہاں نقشِ قدم پایا وہیں میں نے جبیں رکھ دی

ooo

غزلیں

گو آج اس سے قصدِ سخن دوبدو کا ہے
پھر بھی لحاظ مجھ کو اسی خوبرو کا ہے

نکلا تری تلاش میں اور پہنچا دار تک
اونچا مقام کتنا تری جستجو کا ہے

برساؤ منہ سے پھول یا آنکھوں سے بجلیاں
ہر لحظہ انتظار تیری گفتگو کا ہے

میں نے شہید ہو کے کھلائے وطن کے پھول
یہ معجزہ تو میرے معطر لہو کا ہے

کہتا ہے کون اسکو یہ ہے سرخیٔ شفق
محبوبؔ یہ تو خون تری آرزو کا ہے

☆

یارو قفس کی زندگی کتنی عجیب ہے
صیاد بے وفا ہے تو گلچیں رقیب ہے

شاید کہ اب تو مر کے بھی پاؤں نہ میں شفا
جب درد دینے والا ہی میرا طبیب ہے

شبنم کی چشمِ تر ہے تو روئی ہے خوں شفق
یہ داستانِ غم میری کتنی حبیب ہے

ظالم نے کاٹے پر میرے فصلِ بہار میں
محبوبؔ کو بھی دیکھیئے کیا بد نصیب ہے

لیفٹیننٹ مظفر احمد (پیرزادہ سید ظفر ہاشمی)

اصل نام: صاحبزادہ سید مظفر احمد ہاشمی۔ قلمی نام: پیرزادہ سید ظفر ہاشمی / ظفر ہاشمی۔

والد کا نام: حضرت خواجہ پیر محمد ابراہیم ہاشمی

تاریخ ولادت: ۶، اگست ۱۹۰۵ء

آپ چک ہاشمیاں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم چک ہاشمیاں میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ مشرقی پنجاب اور جموں کشمیر میں گزرا پھر اپنے چچا کی ساتھ کلکتہ چلے گئے اور وہیں ۱۹۲۲ء میں مدرسہ عالیہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور سید رضا علی وحشت کلکتوی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ ابھی دسویں جماعت میں تھے کہ "آفتاب" میں چھپنے لگے۔ ۱۹۲۷ء میں بیمار ہونے پر لاہور آ گئے اور یہاں مشہور شعراء کی رفاقت میسر آنے پر خوب لکھنے لگے۔ آپ "عالمگیر" لاہور کے مدیر معاون مقرر ہوئے اور چار سال تک کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۲۹ء میں امرتسر سے رسالہ "چمنستان" جاری کیا ۱۹۳۲ء میں آپ کابل چلے گئے۔ آپ کا پہلا مجموعۂ کلام "حسن خیال" بھی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں دوسرا مجموعہ کلام "حسن کلام" چھپا۔ ۱۹۴۰ء میں آپ فوج میں بھرتی ہو گئے اور ملکوں ملکوں پھرے۔ اس دوران آپ الامین کے مورچے میں بھی موجود تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جبکہ آپ لیفٹیننٹ تھے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور منٹگمری (ساہیوال) شہر میں مقیم ہو گئے۔

آپ کا تیسرا مجموعہ کلام "تنویر نُم" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ "آہنگ ظفر" اور "مقالاتِ ظفر" اور مضامین نثر کا مجموعہ "حسنِ ادب" ہیں۔

شان الحق حقی لکھتے ہیں:۔

"ظفر نے روایتی عاشقانہ مضامین ہی نہیں باندھے۔ جگہ جگہ قومی و اصلاحی جذبے کا بھی اظہار کیا ہے۔ اور مذہبی ارادت و عقیدت کا بھی۔ کلام عموماً صاف اور شستہ ہے۔ جس میں کوئی گنجلک نہیں۔ زمینیں خوش آہنگ ہیں" ○○○

حمد

نہیں کچھ اور کعبے میں مگر اللہ ہی اللہ ہے ادھر اللہ ہی اللہ ہے ادھر اللہ ہی اللہ ہے
جو دیکھا ہے دکھاؤں کیا جو پایا ہے بتاؤں کیا سناؤں کیا تجھے اہلِ نظر اللہ ہی اللہ ہے
وہی ہے جلوہ گر اب تک حجابِ چشمِ حیراں میں تجلی بھی ہے بے تابِ نظر اللہ ہی اللہ ہے
اسی کا نام لیتے ہیں یہ سب شاخ و شجر ہر دم کلی کے لب پہ بھی وقتِ سحر اللہ ہی اللہ ہے
مدینے میں یہ شانِ رحمۃ اللعالمینؐ ہے غریبوں پر عنایت کی نظر اللہ ہی اللہ ہے
میں اپنی خوش نصیبی پر ہمیشہ ناز کرتا ہوں کہاں میں اور کہاں لطفِ نگر اللہ ہی اللہ ہے

نہیں اس کے سوا کوئی جہانِ تار و تیرہ میں
جدھر آنکھ اٹھ گئی اپنی ظفرؔ اللہ ہی اللہ ہے

غزل

اللہ ہو کا نعرہ لاگے ذکرِ صفات و ذات کریں
تان میں جوت جگا کر اپنے آج ظفرؔ برسات کریں
آؤ نگاراں ہم تم مل کر غم کی دنیا مات کریں
سُکھ کا سانس کوئی دم لے لیں پیدا وہ حالات کریں
نگری نگری کوچے کوچے پھر کے دن تو کاٹ لیا
اب جانے دیوانے تیرے کس صحرا میں رات کریں
روپ منوہر دے دیں اب تو ہر جنگل ہر بستی کا
سندر سندر روشن روشن ہر ڈالی ہر پات کریں
شہر شہر میں آگ لگی ہے گلشن گلشن جلتا ہے
دریا بھی سب سوکھ گئے ہیں آنکھ سے اک برسات کریں
شعر ظفرؔ ہے میٹھا جادو جاننے والے جانتے ہیں
میر کی طرز ہے کتنی میٹھی شعر میں دل کی بات کریں

لیفٹننٹ احسن احمد اشک

احسن احمد نام اور اشکؔ تخلص ہے۔ آپ کے والد خان بہادر پروفیسر عبدالمقتدر جو فارسی زبان و ادب کے مشہور عالم تھے۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں وطن سے باہر ہی رہے۔

احسن احمد جنوری ۱۹۱۹ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے آپ نے تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ دورانِ تعلیم ۱۹۳۶ء میں لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ بی اے (آنرز) کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اسی دوران آپ نے قاضی نذرالاسلام کی بنگلہ شاعری کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ٹیگور کی کچھ نظموں کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں فارسی میں اور ۱۹۴۱ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ دونوں امتحانوں میں آپ اول رہے۔

ان دنوں دوسری جنگ شروع تھی اور مقامی نوجوان بھی فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ آپ کو بھی کمیشن مل گیا اور آپ کو برٹش اوورسیز سنسر سروس میں متعین کیا گیا لیکن آپ نے کچھ ہی عرصہ بعد استعفیٰ دے دیا۔

جناب اشکؔ کا ۱۹۴۴ء میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے پریسی ڈنسی کالج کلکتہ میں تقرر ہوا تقسیمِ ہند کے بعد ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک آپ اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ڈھاکہ، راجشاہی اور سلہٹ کے سرکاری کالجوں میں پڑھاتے رہے۔

تعلیم کے دوران جو سلسلہ آپ نے لکھنے کا شروع کیا تھا، وہ جاری رہا۔ اس میں آپ نے بنگالی شعراء کے کلام کو منظوم اردو شکل دی۔ جس سے اردو داں طبقے کو بنگالی شعراء کے فکر و فن سے آگاہی ہوئی۔ ان کے علاوہ آپ نے اپنی شاعری کو بھی کتابی شکل میں محفوظ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں آپ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "برق و باراں" اور ۱۹۶۲ء میں "جاگتے جزیرے" شائع ہوئے۔

جب پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل ہوئی۔ اور جنوری ۱۹۵۹ء میں اس کا اجلاس ہوا تو مشرقی پاکستان کے اردو ادیبوں کی طرف سے جو نمائندے شامل ہوئے۔ ان میں سے ایک آپ بھی تھے۔ یوں آپ اس کے بنیادی رکن کے علاوہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک مرکزی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی رہے۔ OOO

غزلیں

زلف تیری کہاں کھُلی رات نہ جانے کب ڈھلی روح میں ہے مچی ہوئی آج بھی ایک کھلبلی
تیرے فقیر بن کے ہم پھرتے رہے گلی گلی بھیک کسی نے دی نہ دی کٹتی رہی بُری بھلی
تیرا خیال آتے ہی یاس کی رُت پلٹ گئی غم کی گھٹائیں چھٹ گئیں یاد کی اک دھنک جلی
تیرے قریب بھی رہے دور سے دور بھی گئے اور بھی تشنگی بڑھی اور بھی تشنگی کھلی

فلسفہ ہو کہ شاعری اشک پناہ لے کہاں
اک خرد کی دھاندلی اک جنوں کی دھاندلی

بجا کہ کچھ شکائتیں ہیں ان کو میری ذات سے مگر یہ لوگ کس لئے خفا ہیں کائنات سے
عزیز ہوں کہ دوست ہوں یہی تو کرتے آئے ہیں ہوا کے رخ کو دیکھ کر پلٹ گئے ہیں بات سے
رہے اگر حدود میں تو دوستی بُری نہیں ہیں رنجشیں تمام تر غلط توقعات سے
وہی کہیں گے کل برا جو کہہ رہے ہیں برملا اس انجمن میں روشنی ہے آپ ہی کی ذات سے
بلا رہے تھے راستے مگر قدم نہ اٹھ سکے تمام عمر کھیلتے رہے تصورات سے
سنور گئی تو دھوپ ہے بکھر گئی تو چھاؤں ہے غلط کہ تیری زلف کو مناسبت ہے رات سے

تھکے ہو اشک سو رہو اب آندھیوں کی راہ میں
لگاؤ بھی ہے لاگ بھی تمہیں تو حادثات سے

آنریری کیپٹن صوفی یونس حسین جھجروی

غلامی کے دور میں مسلمانوں کو ایک یہ بھی بہت بڑا نقصان تھا کہ ملازمتوں کے حصول کے لئے انہیں کئی رکاوٹیں پیش آتی تھیں۔ انگریز یا ہندو ثانوی تعلیم کے بعد افسر بن جاتے تھے جبکہ مسلمان پڑھ لکھ کر بھی چھوٹی موٹی مزدوری کرنے پر مجبور تھے۔ اس دور میں دس جماعت پاس کر لینا ایک بڑی بات تھی لیکن ہمارے کئی نوجوان میٹرک کر کے فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے حالانکہ اس وقت ان پڑھ جوان سپاہی بھرتی ہوتا تھا۔ ہاں یہ الگ بات کہ ان میں سے بعض اپنی فرض شناسی، ایمانداری، لگن اور محنت کے بل بوتے پر افسر بن گئے۔ لیکن زیادہ تر ٹیلنٹڈ لوگ سپاہی ہی رہے یا اپنے رینک کے جنرل میرا مطلب ہے آنریری کپتان تک پہنچے۔

جناب محمد یونس حسین خان انہی باہمت لوگوں میں سے تھے جو فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے اور آنریری کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ ۱۹۰۶ء میں جھجر ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ آپ پٹھان یوسف زئی خاندان کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ میٹرک تک جھجر میں تعلیم حاصل کی اور پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ایک طویل مدت تک پیشہ ورانہ خدمات ادا کیں۔ پہلے متحدہ ہندوستان میں اور پھر متحدہ پاکستان میں اپنی عسکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ جس کے صلے میں تمغۂ شجاعت اور تمغۂ خدمت درجہ اول سے آپ کو نوازا گیا۔ آپ نے ۱۹ مارچ ۱۹۷۴ء کو وفات پائی۔

آنریری کیپٹن صوفی یونس حسین جھجروی صرف نام کے ہی صوفی نہیں بلکہ حقیقتاً صوفیانہ مزاج کے مالک تھے۔ آپ بڑے سادہ اور ملنسار انسان تھے۔ شاعری کی ابتداء ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ چونکہ رجحان تصوف کی طرف تھا اس لیے آپ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کی شاعری میں زندگی اپنے بھرپور معانی کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ جس میں سلیقہ بھی ہے اور شعور بھی۔ ہنر بھی ہے اور فن بھی۔ آپ نے روایت سے ہٹ کر راستہ اپنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ جہاں آپ نے لفظوں کی مالا پرونے کا وطیرہ اختیار کیا ہے وہیں رموز و کنایات کی راہ بھی اختیار کی ہے۔

آپ کی شاعری کو تفصیل سے پڑھیں تو لگتا ہے کہ جیسے زندگی اور موت کا راز آپ پر منکشف ہو گیا ہے۔ جبھی تو آپ درد و الم کے سائے میں مسکراتے دکھائی دیتے تھے اور جو بھی اشعار کہتے وہ ان کی ذات کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہوتا۔ ○○○

غزلیں

حسرتِ ناکام کا ہر گام مسکن دیکھ کر آنکھ بھر آئی ہے اکثر اپنا گلشن دیکھ کر
چند تنکے اور وہ بھی اس طرح بھیلے ہوئے برق بھی حیرت زدہ تھی میرا خرمن دیکھ کر
کس میں تابِ دید ہے گر سامنے آئے مگر اشتیاقِ دید بڑھ جاتا ہے چلمن دیکھ کر
چوٹ سی دل پر لگی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھول مرجھائے ہوئے بالائے مدفن دیکھ کر
اس لئے رکھی نہیں میں نے بنائے آشیاں بجلیاں تڑپا کریں گی میرا خرمن دیکھ کر
آپ ہی تھے ایک جس کا دل پسیجا ہی نہیں ورنہ دنیا رو پڑی تھی آہ و شیون دیکھ کر
آپ نے پابندیاں صوفی پہ کیں عائد مگر
دل بغاوت پر اتر آتا ہے قدغن دیکھ کر

وہ افق چمکی وہ صبحِ عیش کا منظر کھلا بادۂ خورشید چھلکا میکدے کا در کھلا
اب تری الفت کا پردا ذرے ذرے پر کھلا ہر طرف اک اضطرابِ شوق کا دفتر کھلا
جستجو ان کی مجھے لائی ہجومِ عام میں تیری تنہائی کا شیرازہ سرِ محشر کھلا
تیرا دیوانہ ہے کوئی یا جنوں کا قافلہ گرد چہرے پر پریشانی میں ڈوبا سر کھلا
بدگمانی تجھ کو صوفی کی محبت میں ہے کیوں
راز تجھ پہ کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

آنریری کیپٹن سید جعفر علی شاہ (سید جعفر طاہرؔ)

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت کچھ کرنے کا جذبہ لے کر پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن حالات انہیں اس قابل نہیں ہونے دیتے کہ وہ کچھ کر سکیں۔ لہٰذا محدود وسائل کے ساتھ ہی وہ اپنی راہوں کا تعین کر کے جو کچھ ہو سکتا ہے کر گزرتے ہیں۔ ادب کے حوالے سے جب بات ہوتی ہے تو نئی اصناف سے روشناس کرانے والے لکھاری سب سے پہلے زیرِ بحث آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سید جعفر طاہرؔ بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اردو کو ایک نئی صنفِ شعر " کینٹوز " سے متعارف کرایا۔ بلکہ کینٹوز کا مجموعہ " ہفت کشور " لکھ کر آدم جی ایوارڈ حاصل کیا۔ لیکن آپ کے ساتھ ہی یہ صنف ختم ہو گئی ہے۔

سید جعفر علی شاہ ۲۹ مارچ ۱۹۱۷ء کو عشق و محبت کی دیو داسی ہیر سیال کے دیس جھنگ کے سید نور شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخلہ لیا۔ لیکن بی اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔ اور ۳۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو فوج کے تعلیمی ادارے میں نائب صوبیدار بھرتی ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران شہروں، جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھان کر خوب تجربہ حاصل کیا۔ سنگاپور سے واپس لوٹے تو شاہکار نظم " واپسی " لکھی۔ فوج میں ۲۳ سال گزارنے کے بعد اگست ۱۹۶۶ء میں آنریری کیپٹن کے عہدے سے پنشن لی اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں سے آپ فوجی پروگرام پیش کرتے رہے۔ یہیں راولپنڈی میں ہی ۲۵ مئی ۱۹۷۷ء کو وفات پائی۔

مرحوم نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ۔ مذہبی قصائد کا مجموعہ " سلسبیل " اور " زلفِ الہام " غزلیات کا مجموعہ " ستارۂ انقلاب " اور کینٹوز " ہفت کشور " کافی مقبول ہوئے۔ آپ ایک خوددار قلندر شاعر تھے۔ پڑھنے کا انداز ڈرامائی تھا۔ موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اور الفاظ کی سر تال سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ آواز میں گھن گرج تھی جس کی بنا پر وہ مشاعروں پر چھا جاتے تھے۔ اردو، انگریزی، ہندی، عربی، فارسی، بنگالی اور پنجابی ہر زبان پر کامل عبور تھا۔ آپ نے بہت کچھ لکھا اور ایک ضخیم کتب خانہ جمع کیا۔ لیکن افسوس کہ وہ بیش بہا کتب خانہ ۱۹۷۳ء کے سیلاب کی نذر ہو گیا۔ ○○○

غزل

اک عمر گیسوؤں کی ثنا خوانیاں رہیں — ہم بے دلوں کو لاکھ پریشانیاں رہیں
آئینۂ حیات میں ہر عکس دل فریب — کچھ یوں نظر پڑا ہے کہ حیرانیاں رہیں
حائل تھی زلف زلف کی شب گرچہ راہ میں — پیشِ نگاہ چاند سی پیشانیاں رہیں
ان کی طرف سے بھی کبھی آتے رہے پیام — کچھ روز یوں بھی سلسلہ جنبانیاں رہیں
بالائے بام حُسن کی جلوہ گری رہی — میری نظر نظر پہ بھی نگرانیاں رہیں
زخموں سے چور چور تھا دل اس کا کیا علاج — ان کی ہنسی وہی نمک افشانیاں رہیں
اک عمر اپنے آپ سے شرمندگی رہی — اک آرزوئے دل سے پشیمانیاں رہیں
دریا کی سیر کا انہیں آیا بھی کب خیال — وہ اشک ہی رہے نہ وہ طغیانیاں رہیں
اہلِ وفا کے ذکر پہ بھر آئی ان کی آنکھ — آخر کو رنگ لا کے ہی قربانیاں رہیں
اہلِ جنوں کے پاؤں میں جولاں پڑے، اُدھر — آہو رہے نہ ان کی وہ جولانیاں رہیں
ان حسرتوں پہ عشرتِ آزادگاں نثار — وہ حسرتیں جو راحتِ زندانیاں رہیں
نشو و نمائے سبزہ و گل دیکھتے رہے — لیکن وہی نصیب کی ویرانیاں رہیں
ہم دل جلوں کو ابرِ کرم سے رہا نہ کام — وہ سوزِ غم سے سوختہ سامانیاں رہیں
وہ کوچہ ہائے شوق بھی یکسر اجڑ گئے — وہ دل رہا نہ دل کی غزل خوانیاں رہیں
گو داغ مٹ چکے ہیں مگر روشنی سی ہے — یوں جل بجھے چراغ کہ تابانیاں رہیں
لبریز نور ہو نہ سکا دل جلوں کا جام — لطفِ مغاں کی یوں تو فراوانیاں رہیں
ہوتے میرے حبیب نجانے کہاں پہ آج — حائل ہماری راہ میں تن آسانیاں رہیں
ہم اٹھ گئے تو جنسِ ہنر بھی ہوئی گراں — ارزاں تھے ہم تو اس کی بھی ارزانیاں رہیں

طاہرؔ خدا کی راہ میں دشواریاں سہی
عشقِ بتاں میں کون سی آسانیاں رہیں

چیف وارنٹ آفیسر شیر دل ساجد

ایئرفورس کے جوانوں کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں ایئرمین بھرتی ہونے کا تعلیمی معیار کم از کم میٹرک ہے۔ جس کے باعث لوگ گھر سے کچھ شُدبُد لے کر آتے ہیں پھر یہاں کا ماحول، تربیت، رہن سہن یعنی کہ ع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے، تعلیم کے حصول کا شوق بھی آلیتا ہے۔

جناب شیر دل ساجد بھی ایسے محنتی افراد میں سے ہیں جو تعلیمی سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ بلکہ اسے آگے بڑھانے میں مگن رہتے ہیں۔

شیر دل ۱۸ جون ۱۹۵۲ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد ایئرفورس میں بحیثیت ایئرمین بھرتی ہوگئے۔ جہاں آپ کو ٹیکنیکل ٹریڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ جب آپ کا تبادلہ کوئٹہ ایئربیس پر ہوا تو ۱۹۸۰ء میں آپ نے بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے کرلیا۔ اس کے لیے آپ نے اپنی قومی زبان یعنی اردو کا انتخاب کیا۔ ۱۹۸۲ء میں آپ سرگودھا میں تعینات تھے اور چیف ٹیک تھے۔ یہیں رہتے ہوئے آپ نے ایل ایل بی کیا۔ اور جب آپ چیف وارنٹ آفیسر کے عہدے پر پہنچے تو ایئرفورس کی اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر سرگودھا ہی میں رہنے لگے اور وکالت شروع کردی۔

جناب شیر دل ساجد ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ جو اپنے اندر اور باہر کے کرب کو جب دوسروں کے چہروں پر عیاں دیکھتے ہیں تو اسے لفظوں کا روپ دے کر کبھی ذہن کے صفحات پر اور کبھی اوراق کی لکیروں پر سجا دیتے ہیں۔ آپ شعر کہتے ہیں لیکن کم کم۔ اسی طرح کہانیاں بھی لکھتے ہیں اور اسی تعداد سے۔ یعنی نسبت کو کبھی اوپر تلے نہیں ہونے دیتے۔ آپ کی کہانیوں اور شعروں میں شیر کی جرات و دہشت اور دل کے دکھڑے تمام تر کیفیات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح دل کی ساری باتیں بغیر لگی لپٹی کے کہہ دیتے ہیں۔ البتہ زبان سے کچھ بتانے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے جب آپ سے ماضی کے بارے پوچھا تو خاموشی میں ٹال گئے اور پھر جب خط لکھا تو جواب تک نہ دیا۔ آپ کی سچائی اور کھرا پن تحریروں کے حوالے سے نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ○○○

نمونۂ کلام

نعت

کروں کیسے کلام اے حبیبِؐ خدا آپؐ خیرالانامؐ اے حبیبِؐ خدا
آپؐ فرمانروا آپؐ خیرالبشرؐ میں اک ادنیٰ غلام اے حبیبِؐ خدا
از ازل تا ابد ذاتِ نورِ ہدیٰ رحمتوں کا دوام اے حبیبِؐ خدا
افضل الانبیاؐ سرورِؐ دو جہاں تیرا اونچا مقام اے حبیبِؐ خدا
فیض پاتے ہیں تیرے ہی دربار سے کیا شیوخ و عظام اے حبیبِؐ خدا
ہے تہی ایک مدت سے اک عمر سے بھر دو میرا بھی جام اے حبیبِؐ خدا
اے شہِؐ انبیاء تجھ پہ لاکھوں درود
تجھ پہ لاکھوں سلام اے حبیبِؐ خدا

آدمی کے دم سے قائم زندگی کا ہے وقار
آدمی بن زندگی ہے سونا سونا ریگزار
زندگی ایسے ہے جیسے بہتے دریا میں حباب
چند لمحوں کے لئے ابھرا، مٹا اور تار تار

......

وفا کے نام سے عاری ہے انساں ہم نہ کہتے تھے
محبت کا بدل جائے گا عنواں ہم نہ کہتے تھے
تعصب کی بلائیں گر رہیں شامل مکینوں میں
اجڑ جائے گا یہ شہرِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

رسالدار ملک خادم حسین

پاکستان کے کچھ اضلاع اور پھر ان میں چند ایک مخصوص گاؤں ایسے ہیں جہاں کے لوگوں نے اپنے آپ کو فوجی خدمات کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ جونہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں خود کو محکمہ دفاع کے حوالے کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ پشت ہا پشت سے جاری ہے۔ حب الوطنی اور دفاعِ وطن کے اس جذبے میں اس مادیت پرست دور میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ لوگ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ جان کا نذرانہ وطن کو پیش کر سکیں۔ انہی بستیوں میں ایک بستی مٹھہ ٹوانہ ہے۔ یہ بستی پہلے ضلع سرگودھا میں تھی لیکن سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ایسی سیاست چلی کہ ضلعی حدیں بھی ٹوٹنے لگیں۔ تعصبات اور ہوا و ہوس نے ذہنوں میں گھر کر لیا۔ اور یوں نئے نئے ضلعے وجود میں آنے لگے جس سے خوشاب بھی پاکستان کے نقشے پر نمایاں ہوا تو۔۔۔ اب یہ گاؤں ضلع خوشاب کا حصہ ہے۔

ملک خادم حسین اسی مٹھہ ٹوانہ کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور پھر برصغیر کی انگریزی فوج میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ اس دور میں سرگودھا کے ٹوانہ خاندان کا کافی رکھ رکھاؤ تھا۔ ان کے نام کی ایک یونٹ ٹوانہ لانسرز فوج میں موجود تھی جسے ۱۸ ٹوانہ لانسرز کہا جاتا تھا۔ آپ نے اسی یونٹ کو جوائن کیا۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو یہ رجمنٹ ۱۹ لانسرز کہلانے لگی اور جناب خادم حسین اس وقت اس یونٹ میں جمعدار (نائب رسالدار) تھے۔

رسالدار ملک خادم حسین کا مجموعۂ کلام ۱۹۴۴ء میں "دیوانِ خادم" کے نام سے شائع ہوا۔ اس دیوان کی ایک خاص بات جو میں نے دیکھی کہ اس کا دیباچہ ۱۹ لانسرز کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹنٹ کرنل جی ایچ کرجلی نے انوکھے انداز میں لکھا تھا۔

جناب خادم حسین ملک نے حمد و نعت، قطعہ اور غزل کو موضوع بنایا۔ آپ کی شاعری میں روایات کی پاسداری اور ایک بے ساختہ پن ہے۔ اس دور میں کہے ہوئے آپ کے اشعار کو آج اس وقت کی شاعری کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ آپ کے کلام کے مطالعہ سے جو تصورِ زندگی ابھر کر قاری کے ذہن میں مرتسم ہوتا ہے وہ آپ کے پرخلوص جذبہ و احساس سے مملو محبت کا تابناک نظریہ ہے۔ محبت کا یہ نظریہ آپ کی روح کی گہرائی سے پیدا ہوا ہے۔ آپ نے زندگی اور محبت کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

بھٹکتا پھر رہا ہوں غم کا مارا یا رسولؐ اللہ — نہیں جز آپؐ کے کوئی سہارا یارسولؐ اللہ
کھلے عقدے ہزاروں، سینکڑوں راہِ عقیدت کے — کہ حق نے تم پہ جب قرآں اتارا یارسولؐ اللہ
محمدؐ نام جب لیتا ہوں مل جاتے ہیں لب باہم — تمہارا نام ہے کیا پیارا پیارا یارسولؐ اللہ
دلِ ناشاد ڈوبا جا رہا ہے بحرِ الفت میں — نظر آتا نہیں غم کا کنارا یا رسولؐ اللہ
اِدھر لاتقنطو کے قول سے کچھ بندھ گئی ہمت — اُدھر ہے تیری بخشش کا سہارا یارسولؐ اللہ
نہ جانوں نام نیکی کا یہی اک آس ہے دل کو — شفیع ہو گا قیامت میں دلارا یارسولؐ اللہ
مروں میں بھی تو مدفن ہو عرب کی پاک بستی میں — نہیں ہے ہند میں رہنا گوارا یارسولؐ اللہ

ترا خادمؔ ہوا جاتا ہے بے جاں دردِ فرقت میں
بلا لو اپنے قدموں میں خدارا یارسولؐ اللہ

غزل

میری تقدیر میں رونا تڑپنا یار لکھا تھا — ازل سے میرے حصے میں کسی کا پیار لکھا تھا
نہیں مٹتی یہ تحریریں جو ہیں قسمت کی زنجیریں — میری آنکھوں کا گویا ان سے ہونا چار لکھا تھا
محبت کا جواب ہنس کر دیا تھا اس نے نفرت سے — جہاں تحریر تھی گل کی وہاں پر خار لکھا تھا
گلہ مجھ کو نہیں ان سے پڑے پردے تھے آنکھوں پر — ذلیل ہونا محبت میں سرِبازار لکھا تھا
جفا ہونا بجا تیرا جفا سہنا بجا میرا — مقدر میں ازل سے یوں مری سرکار لکھا تھا
تمنا ہے کہ محشر تک رہے نظرِ کرم مجھ پر — خوشا قسمت کہ سجدے کو ترا دربار لکھا تھا

ہوا افسوس کیوں اتنا تمہیں خادمؔ کے مرنے کا
ازل سے اس کی قسمت میں نشانِ دار لکھا تھا

رسالدار رائے خادم علی

رائے خادم علی نام اور خادم علی خاکسار کے ادبی نام سے شعر کہتے ہیں۔ اتنا کم گو، خاموش طبع شخص، یوں لگتا ہے کہ اپنی ہی آگ میں خاموشی سے جل رہا ہے۔ اس زمانے میں کسی پر اعتبار نہیں کہ دل کی بات کہہ سکے۔ شاعری بھی اتنی ہی خاموشی سے کئے جار ہا ہے کہ روم میٹ تک کو پتہ نہیں۔ میں خود حیران ہوں کہ مجھے نجانے کیسے اس کی بھنک پڑ گئی اور پھر میں نے بمشکل اگلوایا۔ دیکھا تو ایک ضخیم دیوان تیار کر رکھا ہے۔

رائے خادم علی کا تعلق دیپالپور (اوکاڑہ) کے کھرل خاندان سے ہے۔ آپ کے والد کا نام غلام محمد ہے۔

جناب خادم علی ۸ مئی ۱۹۶۱ء کو دیپالپور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول دیپالپور سے ۱۹۷۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد سول میں ملازم ہو گئے۔ لیکن طبیعت کے منافی پا کر کچھ ہی عرصہ بعد اسے ترک کر دیا اور یکم اپریل ۱۹۸۱ء کو ایک کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ یہ یوں سارا سارا دن کرسی پر بیٹھے رہنا بھی آپ کو پسند نہ آیا اور چند سال اس سیٹ کا مزہ لینے کے بعد ٹریڈ Remust کروالیا۔ ۱۹۸۵ء میں کھاریاں میں مقیم تھے تو ایف اے کر لیا۔ پھر پروفیشنل کورس کیا اور اعزاز سے نوازے گئے۔ وہیں سکول آف آرمر کے لیے انسٹرکٹر چن لیے گئے اور چار سال تک (پاکستانی) اور Allied سٹوڈنٹس کو پڑھاتے رہے۔ Young Officers کی کئی کلاسیں بھی لیں۔

ایک عرصے سے شاعری کر رہے ہیں۔ جب سول میں ملازم تھے تو وہاں کے حالات آپ کی فطرت کے موافق نہیں تھے اور انہی نامساعد حالات نے آپ کو شاعر بنا دیا۔ فوج میں آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن مکمل خاموشی کے ساتھ۔ آپ کے چہرے کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ آپ ہر لمحہ کسی شعر کی تخلیق میں رہتے ہیں۔ لیکن میں نے اتنا صبر اور حوصلہ آج تک کسی شاعر میں نہیں دیکھا کہ چپکے چپکے یوں شعر کہے جائے کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ آپ کی شاعری میں پند و نصائح اور حالات کی بے راہروی، مسائل اور ان کا حل شامل ہے۔ ○○○

غزلیات

رات دیجور ہے آنکھ بے نور ہے والیٔ وقت فی الوقت مقہور ہے
اٹھ چکا ہے جنازہ مواخات کا کوئی مغموم ہے کوئی مسرور ہے
قیصر و کسریٰ جس نے مسخر کئے مسلماں آج وہ کتنا معذور ہے
جس نے ماضی میں نقشوں کو ترتیب دی زندگی کے لئے اب وہ ناسور ہے
جس کو پیدا کیا بندگی کے لئے قتل و غارت گری پر وہ مامور ہے
جس سے جبریلؑ کو بھی حیا آ گئی زینتِ بزم و بازار "مستور" ہے
چھائی اذہان پر فطرتِ آذری جوش و جذبہ براہیمی محصور ہے
یا الٰہی مسیحا کوئی بھیج دے
بسترِ مرگ پر تیرا دستور ہے

آبِ حیات حصۂ اغیار میں ہے کیوں مسلم تو ذہن و قلب کے آزار میں ہے کیوں
طوفان و دشت و بحر تک جس کے مطیع تھے بیکس پڑا وہ سایۂ دیوار میں ہے کیوں
جس قوم نے تھے وقت کے دھارے بدل دیئے زنجیر اس کے پایۂ کردار میں ہے کیوں
رکھی گئی تھی لا اللہ پر تری اساس غیروں کا رنگ اب تیرے شاہکار میں ہے کیوں
بزمِ جہاں پہ کفر ہے غالب تو کس لئے عکسِ غلامی ، ملتِ احرار میں ہے کیوں
بخشی گئی ہے تجھ کو زمانے کی رہبری
تو صرف اپنی ذات کے افکار میں ہے کیوں

صوبیدار غلام علی (جی اے بلبل، بلبل کاشمیری)

"ہنس لو" اس کے کئی معانی ہیں ایک تو یہ کہ مسکرالو۔ دوسرا مطلب ہے کہ ہنس (پرندہ) لے لو۔ تیسرا مقصد ہے روح اور آتما لے لو۔ اور یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جو لندن میں ایک جگہ کا نام ہے یعنی ہنسلو۔ تو ہمارے ایک اردو کے شاعر ہیں جناب بلبل کاشمیری۔ آپ کا پورا کلام پڑھ لیں یہی دعوت دیتا ہے کہ بھئی ہنس لو۔ جتنا جی چاہے میری بے بسی پر۔ یا یہ کہ ابھی وقت ہے ہنس لو اور آتما پالو۔ ورنہ بعد میں رونا پڑے گا۔ کبھی کبھی "خندۂ گل" (آپ کی کتاب) اور "بلبلیات" (آپ کے کلام کو دیا ہوا جناب ضمیر جعفری کا نام) پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ آپ ہنس دے رہے ہیں تاکہ اپنی چال بھول کر کہیں کے نہ رہو۔ اور ہاں! ہنسلو وہ مقام ہے جہاں آپ نے آج کل اپنا آشیانہ بنا رکھا ہے۔

شیخ غلام علی بی اے ۱۶ اپریل ۱۹۱۶ء کو بانڈی پور (سرینگر) میں پیدا ہوئے وہیں سے تعلیم شروع کی اور سری پرتاب کالج سرینگر جا پہنچے۔ چونکہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ آپ کو کالج میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں بی اے کر کے وہاں سے نکلے تو لوئر ہائی سکول کرگل میں بطور سیکنڈ ماسٹر کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں حکومت کشمیر نے بی ٹی کے لیے وظیفہ منظور کیا اور آپ نے ٹریننگ کالج جموں میں داخلہ لے لیا۔ لیکن فوراً ہی آپ نے اپنی خدمات فوج کے حوالے کر دیں۔ یوں دوسری جنگِ عظیم کے بقایا دنوں میں اسلحہ، ایمونیشن اور سٹورز لیتے دیتے رہے۔ اور اسی آرڈیننس کور سے ہی صوبیداری لے کر گھر لوٹے۔ جوانی میں کافی عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ انگریز کے ساتھ ملازمت نے انہیں کچھ زیادہ ہی دل پھینک بنا دیا (بقول بابائے ظرافت سید ضمیر جعفری) اس پر ستم یہ ہوا کہ میجر جنرل ڈوڈلے رسل سے دوستی ہو گئی۔

یہ بلبل ایک مدت سے چہک رہا ہے۔ کبھی اس شاخ پر، کبھی اس ٹہنی پر، کبھی برما کے جنگلوں میں تو کبھی کشمیر کی وادیوں میں، کبھی پاکستان میں پر خلوص دوستوں کے ساتھ تو کبھی انگلستان کے دلبروں کی محفل میں۔ جن کے بارے آپ لکھتے ہیں ؎

آنکھ نیلی، بال نقلی، چست جامہ، مست چال
دلبروں کی ہے یہی پہچان انگلستان میں

اسی وادی میں (اختر شیرانی مرحوم کے تتبع میں)

وہ اک مے تھی کہ اس عالم کو مے خانہ بناتی تھی
وہ اک لے تھی کہ اک نغمے کی صورت پھیل جاتی تھی
وہ اپنے ریشمی انوار اپنے ساتھ لاتی تھی
وہ ہنستی تھی تو اس کے ساتھ دنیا مسکراتی تھی
اسی وادی میں مریم چاندنی راتوں میں آتی تھی

سراپا حسن تھی مریم سراپا ناز تھی مریم
جنون و رنگ و برنائی کا اک اعجاز تھی مریم
جواں خوابوں میں ڈھل جاتی ہوئی آواز تھی مریم
وہ حسن و رنگ کا آہنگ بن کر مسکراتی تھی
اسی وادی میں مریم چاندنی راتوں میں آتی تھی

صبا صورت رواں رہتے تھے ان فردوس زاروں میں
ہمہ تن جذب ہو جاتے تھے فطرت کے نظاروں میں
ابلتے راگ تھے ہم نغمہ بر لب آبشاروں میں
محبت زندگی کے ساز پر نغمات گاتی تھی
اسی وادی میں مریم چاندنی راتوں میں آتی تھی

بلبلیات

وہ کھونٹے سے عاشق کا سر باندھتے ہیں کہ جیسے کوئی جانور باندھتے ہیں
بس اک آنکھ ہے گرچہ "موشے دایاں" کی نشانہ بڑا کارگر باندھتے ہیں
اگر سچ ہے ان کی کمر ہی نہیں ہے تو لڑنے پہ وہ کیوں کمر باندھتے ہیں
محبت کے بستر کے سپرنگ دیکھو یہ کھلتا ہے ہم جس قدر باندھتے ہیں
سنا ہے کہ لندن میں الو کے پٹھے
رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

صوبیدار محمد مقرب (مقرّب آفندی)

دریائے میگھنا میں جہاں اور بہت سے راز دفن ہیں۔ وہاں ایک پیشہ ور سپاہی، ایک سیدھے سادے مجاہد، ایک محبِ وطن پاکستانی اور ایک غازی محمد مقرب کی وہ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ جو انہوں نے ۱۹۷۱ء میں بھارت کے ہاتھوں قید ہونے پر اس دریا کے سپرد کی تھیں۔ یہ سرمایۂ فکر ایک مجاہد نے ایک بازوئے وطن کے ساتھ ہی قربان کر دیا تھا۔

محمد مقرب جو ترک قبیلے سے ہونے کی نسبت سے آفندی کہلاتے تھے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مانسہرہ کے گاؤں " بجالی" میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ ایبٹ آباد سے پاس کیا۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ ایک نظم لکھ کر ماہنامہ "پھول" کو بھیجی۔ سید امتیاز علی تاج نے اسے شائع کر کے اس بچے کے ذوقِ شعر و سخن کی آبیاری کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ فوج کے شعبہ سگنلز میں بھرتی ہو گئے۔ تیس برس فکر کے دائروں اور آواز کی لہروں سے برابر کا سلوک روا رکھا اور جب صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو تجربات کا عمیق سمندر پاس تھا۔ پھر آپ ڈسٹرکٹ آرمڈ سروسز بورڈ میں ملازم ہو گئے۔ اب جو کلام بچ رہا تھا یا محفوظ تھا اسے یکجا کر کے "بارود کی خوشبو" کی صورت منظرِ عام پر لے آئے۔ دوسرا مجموعہ "پیراہنِ یوسف" زیرِ ترتیب تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور آپ ۱۷ جولائی ۱۹۸۸ء کو اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ جناب مقرب آفندی کی وہ غزلیں جو سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے لکھی گئیں، بالکل روائتی قسم کی ہیں۔ وہی غمِ جاناں، وہی کیفیاتِ ہجر و وصال، وہی سوالِ ملاقات، وہی عرضِ غم، وہی شکائتیں اور وہی حکائتیں، غرض شعر جس نہج پر مدتوں سے چل رہا تھا ویسے ہی چلنے دیا۔ چونکہ ذہن کو ابھی کٹھنائیوں سے گزارنے کی ضرورت تھی جو آپ کو ایک قومی المیے کی صورت ملا۔ جس نے آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آپ کی شاعری ایک نئے آہنگ میں ڈھل گئی۔

صوبیدار مقرب آفندیؒ نے زیادہ تر ملی اور رزمیہ نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں مجاہدانہ شان اور سپاہیانہ بانکپن جھلکتا ہے۔ حمد، نعت، نظم، غزل حتیٰ کہ ان سنجیدہ موضوعات سے ہٹ کر آپ نے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے اور فوجی جوانوں کے دل بہلانے کا انہی کے لہجے میں سامان بہم پہنچایا ہے۔ ○○○

میرے وطن میں کیا نہیں

یہ لہلہاتی کھیتیاں یہ زر فشاں پہاڑیاں
اگل اگل کے سیم و زر مچل رہی ہیں ندیاں
یہ وادیاں ہیں دلنشیں میرے وطن میں کیا نہیں

گلاب و لالہ نسترن مرے وطن کا بانکپن
کہ جن کے تار تار سے چھلک رہا ہے انگبیں
مہک ہے شعلہ آفریں مرے وطن میں کیا نہیں

دکھا رہی ہیں کیا سماں بلندیوں پہ بدلیاں
یہ رنگتیں تو دیکھئے سفید سرخ سرمگیں
کہیں کہیں یہ احمریں میرے وطن میں کیا نہیں

قدم قدم پہ قہقہے شباب حسن چہچہے
گلی گلی کی رونقیں جمال خیز نازنیں
غم جہاں سے بے غمیں مرے وطن میں کیا نہیں

یہ حوریانِ نازنیں یہ مہوشانِ مہ جبیں
ادا ادا ہے اک غزل بدن ہیں جن کے مرمریں
ہنسی بہار آفریں مرے وطن میں کیا نہیں

سجیلے نوجواں نڈر غرورِ ناز بحر و بر
لبوں پہ مسکراہٹیں دلوں میں دولتِ یقیں
وقار قوم کے امیں مرے وطن میں کیا نہیں

یہ فوجیانِ صف شکن سرِ عدو پہ تیغ زن
حریفِ برق و باد ہیں حلیفِ ملک و قوم ہیں
جواں جواں حسیں حسیں
مرے وطن میں کیا نہیں

صوبیدار سید ذوالفقار علی زُلفی

سید ذوالفقار علی نام ۔ زُلفی تخلص اور زُلفی سید کے ادبی نام سے پہچانے جاتے ہیں آپ ۵ نومبر ۱۹۳۰ء کو ضلع سرگودھا کے اسلامی مرکز بھیرہ کے نزدیک ایک گاؤں علی پور سیداں میں پیدا ہوئے ۔ وہیں تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ مذہبی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی اور پھر ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو فوج میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہو گئے ۔ الیکٹریکل مکینیکل انجینئرنگ میں اکتیس سالہ مدتِ ملازمت مکمل کرنے کے بعد صوبیدار کے عہدے سے پنشن پائی ۔ چند سال علی پور سیداں میں گزارے جہاں آپ نے ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی اور ۱۹۸۵ء میں فیصل آباد میں شفٹ ہو گئے ۔

جناب زُلفی سید نے ۱۹۵۳ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ لیکن ماحول نہ ملنے کے باعث جو لکھتے پھاڑ دیتے اس شبہ میں کہ ابھی ناپختگی ہے۔ لیکن عادت کو برقرار رکھا۔ ۱۹۶۱ء میں فرقت کے زخم نے آپ کو مزید سان پر چڑھایا اور آپ خوب لکھنے لگے اور محفوظ بھی رکھنے لگے ۔ جب زندگی کا ایک بڑا حصہ فوج میں گزار کر واپس آئے اور فیصل آباد میں مقیم ہوئے تو سکندر ایاز سید سے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے آپ کی حوصلہ افزائی کی اور مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ یوں آپ نے اپنی محفوظ تحریروں کو کتابی شکل دینا شروع کی۔ اور پہلی کتاب "اکھ دے اوہلے" شائع ہوئی۔ "وفا کی بارش" اردو شعری مجموعہ اور "چیتی رت" پنجابی کلام بھی آپ کے عمدہ مجموعے ہیں۔

آپ مجلسِ تنویرِ ادب بھیرہ کے سرپرست، حلقہ اربابِ ذوق کے ممبر اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن بھی ہیں آپ نے عصری مسائل اور موضوعات کے مختلف پہلوؤں کو شاعری کی زبان میں قلمبند کیا ہے۔ آج کے دور کی ٹوٹ پھوٹ رشتوں اور تعلق کی دوریوں، منافقتوں حسد اور دشمنی کے روگ، نئی تہذیب میں زر کی چمک کے رشتے، اخلاقی قدروں کی پسپائی اور ان کے ساتھ محبت کا ازلی و ابدی جذبہ بھی آپ کی شاعری کا حصہ ہیں۔

اردو کی نسبت آپ کی پنجابی شاعری بہت مضبوط اور پختہ ہے ۔ جس میں آپ نے کائنات کے مسائل پر اپنی ماں بولی میں بڑے دلچسپ اور کھلے پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ ○○○

غزلیں

تعلق جب بھی ہوتے ہیں کشیدہ محبت اور ہوتی ہے تپیدہ
لگا دو آگ اس شہرِ وفا کو جہاں رکھنا پڑے سر کو خمیدہ
کریں ہم کس طرح ان سے تعاون نہیں رکھتے جو اوصافِ حمیدہ
لگے ہے چوٹ جس کو درد جانے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"
کسی کا دل دکھا کر مسکرانا منافق لوگ رکھتے ہیں عقیدہ
بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں دونوں جوانی اور اک عمرِ رسیدہ
بدلنے دو ذرا زلفی ہوا کو
ترا بھی لوگ لکھیں گے قصیدہ

دور دل سے اندھیروں کا ڈر کر لیا میں نے جب روشنی تک سفر کر لیا
اور ہی بڑھ گئی بے قراری میری جب تری یاد نے دل میں گھر کر لیا
وہ غریبوں کے دکھ بانٹ سکتا نہیں جس نے اپنے لئے جام بھر کر لیا
رکھ کے مدِنظر تیری رسوائیاں میں نے اکثر ترا نام ڈر کر لیا
ان سے انمول عہدِ وفا باندھنا کام مشکل تھا میں نے مگر کر لیا
اس کے در تک رسائی ملی تو لگا اک حسیں معرکہ میں نے سر کر لیا
بچ کے جاؤ گے زلفی کہاں کس طرف
اس نے عہد وفا پھر اگر کر لیا

صوبیدار محمد لطیف قریشی (لطیف پریشان)

کوہاٹ کی مردم خیز سرزمین نے دو پریشان پیدا کئے ہیں۔ دونوں نے ادب میں اپنا اپنا رنگ جمایا اور اپنا آپ منوایا ہے۔ ان میں سے ایک تو پشاور کے باسی ہو گئے اور دوسرے کوہاٹ کی تقسیم کی زد میں آگئے اور آج کل کرک کے باسی ہیں۔ ایک ہیں پریشان خٹک اور دوسرے ہیں جناب لطیف پریشان۔

محمد لطیف قریشی ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ء کو کرک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالحئی قریشی ہے۔ جن کے آباؤاجداد افغانستان سے ہجرت کر کے یہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔ آپ کے والد دیوبند کے فارغ التحصیل اور ممتاز عالم دین ہیں۔

آپ نے ۱۹۶۲ء میں ہائی سکول کرک سے میٹرک اور بنوں کالج سے ایف اے کیا۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو آپ فوج میں آگئے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں آپ کھیم کرن کے محاذ پر تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا تو وہاں آپ نے راجشاہی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ شومئی قسمت کہ آپ قیدی ہوئے اور جب جنگی قیدیوں کی واپسی ہوئی تو آپ بھی وطنِ عزیز کو لوٹے۔ آپ نے چلتے چلتے ایم اے بھی کرلیا۔ چونکہ آپ آرمی ایجوکیشن کور میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ لہٰذا آپ کو فوجی ہفت روزہ "ہلال" سے منسلک کر دیا گیا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو آپ کا میڈیکل بورڈ ہوا۔ اور آپ گھر آگئے۔

آپ نے بے شمار ریڈیو پروگرامز کئے۔ راجشاہی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ بے شمار کتب اردو اور پشتو میں تحریر کیں۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

پشتو زبان میں انجیل، توریت، تنقید، کارل مارکس مختلف موضوعات پر تقریباً بیس پمفلٹ صِفیہ، لاشریک، پنبتانہ (پٹھان قوم تاریخ کے آئینہ میں)، اردو زبان میں قرآن کا نظریۂ ادب، کنواری بیوہ، میجر عزیز بھٹی، پیاسے بادل، کلام منسوخ، کشمیر سے کربلا تک، ادب اور رومانیت، اقبال ۰۰۰ ایک سچا عاشقِ رسولؐ، بقلم خود، سرحد کے لوک گیت، پشتو زبان کے انگریزی شاعر، روڈ ٹو ماسکو، ان کے علاوہ کئی فیچر، مضامین اور افسانے بھی تحریر کئے۔ آپ کو بہت سارے ادبی اور براڈ کاسٹنگ ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ ابھی تک ماشاءاللہ آپ کے جذبے جوان اور قلم میں بھرپور توانائی اور روانی ہے۔ ○○○

غزلیں

بیتے ہوئے دنوں کی صدا ڈھونڈتے چلو — اے دوستو کہیں سے ضیا ڈھونڈتے چلو
سب کے دلوں پہ نقشِ تمنا کے زخم ہیں — ہر اک کے دردِ دل کی دوا ڈھونڈتے چلو
جو ہو چلے ہیں زیست کے صحرا میں دم بلب — ان کے لئے بھی آبِ بقا ڈھونڈتے چلو
جھانکو کبھی تو ذہن کے زنداں کو کھول کر — جو زندگی دے ایسی ہوا ڈھونڈتے چلو
ہم نے گزار دیں سبھی گھڑیاں امید پر — کہتے ہیں جس کو آہِ رسا ڈھونڈتے چلو
خوشیوں کا سائبان مقدر نہ بن سکا — اے غمزدو دکھوں کی دوا ڈھونڈتے چلو

شہروں کی صاف سڑکیں نہ راس آ سکیں لطیفؔ
گاؤں کی دھول ہی میں وفا ڈھونڈتے چلو

★

ڈھلتی ہے رات شہرتِ فنکار کی طرح — آیا ہے کوئی نورِ سحر یار کی طرح
اس مہرِ نیمروز کے آنے کی دیر ہے — مٹ جاؤں گا میں سایۂ دیوار کی طرح
اے تشنگانِ شوق ہر اک تلخیِ حیات — پینا پڑے گا شربتِ دیدار کی طرح
شاید تیرے فراق کا حاصل ہے وہ نفس — سینے کو کاٹتا ہے جو تلوار کی طرح
وہ ٹمٹما رہی ہے کہیں شمعِ آرزو — پردیسیوں کے بھیجے ہوئے پیار کی طرح

جنسِ وفا چھپائے ہوئے راہزنوں سے ہم
اب شہر شہر پھرتے ہیں نادار کی طرح

صوبیدار محمد توکل سائل

نام: محمد توکل تخلص: سائل ولدیت: میاں احمد دین

۱۹۳۴ء میں پنڈی گھیب ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ پوچھا جائے تو بڑا مہمل سا جواب دیتے ہیں یعنی "مطالعہ جہاں"

میں سوچتا ہوں کاش! کہ ہر شخص کی تعلیم مطالعہ جہاں پر مبنی ہو۔ کیونکہ سب سے بڑی تعلیم یہی ہے ۔۔۔ اسناد یا ڈگریاں لے کر یونہی پھرتے رہنے سے کیا فائدہ؟ مطالعہ جہاں ہی وہ تعلیم ہے جو آدمی کو انسان بنا سکتی ہے۔

جناب محمد توکل سترہ سال کی عمر میں پنجاب رجمنٹ میں بھرتی ہوئے اور ۲۸ سال تک عسکریہ پیمائی کرتے رہے۔ جس میں بہت کچھ سیکھا۔ ملازمت کے دوران کئی مراحل طے کئے اور کئی قسم کے حالات سے واسطہ پڑا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ چھمب جوڑیاں سیکٹر میں لڑی تو ۱۹۷۱ء کی جنگ واہگہ کے محاذ پر ایک پلاٹون کی کمان کی۔ ۱۹۶۲ء میں مغربی ایریان انڈونیشیا جانے والے امن دستہ میں شامل تھے۔ یوں وہاں دیارِ غیر میں بھی تقریباً ۸ ماہ تک زمانے کو پڑھتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

جب عسکری سوچوں سے ذہن کو فراغت ملی تو ماحول اور وقت کے مطابق خیالات پنپنے لگے۔ جنہیں آپ کوئی شیپ اور کوئی شکل دینے پر کچھ عرصہ غور کرتے رہے۔ بالآخر اپنے عمیق مشاہدہ و مطالعہ سے ابھرنے والے ان خیالات کو حساسیت کی بناء پر شعری روپ دینے میں کامیاب ہو گئے اور ۔۔۔ اب ۔۔۔ آپ پنڈی گھیب کے سینئر بزرگ اور استاد شاعر شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام "کشکول سائل" ترتیب پا چکا ہے لیکن اشاعت میں کچھ مجبوریاں حائل ہیں اور یہی مجبوریاں آپ کو اپنا پیغام عوام الناس تک پہنچانے میں بھی دیوار بنی ہوئی ہیں۔ آپ بڑے سلیس اور سادہ الفاظ میں بڑے چبھنے اور کھبنے والے شعر کہتے ہیں۔ جن کے بارے آپ نے خود یوں لکھا ہے۔ ؎

سادہ سی ہے شاعری میری رنگ، روغن نہ چونا گیری
جو دیکھوں وہ لکھ دیتا ہوں لفظوں میں نہ ہیرا پھیری

اور

ڈوڈی بلبل کھول رہی ہے کھلنے کو پر تول رہی ہے
باہم ت ہے گونگی بہری اندر سے کچھ بول رہی ہے

غزلیں

سچ بولا ہے جب سے پیارے　　دیکھ رہا ہوں دن کو تارے
سچ کہتا ہوں جھوٹ نہیں ہے　　جھوٹا میں ہوں سچے سارے
بھول نہیں تو اور ہی کیا ہے　　پتھر ہلکے پھول ہیں بھارے
رب جانے کب دریا اترے　　ڈوبے ہیں سب ساتھ سہارے
ڈٹ جانا تو چھوڑ دے سائل
بہتے ہیں یاں الٹے دھارے

ذہنوں سے پھوٹتے ہیں عنوان زندگی کے　　آتے ہیں پھر زباں پر دیوان زندگی کے
محدود رونقوں کو کچھ اور طول بخشو　　کچھ رہ گئے ادھورے ارمان زندگی کے
میت اٹھائے اپنی کعبے کو جا رہا ہوں　　زندہ نقوش دیکھے بے جان زندگی نے
احساس بٹ رہا ہے، تہذیب لٹ رہی ہے　　ترتیب پا رہے ہیں بحران زندگی کے
کچھ مہرباں بھی آئے کچھ نارسا بھی آئے
کیا کیا ہوئے نہ سائل مہمان زندگی کے

قطعہ

ہے بات ابھی تک پردے میں　　کچھ وہ چپ چپ کچھ ہم چپ چپ
یاں چوری سارے کرتے ہیں　　کچھ وہ چھپ چھپ کچھ ہم چھپ چھپ

صوبیدار عبدالستار آثم

موجِ آبِ گہر از تاجِ شہاں مے گزرد
قطرہ در مرتبہِ خویش کم از دریا نیست
از حباب آموز ہمت را کہ باصدا احتیاج
خالی از دریا بروں آرد سبوئے خویش را

فارسی کے یہ اشعار ایک قدیم شاعر فوجی کے ہیں۔ہاں ! واضح کردوں کہ فوجی ان حضرات کا محض تخلص تھا، پیشہ نہیں۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سیف و قلم کی ہمدمی بھی ازل سے قائم ہے۔ اسی لیے تو جو فوجی نہیں ہوتے وہ بھی فوجی اور عسکری تخلص کرتے رہے ہیں۔ بہرحال عساکر میں بے شمار شعراء پیدا ہوئے۔ جن کی فہرست ترتیب دینا ممکن نہیں۔ جب سے اردو زبان رائج ہوئی ہے تب سے اب تک ہزاروں نام ایسے ملتے ہیں جنہوں نے سیف اور قلم دونوں سے ناطہ رکھا۔ جناب عبدالستار آثم اسی ناطے کے حوالے سے منفرد ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔، آپ اپریل ۱۹۵۴ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور محکمہ دفاع میں بھرتی ہوگئے۔ پیشہ ورانہ قابلیت نے آپ کو بڑا خوبصورت موقع فراہم کیا اور آپ سٹریپ (Strep) کے زینے کراس کر کے پیس تک پہنچ گئے۔ عسکری زندگی میں یہی تو لطف اور انصاف ہے کہ حقدار کو اس کا حق ملتا ہے۔

صوبیدار عبدالستار آثم ایک عرصے سے شاعری کر رہے ہیں۔ جب آپ سرگودھا میں رہائش پذیر ہوئے تو ادبی ماحول سے بھی کبھی کبھار استفادہ اٹھایا۔ آپ کا لہجہ بڑا توانا ہے۔ آپ کی غزلوں میں جہاں سلاست روانی، مضمون آفرینی اور تغزل کے حسین عکس ملتے ہیں وہاں ان کی نظم میں دورِ حاضرہ کی صداقت ایک عمدہ اضافے کو ثابت کرتی ہے۔ آپ نے نعت بھی کہی ہے اور اس میں تقدس، حسن اور خیر کو عقیدت و احترام کے پہلو بہ پہلو رکھا ہے۔ کبھی کبھی معاشرتی گھٹن کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ جو اپنے ہی رنگ میں ابھرتا ہے۔ ○○○

نعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

یارب درِ رسولؐ پہ جانا نصیب ہو   لطحا کی خاک سر میں سجانا نصیب ہو
یہ آرزو ہے میرے دلِ ناصبور کی   روضے پہ جا کے اشک بہانا نصیب ہو
ہے یہ دعا کہ جا کے مدینے میں ایک بار   ہر گز نہ لوٹ کر مجھے آنا نصیب ہو
دل میں ہے چاہتوں کا خزانہ دبا ہو   اے کاش انؐ کے در پہ لٹانا نصیب ہو
قسمت دکھائے دن کبھی جالی کو چوم کر   آنکھوں کی اپنی پیاس بجھانا نصیب ہو
آثم پہنچ کے در پر نبیؐ جی کے روبرو
بیمار دل کا حال سنانا نصیب ہو

غزل

چراغِ عشق جلتا ہی رہے گا   یہ لاوا تو ابلتا ہی رہے گا
رہیں گے در پئے آزار ظالم   شجر الفت کا پھلتا ہی رہے گا
رہے گا پیار ہی زندہ ہمیشہ   دلوں میں حق مچلتا ہی رہے گا
رہے گی تا ابد حق کی بڑائی   عدو آتش میں جلتا ہی رہے گا
قدم چومے گی آثم کامیابی
خلوص و پیار بڑھتا ہی رہے گا

وارنٹ آفیسر محمد اعجاز (اعجاز جہلمی ثم اعجاز حسن)

پیدائشی یعنی ابتدائی نام محمد اعجاز اور اسی نام سے ایئرفورس میں وقت گزارا۔ جب جہلم میں آئے تو اعجاز جہلمی اور پھر جب لیکچرر شپ اختیار کی تو اعجاز حسن بن گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جہلم کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم یہیں حاصل کی اور پھر ایئرفورس میں ایئرمین بھرتی ہو گئے۔ دوران ملازمت سلسلہ تعلیم جاری رکھا۔ وارنٹ آفیسر کے عہدے پر تھے کہ کسی بیماری نے آلیا اور پھر میڈیکل بورڈ کے تحت سروس چھوڑ دی۔ وہ کہتے ہیں ناں ! کہ اللہ رب العزت کی طرف سے جو فیصلہ ہوتا ہے اس میں انسان کے لیے بہتری ہوتی ہے۔ لیکن اے کاش کہ انسان اس حقیقت کو سمجھ پائے۔ محمد اعجاز کے لیے یہ "کُبے والی لت" ثابت ہوئی۔ اور آپ کی تقرری بحیثیت لیکچرر کوہاٹ کالج میں ہو گئی۔ پھر وہیں گھر بسالیا اور محمد اعجاز جو ادبی حلقوں میں اعجاز جہلمی کے نام سے پہچانے جاتے تھے اعجاز حسن کہلانے لگے۔ نجانے کیوں؟ شاید رشتوں کے نئے بندھن کے باعث ... یا ... بہرحال وہ خود ہی جانتے ہیں۔ کچھ عرصہ آپ درس و تدریس کے اس شعبے سے منسلک رہے۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ اسلام آباد آ گئے۔ شاید یہ بہ سے بہتر کی سمت کا سفر ہو۔

اعجاز حسن نے شاعری میں جدید لفظیات اور نئی نویلی علامات استعمال کی ہیں۔ فکر کی تازگی، جذبے کی شگفتگی اور اسلوب کی ندرت انہیں پختہ شعراء کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔ بقول محسن احسان "ان کی غزل جدید طرز اظہار اور قدیم طرز اظہار کے تال میل سے وجود میں آئی ہے اور آج کے عہد کی تمام اصطلاحوں مثلاً داخلیت، خارجیت، موضوعیت، معروضیت کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے دل کو آئینہ جہاں نما بنا کر ہر عکس کو اس کے توسط سے دیکھتے ہیں اور یوں عہدِ موجود کے تلخ حقائق سادگی و پرکاری سے بیان کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں"

جناب اعجاز حسن نے "ریت کا بھنور" ادبی محفلوں میں لا کر شاعری میں جدت اور نئے لہجے کا صرف اضافہ ہی نہیں کیا اپنا آپ جنوا بھی لیا ہے۔ ○○○

دعا

چرخِ ویراں کو ستاروں کا سمندر کر دے　　میرے مولا میری دھرتی کو منور کر دے
میرے دن رات میں گلزارِ مدینہ مہکے　　مجھ کو ایمان کی خوشبو سے معطر کر دے
جس سے ہو جائے میرے جسم کی تختی اجلی　　ایسا باطن مجھے سرکار میسر کر دے
بحر بھی آ کے مری سوچ سے وسعت مانگے　　میری ہر فکر کے قطرے کو سمندر کر دے
گھر گیا ہوں میں غنیموں کی صفوں میں تنہا　　مرے مولا تو مری ذات کو لشکر کر دے
گردشیں تیری محبت کی رقم کر جاؤں　　اسم اعظم کو مری سوچ کا محور کر دے

صدقِ ایمان کا اعجاز تقاضا ہے یہی
زندگی اپنی محمدؐ پہ نچھاور کر دے

غزل

مرے چہرے کے خال و خد لہو کرتی رہی دنیا　　کچھ ایسے آئینوں کو روبرو کرتی رہی دنیا
جو میرے گوش میں اترے وہ سارے لفظ مہمل تھے　　نہ جانے کس زباں میں گفتگو کرتی رہی دنیا
فقیروں کی طرح ہم بے ضرر کردار رکھتے تھے　　مگر پھر بھی ہمیں بے آبرو کرتی رہی دنیا
مری صبحوں کے ماتھے پر رقم ہوتے رہے نوحے　　مری راتوں کے سینوں کو لہو کرتی رہی دنیا
روابط خشک پتوں کی طرح مرجھا گئے آخر　　محبت کے شجر کو بے نمو کرتی رہی دنیا
میں اپنے گھر کا سرمایا تھا اپنے گھر کا حصہ تھا　　مجھے تقسیم پھر کیوں کوبکو کرتی رہی دنیا
ہمیں تو پھول کے چہرے کی رعنائی سے مطلب تھا　　چمن میں امتیازِ رنگ و بو کرتی رہی دنیا
میں اپنے دل کے اندر خواہشیں جب دفن کر بیٹھا　　تو اس کے بعد میری جستجو کرتی رہی دنیا

بہت رویا میں کل اعجاز اپنی بے زبانی پر
مرے بارے میں کیا کیا گفتگو کرتی رہی دنیا

نائب صوبیدار عطاء محمد (حاجی لق لق)

حاجی لق لق کا اصل نام مولانا ابوالعلیٰ عطاء محمد چشتی تھا۔ آپ کے والد کا نام بندو علی تھا جو پرائمری جماعت پاس تھے اور محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ حاجی لق لق ۱۸۹۳ء میں پتی مغلاں تحصیل قصور ضلع لاہور میں پیدا ہوئے۔ پتی مغلاں آج کل بھارت میں ہے۔ ابتدائی تعلیم اس دور کے مطابق صاحب رسمی تک مولوی صاحب سے حاصل کی۔ اور پھر گاؤں ہی سے پرائمری پاس کیا۔

بقول مسعود شیخ ۱۹۱۴ء میں امرتسر سے فوج میں نائب صوبیدار بھرتی ہوئے لیکن اکثر حوالوں کے مطابق آپ حوالدار بھرتی ہوئے تھے۔ انہیں ابتداء ہی سے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز یعنی فوج کے شعبہ تعلقات عامہ میں رکھا گیا۔ اسی شعبہ کے تحت انہیں عراق بھجوا دیا گیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں جنگ عظیم اول اپنے عروج پر تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جب جنگ عظیم اول ختم ہو گئی اور لیگ آف نیشنز نامی ادارہ وجود میں آیا تو حاجی لق لق مرحوم کو عراقی حکومت نے اپنے ہی شعبہ تعلقات عامہ میں ملازمت دی۔

عراق میں مجالس مشاعرہ منعقد ہوتیں تو حاجی صاحب وہاں بھی اپنا کلام سنا کر داد وصول کرتے۔ حاجی صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ ان مشاعروں میں گورنر کوفہ بھی شریک ہوتے تھے جو حاجی صاحب کے بہت بڑے مداح تھے۔ انہی شعروں اور مجالس کے حوالے سے حاجی صاحب کی شادی گورنر کوفہ کی صاحبزادی سے ہو گئی۔

حاجی صاحب کے دو بھائی اور بھی تھے۔ دونوں آپ سے چھوٹے تھے۔ عبداللہ اثری اور دین محمد۔ ۱۹۳۴ء میں عبداللہ اثری نہایت اصرار کر کے آپ کو وطن واپس لے آئے۔ اب آپ نے اندرون گلوالی دروازہ امرتسر میں رہائش اختیار کی اور روزنامہ "مساوات" امرتسر سے اپنی صحافتی ملازمت کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا ظفر علی خان سے ملاقات ہوئی تو آپ کو انہوں نے "زمیندار" سے منسلک کر لیا۔ ان دونوں اخبارات کے علاوہ آپ "روزنامہ مغربی پاکستان" لاہور، روزنامہ "احسان" لاہور اور روزنامہ "ناقوس" لاہور سے بھی منسلک رہے۔ جناب حاجی لق لق اگست ۱۹۶۱ء میں بیمار ہوئے۔ بائیس روز تک میو ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ لیکن مرض میں افاقہ نہیں ہوا اور ۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء کو انتقال کر گئے۔ آپ کو جی ٹی روڈ پر قبرستان بدھو کے آوا میں سپرد خاک کیا گیا۔ ○○○

فلمی غزل

ہوا ظاہر حسینوں کا نیا آئین پر پردے پر
جو تھے پردے میں پہلے اب ہیں وہ بے دین پردے پر

رخِ سیمیں کہ جس کے دیکھنے کو ہم ترستے ہیں
نظر آتا ہے سب کو آج کل سیمین پردے پر

یہ پردہ فلم کا ہے یا فلک کا ایک ٹکڑا ہے
اتر آئے ہیں کتنے انجم و پروین پردے پر

تم اپنے حسن کی رنگینیوں کو کیا چھپاؤ گے
کہ فلمیں آ رہی ہیں آج کل رنگین پردے پر

ملیں جس طرح چاہیں تجھ سے دشمن پردے پردے میں
مگر دیکھی نہیں جاتی تری توہین پردے پر

وہ سینما گیلری میں بیٹھے پکچر اپنی تکتے ہیں
لگا ہے بے خودی میں دیدۂ خودبین پردے پر

جو ہم سے چاہنے والے ہزاروں ہیں تو بسم اللہ
بہت دیکھے ہیں ہم نے بھی نگارِ چین پردے پر

پسِ پردہ بھی اس کے حسنِ آرائش کا کیا کہنا
مگر کچھ اور ہے اس شوخ کی تزئین پردے پر

اتارو عکس لق لق کا بھی سینما کمپنی والو
نظر آئے کبھی یہ بھی تو کامک سین پردے پر

غزل

اک بے وفا کی چاہ کئے جا رہا ہوں میں
اور یوں ہی خواہ مخواہ کئے جا رہا ہوں میں

جھڑتی ہیں ان کے منہ سے جو منظوم گالیاں
سن سن کے واہ واہ کئے جا رہا ہوں میں

موٹر لگی ہوئی ہے مرے سائیکل کے ساتھ
پھٹ پھٹ پھٹاہ پھٹاہ کئے جا رہا ہوں میں

نکلا ہوں بزمِ یار سے میں اس طرح سے آج
گویا کسی سے بیاہ کئے جا رہا ہوں میں

پنجابیوں کی ہیں یہی مہماں نوازیاں
تیرے لئے کڑاہ کئے جا رہا ہوں میں

پوڈر سے اپنے چہرے کو کرتے ہیں وہ سفید
داڑھی کو یاں سیاہ کئے جا رہا ہوں میں

لق لق جب ان سے رحم کی امید ہیں نہیں
کیوں ہتیہ گرہ کئے جا رہا ہوں میں

نائب صوبیدار محمود اختر اسیر (محمود اسیر)

گجرات میں ایک خاندان ہے چابکسوار، جو اپنے آپ کو گجرات کے قدیم رؤسا کا گھرانہ کہتے ہیں۔ اسی گھرانے میں ۱۶ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمود اختر رکھا گیا جو بعد میں میاں محمود اختر اسیر کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ میاں خاندانی اعزاز کے طور پر سابقہ اور اسیر تخلص کے طور پر لاحقہ بن گیا۔ آپ کے والد کا نام میاں نو بہار الدین ہے۔ آپ نے پبلک ہائی سکول سے میٹرک اور زمیندار کالج گجرات سے ایف اے کیا۔ آپ اپنے تعارف میں لکھتے ہیں " ناز و نعم میں پرورش پانے کی وجہ سے مزاج کچھ لاابالی سا رہا۔ بہرحال تعلیم کی طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہوئی ۰۰۰ والد کی ملازمت لاہور میں تھی جہاں وہ انٹی کرپشن میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے لاہور ان کے پاس چلا گیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گیا۔ لیکن بدقسمتی سے والد صاحب کی وفات سے دل اچاٹ ہوا اور لاہور سے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ پروگرام اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی ملازمت کا تھا۔ جو اس وقت کے حالات کے باعث پورا نہ ہو پایا۔ اور بمبئی میں ہی نوکری کے ساتھ تعلیم جاری کی جو بوجہ فسادات چھوڑ کر کراچی واپس آ گیا اور فوراً ہی آزاد کشمیر مسلم نیشنل گارڈز میں شامل ہو گیا۔ سیز فائر پر واپس آیا اور ۱۹۴۹ء میں آرڈننس کور میں بھرتی ہو گیا۔ پاکستان میں خدمات کی انجام دہی کے علاوہ یو این او مشن کانگو اور مسقط میں بھی پاکستان آرمی کی نمائندگی کی"۔

جناب محمود اختر اسیر فوج میں رہتے ہوئے بھی فنون لطیفہ سے منسلک رہے۔ کبھی شعر و سخن سے ناطہ جوڑا، کبھی ڈرامے کئے۔ کھیلوں میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۵۶ء میں باقاعدہ طور پر پیر فضل حسین فضل گجراتی کی شاگردی اختیار کی۔ پنجابی شاعری میں پیر فضل کا اپنا ایک مقام ہے اور اگر آپ کو پنجابی غزل کا بانی کہا جائے تو میرے خیال میں مبالغہ نہ ہوگا۔ میاں محمود اختر بھی استاد کی پیروی میں پنجابی میں شعر کہنے لگے۔ لیکن چونکہ زیادہ واسطہ اردو پڑھنے، بولنے اور لکھنے سے رہا۔ اس لیے اردو شاعری سے اپنے آپ کو علیحدہ نہ کر سکے۔ ۱۹۷۸ء میں جب ریٹائرمنٹ پر گھر آئے تو ایک ادبی ماحول بھی میسر ہوا گو مختلف قسم کے کاروبار میں مشغول رہے لیکن قلم کی مشقت بھی جاری رکھی۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ایک عرصہ سے یہ سلسلہ قائم ہے۔ ؎

میں قلم کا ہوں امیں دوش ہوا پہ لکھوں
بحرِ اسود کی سیاہی سے فضا پہ لکھوں

غزلیں

کتابِ عشق میں جو باب لکھے   بصد عزت ہیں کچھ احباب لکھے
وفا و حسن و عشق و شہرِ گجرات   وہ دیکھیں زیرِ جوشِ آب لکھے
رہِ الفت میں ان اہلِ جنوں نے   جو تھے دریا سبھی پایاب لکھے
عجب سی شے ہے یہ حسنِ مرصع   اسے جو لکھے عالمتاب لکھے
مٹا ڈالے ہیں سیلِ گریہ نے وہ   میری آنکھوں میں جو تھے خواب لکھے
پریشانی و بے خوابی و حسرت   یہ لفظِ عشق کے اعراب لکھے
دریدہ پیرہن مقدور عاشق   کہاں اس ضمن میں کم خواب لکھے
ترے آنسو کہے ناسفتہ موتی   تو میرے اشک بھی خوناب لکھے
مرے غم کا نہ اس کو لکھے باعث   مری غم پروری اسباب لکھے
جو لکھے ذکرِ تابِ زلفِ لیلیٰ   جگر مجنوں کا بھی پیتاب لکھے
کوئی ہم سر ترا ہو بھی تو کیسے   نصیبوں میں ہیں پر سرخاب لکھے
جو مانگے عشق گر خطۂ زرخیز   تو قسامِ ازل پنجاب لکھے

جبیں روشن تری راحت فزا ہے
اسیر اس کو نہ کیوں ماہتاب لکھے

جو چشمِ گہر بار کو دریا نہیں کرتے   کیا جانیں وہ کیا کرنا تھا اور کیا نہیں کرتے
کھو جائے گا دل عشق میں معلوم تھا ہم کو   خود کھو کے کسی چیز کو ڈھونڈا نہیں کرتے
اس دل کے حرم خانے کی روزن ہیں یہ آنکھیں   جو غیر ہوں اس سمت کو جھانکا نہیں کرتے
جو جانتے ہوں عشق میں کیا کیا نہیں جائز   آنکھوں کو نمی دے کے وہ رسوا نہیں کرتے
چاہت بھی اگر سوچ کے تابع ہو تو ہے فسق   دل دینے پہ آتے ہیں تو سوچا نہیں کرتے
گر نظر حیا بار نہ ہو ، لاکھ حسیں ہو   ہم ایسوں کو نظروں میں بٹھایا نہیں کرتے

تسلیم کہ یہ جاں ہے اسیر اس کی امانت
پھر مانگے وہ جب عذر تراشا نہیں کرتے

نائب صوبیدار محمد عثمان ڈار

محمد عثمان ڈار ۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی محمد اسحاق ڈار برصغیر کے معروف پہلوانوں میں سے تھے۔ جو گوگا پہلوان رستم ہند کے شاگردان رشید میں سے تھے۔

محمد عثمان ڈار نے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا لیکن خواہش کے باوجود مزید اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ آخر جویندہ و یابندہ کے مصداق ایک دارالمطالعہ کے ناظم مولانا نصراللہ خان خازن کی رہنمائی میں خوب سیر حاصل مطالعہ کیا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ ای ایم ای کور میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی امن فوج کے لیے منتخب ہو کر زائرے گئے۔ جہاں آپ نے بنگالا زبان پر دسترس حاصل کی۔ اور دعوتِ دین کا کام کرنے لگے۔ نومسلموں کی ابتدائی ضروریات کے لیے آپ نے بنگالا زبان میں ایک کتابچہ "اولنگی مالاموں" کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۶ء میں "حکمت تبلیغ" اور "اسلامی عبادات" نامی کتابچوں کے بنگالا زبان میں ترجمے کر کے زائرے بھجوائے۔ ۱۹۷۱ء میں جب کہ آپ نائب صوبیدار تھے، مشرق وسطیٰ بھیجے گئے۔ المیہ سقوط پر سید پور کے مقام پر تھے کہ جنگی قیدی ہوئے اور قید کا عرصہ آپ نے بھارت کے شہر رانچی میں گزارا۔ قیدی کیمپوں میں سہولت نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو بیماری نے آلیا اور دن بدن آپ کی صحت گرنے لگی۔ آخر کار ۱۹۷۳ء میں جب بیمار قیدی واپس آئے تو آپ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ دو سال تک کوئٹہ اور کھاریاں کے ہسپتالوں میں زیر علاج رہے۔ اور ۱۹۷۵ء میں آپ کو طبی بنیاد پر پنشن دے دی گئی۔

۱۹۷۵ء میں آپ اسسٹنٹ سکیورٹی افسر ہلال ٹینریز گجرات میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں آپ کا تبادلہ سروس شوز انڈسٹریز میں ہو گیا۔

آپ اردو نظم اور نثر دونوں اصناف میں ایک مدت سے لکھ رہے ہیں۔ لیکن آپ کا مشن صرف اور صرف تبلیغ ہے۔ اصلاحی نظمیں اور تحریریں لکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل جن کو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے، آپ کے قلم سے نہیں بچ سکتے۔ آپ ملکی و ملی حالات پر بھی لکھتے رہتے ہیں اور وہ اخلاقی جھول جو زوالِ ملت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ درس بھی دیتے رہتے ہیں۔ "متاعِ دل" آپ کا شعری مجموعہ اور "تنویرِ افکار" آپ کا نثری سرمایہ ہیں۔

آپ نے "انجمنِ فلاحِ عامہ" کے نام سے ایک تنظیم بھی تشکیل دے رکھی ہے جو خاصی سرگرم ہے اور علاقے کے مسائل کے حل میں اہم حصہ لیتی ہے۔ ○○○

حمد باری تعالیٰ

ربِّ شاہِ امم رکھ لے میرا بھرم　کر نگاہِ کرم دیکھ لوں میں حرم
ہے قیامت بپا ہر نفس ہر قدم　مجھ پر آسان کر زیست کے پیچ و خم
کر رہا ہوں دعا تجھ سے باچشمِ نم　مالکِ دوسرا تجھ کو تیری قسم
ختم کر دوریاں میری مجبوریاں　کر گنہگار پر اپنا لطف و کرم
سارے پردے اٹھا اپنا جلوہ دکھا　دور کر دل سے سب خواہشوں کے صنم
تیری رحمت کا سایہ مرے سر رہے　میں تو کرتا ہوں ہر آن خود پر ستم

جب تلک میں جیوں تیرا بن کے جیوں
تیری جانب اٹھے میرا اک اک قدم

مصلحت بینی

نفوذِ شوق نے اکثر دیا درسِ جنوں مجھ کو　مگر کچھ مصلحت بینی رہی آگے نہاں اکثر
کٹھن ہیں وادیاں کتنی محبت کی بتا مجھ کو　وفورِ شوق نے ہر جا کیا مجھ کو عیاں اکثر
مری مجبوریوں نے ہی کیا لاچار ہے مجھ کو　مگر افکار نے رکھا مرے دل کو جواں اکثر
صراطِ مستقیمی آ بتایا ہے کہاں مجھ کو　بسے ہیں راہگزر پر ہی کئی راہزن جہاں اکثر
بچائے گا ندامت سے وہی مشفق خدا مجھ کو　رہا ہوں بندگی سے میں تہی دامن عیاں اکثر

سنا دو پھر وہی عثماں پیامِ جاوداں مجھ کو
بھلا کر بھی جسے میں نے کیا نہ حرزِ جاں اکثر

نائب صوبیدار شبیر حسین شہری

گجرات کے بارے میں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ "جہاں حسن ہو وہاں عشق ہوتا ہے اور جہاں عشق ہو وہاں شاعری جنم لیتی ہے۔ چونکہ گجرات سوہنا ہے اور سوہنی کا شہر ہے۔ لہٰذا وہاں کے عزت بیگ اگر شعر کے پس پردہ عشق و محبت کی بات کر رہے ہیں تو کوئی اچنبھے والی بات نہیں" اسی گجرات کی بٹ فیملی سے تعلق رکھنے والے نوجوان جناب شبیر حسین شہری کے شاعر ہونے پر کم از کم مجھے کوئی نئی بات نظر نہیں آتی۔ بلکہ حمیرا علیم بھی اس سلسلے میں میری تائید کرتے ہوئے لکھتی ہیں "شبیر حسین شہری ادب کی دنیا میں نووارد ہے مگر محبت کے اٹل جذبوں سے بخوبی آشنا ہے اور انتظار کے لمحات کی کسک کو نہ صرف خود محسوس کیا ہے بلکہ اسے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے لفظوں کا پیراہن بھی دیا ہے ... "پلٹ کے آؤ جب کبھی" ایک حساس دل کے سچے شاعر کا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں محبت کی خوبصورت واردات اور انتظار کی کیفیت کو بڑے دلکش پیراہن میں سمویا ہے"

جناب شبیر حسین بٹ ۲۶ اپریل ۱۹۶۹ء کو گجرات شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام منظور حسین ہے۔ پبلک ہائی سکول نمبر ا گجرات سے میٹرک، زمیندار کالج سے F.sc اور سائنس کالج گجرات سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے انگلش میں داخلہ لیا ہی تھا کہ حالات کی ذکر کوئی کے باعث تعلیم کو خیرباد کہہ کر فوج میں آ گئے۔ اور ایجوکیشن کور میں جونیئر کمشنڈ آفیسر لیے گئے۔ آپ نے اپنے کورس میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ جو ایک اعزاز ہے۔

آپ کالج کے دور سے ہی ادب کی طرف مائل تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام "پلٹ کر آؤ کبھی" غالباً اسی دور کی خاموش شاعری ہے۔ خاموش اس لیے کہ اس کے کالج کے ایک پروفیسر سے جب ملاقات ہوئی تو انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ شبیر حسین، شہری بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ کالج کے دور میں تقاریری مقابلوں میں ضرور حصہ لیتا رہا ہے جس میں کئی انعامات کے علاوہ پنجاب لیول پر دو سلور میڈل بھی حاصل کر چکا ہے۔

شہری آج کل عسکری مصروفیات کے علاوہ کئی کتابوں پر کام کر رہا ہے۔ جن میں "صلو علیہ و آلہ" نثر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں صرف لفاظی ہے۔ "پاک فوج کو سلام" یہ بھی واقعہ یا کہانی کے بغیر لفاظی سے کام لیا گیا ہے۔ "زخم بولتے ہیں" جلد آنے والا شعری مجموعہ ہے اور "قطرہ قطرہ قلزم" ان کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات ہیں۔ ○○○

غزلیں

طویل چادر غموں کی شب کی ہٹے گی آخر اداس کیوں ہو
اٹھی ہے گردن یہاں جو شر کی کٹے گی آخر اداس کیوں ہو
بجا کہ کچھ پل ہلال سچ کا چھپا ہے لیکن یقین رکھو
فریب کی یہ سیاہ بدلی چھٹے گی آخر اداس کیوں ہو !
کیا ہے برباد شہر جس نے سکون وہ بھی نہ پا سکے گا
اسی کی بستی ، حسین دنیا لٹے گی آخر اداس کیوں ہو
دراز ٹھہری یہ رات لیکن کبھی تو ہو گی تمام یارو
چمکتی ، روشن ، سہانی پو بھی پھٹے گی آخر اداس کیوں ہو
نہیں یہ پرواہ صدائے حق کو دباتے آئے ہیں شہر والے
مہکتی خوشبو لہو سے شہری اٹھے گی آخر اداس کیوں ہو

خود کو یہ سمجھا رکھا ہے — تم بن شہر میں کیا رکھا ہے
اتنا خوف ہے تنہائی کا — غم کو یار بنا رکھا ہے
نام ترا لے لے کے جگ نے — مجھ کو خوب ستا رکھا ہے
تیری آنکھ سے پیارے ساقی — جام پہ جام چڑھا رکھا ہے
ہم ہی جانیں درد کی شدت — غم سے ہاتھ ملا رکھا ہے
ہر جا حسن ترے کی باتیں — جگ نے شور مچا رکھا ہے

جھوٹ کے کچھ پردوں نے شہری
سچ کا حسن چھپا رکھا ہے

حوالدار محمد افضل (باقی صدیقی)

محمد افضل نام لیکن باقی صدیقی کے ادبی حوالے سے مشہور ہوئے۔ آپ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو قصبہ سہام ضلع راولپنڈی کے ایک قریشی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے آپ کو میٹرک تک تعلیم دلوائی اور آپ نے مدرس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران آپ نے جے وی کا امتحان پاس کیا۔ ۵ سال تک ضلع راولپنڈی کے دیہاتی سکولوں میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان دنوں بمبئی، فلم انڈسٹری کا گڑھ تھا۔ آپ بھی قسمت آزمائی کے لیے ۳ سال تک بمبئی میں رہے۔ لیکن مایوس ہو کر دوسری جنگِ عظیم کے آغاز پر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ بڑے خلوص اور لگن سے یہ ملازمت کر رہے تھے۔ اور اب تو پاکستان بھی معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ چونکہ اب اپنا وطن تھا شوق اور محبت بڑھ گئی کہ اچانک ۱۹۴۹ء میں آپ کی والدہ محترمہ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئیں۔ لہذا آپ نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور ایم ای ایس میں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران ۱۹۵۰ء میں ہفت روزہ "راہ و منزل" سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ ریڈیو پاکستان پشاور سے بھی منسلک ہو گئے۔ جس کے ساتھ ادبی سفر بھی جاری رہا۔ بلکہ اسے مزید فروغ ملا۔ کچھ عرصہ آپ آرڈننس ڈپو میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ بالآخر ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے ان دنوں آپ راولپنڈی میں مقیم تھے۔

جناب باقی صدیقی اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ آپ کے چھ مجموعہ ہائے کلام اردو اور ایک مجموعہ پنجابی میں شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں جام جم، دار و رسن، زخم بہار، بادِ سفر، شاخِ تنہا اور زادِ سفر ہیں۔ پنجابی میں ایک مجموعہ "کچے گھڑے" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آپ کا اعجاز یہ ہے کہ آپ نے نکتہ وری بھی کی ہے اور محدود بحروں کے باوصف ایک شعری کردار بھی نمایاں کر دکھایا ہے۔ ○○○

غزلیں

سوزِ دل زخمِ جگر لے آئے
حادثے سازِ سفر لے آئے

دستِ گلچیں ہے کہ شاخِ گل ہے
جب اٹھے اک گلِ تر لے آئے

ننگِ ہستی ہے سکوتِ ساحل
کوئی طوفاں کو ادھر لے آئے

اپنی حالت نہیں دیکھی جاتی
ہم کو حالات کدھر لے آئے

تجھ سے مل کر بھی نہ تجھ کو پایا
غم باندازِ دگر لے آئے

زندگی اس کی ہے جو دنیا کو
زندگی دے کے نظر لے آئے

دامنِ لالہ و گل سے باقیؔ
مل سکے جتنے شرر لے آئے

چلے ہیں ایک زمانے کے بعد دیوانے
عجب نہیں تیرا در بھی نہ ان کو پہچانے

ادا شناس نگاہیں بھی کھا گئیں دھوکا
یہ کس لباس میں نکلے ہیں تیرے دیوانے

کسی امید پہ پھر بھی نظر بھٹکتی ہے
اگرچہ چھان چکے ہیں دلوں کے ویرانے

کہیں نہ روشنی پاؤ گے میرے دل کے سوا
کہاں چلے ہو اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے

تری نگاہ نے رستہ بدل دیا ورنہ
چلے تھے ہم بھی غمِ زندگی کو اپنانے

بہارِ انجمنِ شب میں اب وہ بات کہاں
ہزار شمع جلے، لاکھ آئیں پروانے

ہر ایک بات زباں پر نہ آ سکی باقیؔ
کہیں کہیں سے سنائے ہیں ہم نے افسانے

حوالدار غلام حسن (کسریٰ منہاس)

فوج میں کئی شعبے ہیں۔ ہر شعبہ کا کام اپنی نوعیت کا ہے۔ جس طرح کسی فعلیت کی مختلف حرکات میں تواتر اور توازن قائم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آرام اور کام میں بھی تواتر اور توازن قائم رکھنا چاہیے۔ دراصل کام سے جو تھکان سی ہو جاتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے آرام کی ضرورت ہے۔ لیکن کچھ اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو آرام کے اوقات کو اپنی دوسری مصروفیات میں صرف کر دیتے ہیں۔ جناب کسریٰ منہاس بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ جنہوں نے عسکری کام سے تھکان کو دور کرنے کے لیے شاعری کو اپنالیا۔ اور پھر تادمِ مرگ ادبی مشاغل کو جاری رکھا۔

غلام حسن کسریٰ منہاس ولد عبدالعلی معروف بہ برخوردار منہاس موضع سید ضلع راولپنڈی میں ۱۰ جنوری ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں خالصہ نیشنل ہائی سکول سید جسے ۱۹۴۸ء میں کاظمیہ ہائی سکول کا نام دیا گیا، سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگِ عظیم دوم نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو آپ بھی سپلائی کور میں بحیثیت سپاہی کلرک بھرتی ہوگئے۔ جنگ کا زیادہ تر عرصہ یعنی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک آسام میں گزرا۔

جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو آپ پاکستان آرمی سپلائی کور میں خدمات سرانجام دینے لگے۔ اور جب اے ایس سی (آرمی سروس کور جرنل) مجلّہ جاری کیا گیا تو آپ اس میں باقاعدگی سے لکھنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کو اس مجلے کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنادیا گیا۔ آپ نے اس کو خوب نکھارا اور اسے ادبی بنادیا اور پھر آرمی سروس کور جرنل سے تبدیل کرکے اس کا نام رسد و رسائل رکھ دیا۔ جو آج تک چل رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں آپ نے فوج سے پنشن لے لی اور اسلامیہ کالج لاہور سے منسلک ہوگئے۔ جہاں ۱۹۷۱ء تک آپ نے کام کیا۔ ۱۹۷۱ء میں مرحوم محمد طفیل ایڈیٹر نقوش آپ کو ادارہ نقوش میں لے آئے۔ جس کے ساتھ وفات تک یعنی ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ء تک منسلک رہے۔ آپ نے نقوش کو ایڈیٹر کے ساتھ مل کر ایسا سنوارا اور ایک ایسا ادبی رسالہ بنادیا جس کی برابری شاید مدتوں تک اور کوئی میگزین نہ کرسکے۔ "رسولؐ نمبر" نقوش کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

جناب کسریٰ منہاس کی شہرت بحیثیت شاعر، ادیب، محقق، مقالہ نگار اور تبصرہ نگار ہے۔ آپ کی بہت سی تحریریں مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ آپ کا کلام ابھی تک غیر مدون ہے۔ لیکن آپ کے فرزند جناب مسعودالحسن اور دوست سید جمیل احمد رضوی آپ کے کلام کو اکٹھا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب فرمائے۔ آمین ○○○

غزلیں

سراغ ملتا نہیں کہیں بھی تلاشِ منزل میں جا رہا ہوں
بھٹک بھٹک کر کہاں کہاں سے پھر اپنے مرکز پر آ رہا ہوں
جسے کبھی آزما چکا تھا اسی کو پھر آزما چکا ہوں
رموزِ حسنِ وفا کے پردے گرا رہا ہوں اٹھا رہا ہوں
رہِ نشیب و فرازِ ہستی کا ذرہ ذرہ نگاہ میں ہے
یہ راہیں میری ہیں دیکھی بھالی وہیں سے اس وقت آ رہا ہوں
ہے میرے پیشِ نگاہ ہر دم سرابِ آئینۂ تصور
لگی ہوئی ہے جو مدتوں سے وہ پیاس اپنی بجھا رہا ہوں
سمجھ سے اہلِ جہاں کی باہر ہے منتہائے مقامِ الفت
خبر کسی کو ہے خاک اس کی میں کھو رہا ہوں کہ پا رہا ہوں
دل ایسا ضبط و سکوں کی لذت سے آشنا ہو گیا ہے کسریٰ
کسک بھی غم کی فزوں ہے لیکن میں پھر بھی تسکین پا رہا ہوں

پہلے باتیں ہوئی نگاہوں سے   مل گئے دل پھر ان ہی راہوں سے
روشنی دے رہا ہے دل میرا   اب ہٹا دو چراغ راہوں سے
یاد میں ان کی دل تڑپتا ہے   دوست جو چھپ گئے نگاہوں سے
اب تو تاریکیاں جھلکتی ہیں   نور افروز جلوہ گاہوں سے
وقت مجرم سمجھ رہا ہے جنہیں   نظر آتے ہیں بے گناہوں سے
تیرے وحشی بڑے وقار کے ساتھ   بات کرتے ہیں کج کلاہوں سے
بات نازک تھی لب تک آ نہ سکی   تھا جو کہنا، کہا نگاہوں سے
میرے فن کا کمال تو دیکھو   داد لیتا ہے داد خواہوں سے

دوستی ہے کہ دشمنی کسریٰ
نہیں کھلتا کچھ ان نگاہوں سے

حوالدار محمد ایوب صابر

ایوب صابر نام کی دو شخصیتیں اردو ادب میں سرگرم عمل ہیں۔ ایک ایبٹ آباد سے متعلق ہیں اور دوسری شخصیت جو میرے قلم کی زد میں ہے، کا تعلق کوہاٹ سے ہے۔ آپ ۲۴ فروری ۱۹۲۴ء کو کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حافظ محمد یوسف بھی ایک باذوق آدمی تھے۔ آپ غالباً آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے جب آپ کی پہلی غزل "تعمیر" راولپنڈی میں چھپی۔ اتنی کم عمری میں کسی رسالے میں غزل کے چھپ جانے سے اس بچے کی کیا کیفیت ہوگی۔ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جس سے آپ کو بے پناہ حوصلہ ملا۔ ۱۹۴۱ء میں آپ نے کوہاٹ سے میٹرک کیا۔ ان دنوں دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ آپ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ایک دفعہ کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تقریر سنی تو فوج کو خیرباد کہہ دیا اور اسی سے متاثر ہو کر میدان عمل میں کود پڑے۔ لیکن ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرنے لگ گئے۔ آپ کا گاؤں خدائی خدمت گاروں کا گڑھ تھا۔ مگر آپ مسلم لیگ کا پرچم لے کر نکلے اور مسلم لیگ کے لئے ترانے لکھے۔ مسلم لیگ کے ایک جلسے میں تقریر کرنے کی پاداش میں ڈاکٹر خان کے حکم سے سول سپلائی کی ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔

جناب ایوب صابر نے اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں نثر بھی لکھی اور شعر بھی کہے۔ شاعری میں آپ نے غزل، نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ، قطعہ، نعت، سلام اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی۔ آپ کا پہلا مجموعہ کلام پشتو زبان میں ۱۹۷۳ء میں "جگر خون" کے نام سے چھپا۔ جسے اباسین آرٹ کونسل پشاور اور پاکستان رائٹرز گلڈ سے پہلا انعام ملا اور پھر اسے پشاور یونیورسٹی نے ایم اے پشتو کے نصاب میں شامل کر دیا۔

نثر میں آپ نے طنز و مزاح، کالم، مضامین، افسانے اور انشائیے لکھے۔ طنز و مزاح پر آپ کی تصنیف "اس تمام میں" بہت مقبول ہوئی۔

ایوب صابر کوہاٹ میں ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے۔ آپ کے دم سے اس شہر کی رونقیں تھیں۔ بے لوث خدمت ادب کے قائل تھے۔ کئی ادبی انجمنوں کے بانی اور عہدیدار تھے۔ آپ ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ آپ نے ہفت روزہ "ہمدم" کی ادارت کی اور ہفت روزہ "نقیب" کے قلمی معاون رہے۔ ان کے علاوہ ملک کے کئی اخبارات سے متعلق رہے۔ سرحد کے اخبارات میں فکاہیہ کالم بھی لکھے اور رپوتاژیں بھی۔ دونوں زبانوں میں آپ کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں آپ کے خلوص کی شیریں اور تحریر کی چاشنی صاف محسوس کی جاتی ہے۔ ○○○

غزل

پیڑ ننگے ہیں کسی شاخ پہ پتا ہی نہیں
ابر اس وادیٔ غم پر کبھی برسا ہی نہیں

سوچتا ہوں کہ میں ہنگامۂ غم کس کو کہوں
اپنے ماحول میں ایسا کوئی ملتا ہی نہیں

مرے کانوں سے ہی ٹکراتی ہے آواز اپنی
تیری باتوں کو کوئی اور سمجھتا ہی نہیں

شہر سنسان ہے تاریک ہے خوابیدہ ہے
مجھ سے بیدار سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں

مجھ کو لوگوں کے اس انبوہ سے کیا لینا ہے
دل پہ جو نقش ہے وہ ناک وہ نقشہ ہی نہیں

جانے یہ کون ہے میں دیکھ رہا ہوں جس کو
عکس آئینے میں اپنا نظر آتا ہی نہیں

ہائے کس شہرِ خموشاں میں پڑا ہوں صابرؔ
جس میں کچھ جان ہو ایسا کوئی چہرہ ہی نہیں

غزل

متاعِ فکر و نظر رہا ہوں
مثالِ خوشبو بکھر رہا ہوں

میں زندگانی کے معرکے میں
ہمیشہ زیر و زبر رہا ہوں

شفق ہوں، سورج ہوں، روشنی ہوں
صلیبِ غم پر ابھر رہا ہوں

سجاؤ رستے بچھاؤ کانٹے
کہ پا برہنہ گزر رہا ہوں

نہ زندگی ہے نہ موت ہے یہ
نہ جی رہا ہوں نہ مر رہا ہوں

جو میرے اندر چھپا ہوا ہے
اس آدمی سے بھی ڈر رہا ہوں

وہ میرے اپنے ہی غم تھے صابرؔ
کہ جن سے میں بے خبر رہا ہوں

حوالدار محمد بیاض (بیاضؔ سونی پتی)

پنجاب (بھارت) کے ضلع روہتک میں سونی پت شہر ایک تحصیل کا درجہ رکھتا ہے۔ جہاں سے بڑے بڑے نامور رائٹرز نکلے ہیں۔ اس تحصیل کے ایک گاؤں اکبر پور بارونہ میں ۱۲ فروری ۱۹۲۹ء کو جناب محمد بیاض پیدا ہوئے اور جب شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنے اندر ایک شاعر کو موجود پایا اور جب شعر و ادب سے ناطہ جوڑا تو سونی پت کی نسبت سے بیاض سونی پتی کہلوائے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں پائی۔ آٹھویں کا امتحان سونی پت ایم بی مڈل سکول سے پاس کیا۔ اور پھر سر چھوٹو رام زمیندار ہائی سکول میں داخل ہوئے لیکن تعلیم نامکمل چھوڑ دی۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور مظفر گڑھ میں آباد ہوئے۔ یہیں ۱۹۴۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور فوراً بعد ہی حوالدار کلرک کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ انہی دنوں جہادِ کشمیر میں حصہ لیا۔ فائر بندی کے بعد یہاں جی نہ لگا تو فوج کو خیرباد کہہ دیا۔ تب تک آپ کے والد محمد فیاض کا تبادلہ کوٹ ادو ہو چکا تھا۔ لہٰذا پورا خاندان یہاں آ کر آباد ہو گیا۔ یہیں آپ نے پٹوار کا امتحان پاس کیا اور پٹواری بن گئے۔ مگر آزاد طبیعت ملازمتوں کی پابندیوں کے تابع نہ رہ سکی اور آپ اسٹامپ فروش بن گئے۔ ۱۹۶۱ء میں عرائض نویسی کا لائسنس لے کر اسے ہی ذریعہ معاش بنالیا۔

شاعری کا شوق آپ کو فوجی ملازمت کے دوران پیدا ہوا تھا۔ جو بعد میں مزید بڑھ گیا۔ جسے آپ بڑے چاہ اور محبت سے نباہ رہے ہیں۔

جناب بیاض سونی پتی کا رنگ تغزل دردمندی اور لطافتِ احساس سے عبارت ہے۔ آپ خوش سلیقہ اور تاثیر افروز غزل گو ہیں۔ آپ کی شاعری میں محبت اور درد دونوں پہلو جھلکتے ہیں۔ ابتدائی دور کے تجربات آج بھی آپ کے معاون و مدد ہیں۔ OOO

غزل

میرے آنسو تیرا دامن اور اجیالی رات
تجھ کو بھی یاد آتی ہوگی وہ متوالی رات

سوچ کے لالہ زاروں میں ہے یہ کیسا اندھیر
ناچ رہی ہے پتہ پتہ ڈالی ڈالی رات

آؤ بھولی بسری یادو تم ہی دل بہلاؤ
کیسے گزرے گی آخر یہ لمبی کالی رات

کون یہ جانے کس دیوی کی پوجا کرنے آئی
ہاتھ پہ رکھے جگ مگ کرتے چاند کی تھالی رات

تنہائی کا مست سپیرا بین بجاتا جائے
ناگن سی لہراتی جائے ظالم کالی رات

تم بھی بیاضؔ آج اپنے من کی کہہ لو کوئی بات
لوٹ کے پھر آئے کہ نہ آئے یہ اجیالی رات

فردیات

ذرا جام دینا کہ ترتیب دے لوں
پریشاں ہیں پھر میرے افکار ساقی

سماعت کی تکلیف فرمائیے گا
نگاہیں بھی کہتی ہیں اشعار ساقی

دیتی ہے سکوں روح کو کانوں کی چبھن بھی
خوشبو سے کبھی ہوتی ہے سینے کی جلن بھی

احساس کے انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
آنچل بھی اسی تار سے بنتا ہے کفن بھی

یہ طے ہوا ہے روشنیوں کے خداؤں میں
زنجیر تیرگی رہے کرنوں کے پاؤں میں

اس دور میں حیاتِ برہنہ نہیں رہی
ملبوس ہے غموں کی سنہری قباؤں میں

دل ہے یوں خوفزدہ مثلِ غزالِ صحرا
اپنے سائے کو بھی دیکھے ہے تو ڈر جائے ہے

کوئی جھونکا جو برابر سے گزرتا ہے بیاضؔ
دل کسی شاخ کی مانند لرز جائے ہے

اب چمکتی بجلیاں جانیں بیاضؔ
ہم تو تکمیلِ نشیمن کر چلے

فرازِ وقت کے زینہ سے تو اتر کے بھی دیکھ
دلوں کی رہگزر سے کبھی اتر کے بھی دیکھ

حوالدار امان اللہ خان (انجمل جنڈیالوی)

شیخوپورہ سے ۹ میل شمال کی طرف ایک موضع جنڈیالہ شیر خان ہے۔ یہاں ایک صوفی شاعر سید وارث شاہ چشتی کا مقبرہ ہے۔ وہی وارث شاہ جنہوں نے رانجھے کی ہیر کو اپنے نام کر کے امر کر دیا۔ میرا مطلب ہے ہیر وارث شاہ۔ اسی جنڈیالہ گاؤں میں یوسف زئی قبیلہ کے افغانی بھی رہتے ہیں جو احمد شاہ ابدالی کے دور میں یہاں آباد ہوئے تھے۔ اسی قبیلے میں جناب امان اللہ خان ۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی پنجابی زبان کے شیکسپیئر سید وارث شاہ کی ہیر کو اتنا پڑھا کہ اپنے اندر بھی ایک شاعر کا شک ہونے لگا اور پھر انہی کو روحانی استاد تسلیم کر لیا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی جانے اور کچھ عرصہ کے لیے رہنے کا اتفاق ہوا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ یہاں نثر لکھنے کے شوق کو بالیدگی ملی وہاں تعلیم کا شکستہ سلسلہ پھر سے جوڑ لیا اور یوں درجہ بدرجہ مدارج طے کرتے ہوئے امان اللہ خان ایم اے ہو گئے۔ ۲۰ سالہ ملازمت کے بعد جب آپ نے ریٹائرمنٹ لی تو پروفیسر حفیظ تائب کو استادِ سخن مانا۔ جنہوں نے اس خاک کو سونا کر دیا۔ اب آپ نے اپنی ذات اور شاعری کو نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈھال لیا۔ ریڈیو پاکستان سے آپ نعت گو شاعر ہی کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ابتداء میں غزل، حمد، نعت، نظم، منقبت اور نثر لکھتے تھے۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ صرف اور صرف نعت ہی آپ کا موضوع رہ گیا ہے اور یہ کتنی خوش بختی ہے کہ ایک شاعر سب اصناف کو ترک کر کے صرف اپنے آقائے نامدار، محبوبِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا رہے اور آپ ہی کے ذکر سے دل و دماغ کو روشن اور شاد کرتا رہے۔

جناب امان اللہ خان انجمل جنڈیالوی ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی رابطہ قائم ہے۔ دو نعتیہ مجموعے "کشکولِ ادراک" اور "پیکر بے سایہ" ان کے قلم اور ذہن کا معجزہ ہیں۔

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

اے رسولِ خدا اک گدا آپؐ کا منتظر ہے کھڑا کب سے دیدار کا
الفتِ مصطفیٰؐ مدعا ہے مرا اک یہی تو اثاثہ ہے نادار کا
گر سیہ کار ہوں میں گنہگار ہوں، فخر ہے آپؐ کا میں طلبگار ہوں
گرچہ کردار اچھا نہیں ہے میرا نام لیوا مگر ہوں میں سرکارؐ کا
میری وابستگی آپؐ کی ذات سے جھولیاں آپؐ بھرتے ہیں خیرات سے
سب تہی دامنوں کو ملے اس قدر یہ شرف ہے محمدؐ کے دربار کا
دھڑکنیں دل کی اب برق رفتار ہیں قربتیں آپؐ کی مجھ کو درکار ہیں
آپؐ کی دید کا کچھ قرینہ ملے اب سوال اک یہی ہے گنہگار کا
مصطفیٰؐ مصطفیٰؐ ورد کرتا رہوں اپنے دامن کو یونہی میں بھرتا رہوں
مرتے دم تک یہی کام کرتا رہوں ہو کرم مجھ پہ یوں شاہِؐ ابرار کا
ظلمتوں کے لئے ماہِ عرفان ہیں رفعتِ لم یزل کے خیابان ہیں
ہم غلاموں کے کعبۂ ایمان ہیں یہ حسیں تر وسیلہ ہے سرکارؐ کا
تند طوفان سے بادباں پھٹ گئے، یا محمدؐ پکارا تو سب ہٹ گئے
جس کے ماویٰ و ملجا حضورؐ آپؐ ہوں ڈر نہیں اس کی کشتی کو منجدھار کا
تیرگی میں بھی شمس و قمر آپؐ ہیں میں تو کہتا ہوں نورِ بصر آپؐ ہیں
نور ہی نور ہیں مقتدر آپؐ ہیں نام شافی ہے امت کے غم خوار کا
آپؐ ہیں بادشاہوں کے بھی بادشاہ تنگ راہوں میں بھی آپؐ ہیں پیشوا
بے نواؤں کے بس آپؐ ہی ہیں نوا، مانگتا ہوں سلیقہ میں گفتار کا
فرقتوں کا دفینہ ہے سینہ مرا، ہو کرم مجھ پہ شاہِؐ مدینہ ترا
ظلمتِ بحر میں ہے سفینہ مرا، ہے سہارا توؐ ہی میرے پتوار کا
رہبرِؐ انبیاء اکملؐ و باصفاؐ کوئی ثانی ہوا ہے نہ ہے آپؐ کا
انجمِ پُرخطا کو ملے اب شفا، رکھ ہی لیجے بھرم اپنے بیمار کا

حوالدار عبدالستار خان (حسرت نیازی)

تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ایک نام تاریخ ہمیشہ دہراتی رہے گی اور وہ نام ہے مولانا عبدالستار خان نیازی۔ انہی کا ہم نام ایک اور شخص شاعری کے صفحات پر آیا۔ جس نے اپنی پہچان کے لیے اپنے نام کے ساتھ حسرت کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو مولانا سے الگ کر لیا بلکہ عبدالستار نیازی (فیصل آباد) سے بھی مطابقت نہ رہنے دی۔ ایک مدت گزر گئی۔ آج سے تقریباً بیس سال پیشتر ملتان میں اس شخصیت سے میری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت یہ ماہنامہ "پاسبان" کے شعری صفحات کی زینت تھے۔

جناب عبدالستار خان حسرت نیازی ولد سردار خان نیازی ۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو داؤد خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ بی اے تعلیم ہے۔ بہر حال تعلیم سے فارغ ہوئے تو آرمی کلریکل کور میں ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو بھرتی ہو گئے۔ آپ خوش قسمت انسان ہیں اور وہ یوں کہ ۱۹۸۹ء میں براستہ ایران، ترکی، شام اور اردن حج کا فریضہ ادا کیا۔ ۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ میں حصہ لیا اور ۱۹۹۳ء میں کمبوڈیا میں عسکری ذمہ داریاں ادا کیں۔

آپ ایک مدت سے لکھ رہے ہیں۔ ابتدا "پاسبان" سے ہوئی۔ پھر "آداب عرض" اور "سلام عرض" جیسے عام رسالوں میں لکھا اور پھر خاص ادبی جرائد میں بھی کوشش جاری رکھی۔

حسرت کی شاعری جوان دلوں کی امنگوں، آرزوؤں اور جذبوں کی شاعری ہے۔ رسمِ الفت اور وفا کے فقدان میں محبوب سے گلے شکوے ہوتے ہیں تو اپنی حالت زار سے آگاہ کرتے ہیں۔ کبھی دکھوں کا بیان ہے تو کبھی محبت کی روداد، کبھی جدائی اور فرقت کے قصے ہیں تو کبھی ملاقات اور وصل کی باتیں۔ کبھی حسن و عشق کے قصیدے ہیں تو کبھی جفاؤں اور اپنے زخموں کی ٹیسوں کے احوال۔ الغرض حسرت نے شاعری کو روایات کی ڈگر سے ہٹنے نہیں دیا ہاں البتہ گل و بلبل اور خار کی تشبیہات سے اجتناب برتا ہے۔ آپ بھی ساغر و جام لی جائے نظروں سے پینے کے قائل ہیں اور دعاؤں کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں۔ خواہ جو بھی حال ہو۔ ںںں

غزلیں

مجھ کو نہیں معلوم کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہاں اتنی خبر ہے کہ بلندی سے گرا ہوں
اے میری تمنا کا گلا گھونٹنے والے
میں تیرے لئے سارے زمانے سے خفا ہوں
مجھ کو نظرانداز نہ کر یاد ہے مجھ کو
میں ایک زمانہ ترے نزدیک رہا ہوں
ہیں میری نگاہوں میں صداقت کے عزائم
اس واسطے میں اپنے رفیقوں سے جدا ہوں
آنکھوں پہ لگا دیتا ہے پہرے یہ زمانہ
تنہائی میں تجھ کو میں اگر دیکھنا چاہوں

حسرتؔ غمِ دوراں میری قسمت میں رقم ہے
معلوم نہیں کون سی مٹی سے بنا ہوں

کبھی غم ہم نے اپنے کم نہ پائے
مقابل میرے جب تک وہ نہ آئے
قسم ہے رسمِ الفت کا نبھانا
ارادے حشر تک بے دم نہ پائے
لئے حسرت چلے ہیں سوئے منزل
ارادہ ہے یہ حسرت خم نہ پائے
جلائے جو دیئے خونِ جگر سے
دیئے وہ حشر تک مدھم نہ پائے
نہ رکھ امید غیروں سے وفا کی
ترے زخموں کا یہ مرہم نہ پائے
زمانہ ہوگیا یادیں بھلائے
کہاں سے کوئی یادیں ڈھونڈ لائے
نظر آئے جہاں بھی چشم اٹھی
جہاں میں تیرے چرچے کم نہ پائے
نہ بدلے ہم نہ بدلیں گی نگاہیں
کوئی یہ کاش ان کو بھی بتائے

شکایت ہے فقط ان سے یہ حسرتؔ
کہ جس پر ناز ہو وہ بھول جائے

سارجنٹ صابر ملک

"تصویرِ وطن" ۰۰۰ یہ صابر ملک کا شعری مجموعہ ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں وطن کے نغمے اور ملی ترانے ہوں گے ۰۰۰ جی ہاں ہے بھی یہی کچھ ۰۰۰ پوری کتاب پڑھ لیجئے۔ آپ شاعر کو حبُ الوطنی کے جذبے سے سرشار پائیں گے۔ صرف فلیپ پر ایک غزل ہے۔ لیکن وہ بھی محور سے ہٹنے نہیں پائی۔

ہم مصور ہیں دیس کے صابرؔ
گاؤں گاؤں سے دوستی اپنی

صابر ملک کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۲۶ء اور آپ کا آبائی وطن خوشاب ہے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایئرفورس میں ایئرمین کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔

شاعری کا سلسلہ لڑکپن سے شروع ہوا اور ابھی تک قرطاس پر منظوم خیالات سے تصویریں بنا رہے ہیں۔ جہاں تک آپ سے ہو سکا آپ نے عملاً وطن کے لیے بڑا کام کیا۔ تحریکِ پاکستان میں، پھر انہی جذبات کے تحت ایئرفورس جوائن کر کے اور پھر جب واپس آئے تو قلم کو ہاتھ میں لے کر نئی جنگ لڑنے لگے۔ جو ایئرفورس میں جانے سے کچھ عرصہ کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ آپ پہلے بھی ہر لمحہ تیار رہتے تھے اور اب بھی ہر لمحہ، ہر گام، ہر ثانیہ تیار ہیں۔

بقول جاوید سوزؔ "صابر ملک ایک شعلہ بیان شاعر ہے۔ جس کے سینے کے اندر حساس دل میں ملت کا درد پنہاں ہے۔ آپ کا قلم تیغِ براں کی طرح تیز ہے۔ جس کے سامنے طاغوتی طاقتیں دم توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صابر ملک کی رزمیہ نظموں کا مجموعہ حب الوطنی اور عزم و شجاعت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ صابر ملک کو اپنے وطن کی ہر چیز میں ایک انوکھا روپ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے جھومتے درخت، اس کے لہلہاتے کھیت، اس کے سرسبز و شاداب اور مہکتے باغات، اس کی جھیلوں کے نیلے نیلے ساغر، اس کے میٹھے میٹھے چشمے اور ان کی گنگناہٹ، اس کی نشیلی اور طراوت بھری فضاؤں کے میکدے ۰۰۰ آپ کے دل میں پرستش کا جذبہ ابھارتی ہے" ○○○

خدا

نجات غم سے دلانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
وہ بات بگڑی بنانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
بساطِ ارضی کی جلوتوں میں جہانِ بالا کی خلوتوں میں
وہ ہاتھ مشکل سے آنے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
نظر کی منزل سے دور رہ کر قریبِ قلبِ بشر سے ہر دم
نفس نفس میں سمانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
نظر نظر سے گرے ہوؤں کو مصیبتوں میں گھرے ہوؤں کو
قدم قدم پہ بچانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے
جہاں کی شاداب انجمن میں بدل کے صابرؔ قبائے نوری
وہ اپنے جلوے دکھانے والا یہیں کہیں ہے یہیں کہیں ہے

شہید

شکست کھا نہ سکا تیرا عزمِ فولادی — تجھی سے دہر میں روشن ہے شمع آزادی
ترا نشانِ قدم روحِ کاروانِ حیات — خدا نے تجھ کو عطا کی یہ شانِ فریادی
بقائے ملک کی خاطر تری شجاعت نے — ہر اک محاذ پہ توڑا طلسمِ الحادی
شکوہِ ملتِ بیضا کا ہے بھرم تجھ سے — کہ تیری ذات ہے ایماں کی خشتِ بنیادی
ترے فراق سے حوروں کی انجمن تھی اداس — ترے وصال سے نکھری ہے خلد کی وادی

ترے مزار پہ اے جاں نثارِ قوم و وطن
چڑھا رہی ہے عقیدت کے پھول شہزادی

سارجنٹ جاوید فتح محمد (ڈاکٹر جاوید سوز)

خاندانی نام فتح محمد اور قلمی نام ڈاکٹر جاوید سوز ہے۔ جاوید فتح محمد آپ کا ڈاکومنٹری نام بن چکا ہے۔ فتح محمد سے جاوید فتح محمد کے سفر کی داستان کچھ ایسے ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے آپ فوج میں جمعدار تھے۔ کسی بات پر سینئرز سے اختلاف پیدا ہو گیا تو اپنے والد جناب کرم الٰہی کھوکھر جو کہ آرمی کنٹریکٹر تھے، کے میل ملاپ سے میڈیکل بورڈ کروا کر گھر آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ایئر فورس جوائن کی تو جاوید فتح محمد کے نام سے بھرتی ہوئے۔ سوز آپ پہلے بھی تھے پھر بھی رہے لیکن پہلے ف م سوز تھے پھر جاوید سوز ہو گئے۔ کچھ عرصہ پابندی کی زد میں آئے تو ابن کرم بن بیٹھے۔ بہر حال مختلف حوالوں سے لکھا۔ جناب فتح محمد ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ دو عسکری ملازمتوں کے درمیانی وقفے میں زمیندار کالج گجرات سے ایف اے کیا۔ دوران ملازمت کچھ عرصہ کراچی میں قیام رہا تو وہاں پہلے بی اے اور پھر ایم اے انگلش کیا۔ اس دوران آپ کو امریکہ، آسٹریلیا اور پھر چین جانے کا بھی موقع ملا۔ بیس سالہ خدمت کی ادائیگی کے بعد ۱۹۶۸ء میں آپ ریٹائر ہوئے تو ہومیو پیتھی کی ڈگری لے کر ڈاکٹر بن بیٹھے۔ اور چلتے چلتے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پنجابی بھی کر لیا۔ پھر مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں یونان، ترکی، جرمنی، فرانس، لبنان، شام، ڈنمارک، ناروے، ایران اور افغانستان کے سفر کئے اور کچھ کچھ عرصہ وہاں گزارا اور بالآخر اپنے وطن اور اپنے شہر لالہ موسیٰ میں آ کر ڈیرہ جمایا۔

کھاریاں سے اردو، پنجابی اور پشتو زبان میں ادبی سیریز "ذوق" جاری کیا اور اب لالہ موسیٰ سے نکلنے والے پرچے ماہنامہ "ادبی چہرہ" کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

آپ کی پنجابی تصنیف "ساڈا بابا جناح" کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے آدم جی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ آپ اردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ "ساڈا بابا جناح" آپ کی انگریزی تصنیف تھی لیکن دوستوں کے مشورے سے پنجابی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جاوید سوز کی دوسری کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ پھول چنتی رہی (رومانی ناول) ف م سوز کے نام سے۔ ۲۔ کارواں روانہ ہوا (ناول) ف م سوز کے نام سے۔ ۳۔ بت شکن (تاریخی ناول) ۴۔ نیلی نہیلیں (افسانے) ۵۔ لمحاتِ سوز (شعری مجموعہ) اردو میں ہیں ۶۔ آنے دوالے (شعری مجموعہ) ۷۔ ساڈا پاکستان (ملی شاعری) ۸۔ جنگ نامہ بھارت، پنجابی زبان میں ہیں۔

غزل

گردش میں گر جام رہے گا ساقی تیرا نام رہے گا
ہر سو تیرا چرچا ہوگا تیرا فیضِ عام رہے گا
تیرے نام کے نعرے ہوں گے تیرا نام دوام رہے گا
تیرا ہی پھر مُہکا ہوگا تیرا ہی ہنگام رہے گا
ہوگا خاص پراپیگنڈہ تیرا نام ہی نام رہے گا
سب کو مے کی چاہت ہوگی سب کو مے سے کام رہے گا
میخانہ گر بند کیا تو شور شرابا عام رہے گا
بے چینی بدامنی ہوگی ہنگامہ سا عام رہے گا
جو بھی در تک آ پہنچے گا وہ پھر کیوں ناکام رہے گا
جو لمحہ بے کیف رہے گا
وہ لمحہ بے نام رہے گا

غزل

ہم درویشوں کی جاگیر تیرے نامے اور تصویر
خط میں لکھی چوم رہا ہوں تیرے ہاتھوں کی تحریر
عشق ترے کے ہاتھوں ہو گئے سودائی ہم مست فقیر
پچھلے جگ میں ہم تھے شاید اک دوجے کے رانجھن ہیر
سن لے میرے پیار کی مُرلی میری لَے کی تو ہے اسیر
جبراً ڈولی نہ بیٹھے گی بہت سیانی آج کی ہیر
سوزؔ ہے آج کا وارث شاعر
شعروں میں کھینچے تصویر

١- ایئرفورس سے پہلے آرمی میں ملازمت کرنا آپ کی تاریخ پیدائش سے مطابقت نہیں رکھتا۔

پیٹی افسر شعیب ربانی (شاہین فصیح ربانی)

ضلع جہلم کا قصبہ دینہ جو منگلا اور آزاد کشمیر سے نزدیک ہونے کے باعث ایک مصروف کاروباری شہر کی شکل اختیار کر گیا ہے، اس کی مصروفیت کی ایک وجہ اور بھی ہے شیر شاہ سوری کا تعمیر کردہ قلعہ روہتاس یہاں سے نزدیک ہے اور قلعہ کو راستہ دینہ سے ہو کر جاتا ہے۔ جہاں ملکی اور غیر ملکی سیاح کافی تعداد میں قلعہ روہتاس دیکھنے کے لیے آتے جاتے رہتے ہیں۔

جناب شعیب ربانی اسی دینہ شہر کے رہنے والے ہیں۔ آپ ۱۹۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی مراحل طے کر کے پاکستان نیوی میں آ گئے۔ جہاں سمندر کی لہروں اور ساحلوں سے تعلقات نے آپ کے اندر مشاہداتی اور تجرباتی کیفیات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو باہمت اور نڈر بنا دیا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے اندر ایک کرب اور ایک درد اپنی جگہ موجود رہا۔ جس کی شدت اور گہرائی نے آپ کے اندر کے شاعر کو تخلیقی مسافت میں لا ڈالا اور یوں آپ کو سکون اور آسودگی ملی۔

آج سے کوئی بارہ سال پہلے شاہین فصیح ربانی کا نام "سوچ رُت" کی اشاعت پر میری نظروں سے گزرا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ پیارا نام بحیثیت شاعر کافی عرصے سے اوراق پر ثبت ہو رہا ہے۔ شاعریت اور عسکریت نے آپ کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ لیکن آپ نے اس تقسیم پر بھی خود کو بکھرنے نہیں دیا۔ بلکہ دونوں ہستیوں کو ایک وجود میں یوں پابند رکھا کہ تعصب کی ہوا تک نہ لگنے دی۔

جناب شاہین فصیح ربانی نے فکر میں بھی اجتماعیت کو اپنایا ہے اور جہاں اپنی ذات کی بات کی ہے۔ وہاں بھی ذات سے بڑھ کر بنی نوع انسان کی بات کا شائبہ ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری ایک پُردرد اور دردمند شخص کی شاعری ہے جو لوگوں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ مشاہدہ کرتا ہے گھنٹوں سوچتا ہے اور پھر اسے ذہن کے دریچوں سے ہوا کے جھونکوں کی طرح وصول کر کے زبان و قلم کے راستے باہر نکالتا ہے۔ اس سارے عمل میں آپ کے وسیع مطالعے کا بھی کافی دخل ہے۔ جو آپ کو لفظوں کے استعمال کا سلیقہ اور قرینہ سکھاتا ہے۔ ○○○

غزلیں

وقت ہے اور گزرتا جاتا ہے — فاصلہ ہے کہ بڑھتا جاتا ہے
اک تعلق کہ کرچیاں بن کر — میرے سینے میں چبھتا جاتا ہے
ایک آنسو کہ غم کی جِدت سے — اک شرارہ سا بنتا جاتا ہے
سیڑھیاں وقت نے لگا دی ہیں — پیار دل سے اترتا جاتا ہے
نہ بدلنے کا وعدہ کر کے بھی — وہ کہ مجھ سے بدلتا جاتا ہے
پا چکا ہے عروج کو اپنے — اب وہ سورج کہ ڈھلتا جاتا ہے
دو یہ آنکھیں کہ روتی رہتی ہیں — ایک دل ہے تڑپتا جاتا ہے
ایک خوشبو کہ وہ تو خوشبو ہے — پھول کا رنگ اڑتا جاتا ہے
یہ محبت، خلوص، چاہت کیا — اب تو پیسہ ہی دیکھا جاتا ہے

کوئی منزل فصیح منزل ہو
راستہ ہے کہ چلتا جاتا ہے

کونپل کونپل پھوٹے خواب — کتنے سچے جھوٹے خواب
نیندیں میری سچی تھیں — لیکن نکلے جھوٹے خواب
کرچیں دل کو چیر گئیں — کچھ اس طور سے ٹُوٹے خواب
وقت گواہی تو دے گا — اس نے میرے لُوٹے خواب
پھر دیکھا ہے اس کو آج — پھر آنکھوں میں پُھوٹے خواب
اس کی سچی تعبیریں — مجھ کو بس یہ جھوٹے خواب

کام فصیح آجائیں گے
رکھ لو ٹوٹے پھوٹے خواب

نائیک وقار انبالوی

کہتے ہیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کمان کے ہندوستانی سپاہیوں کی دلچسپی اور فلاح و بہبود کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اور کرنل مجید ملک کی نگرانی و معاونت سے تعلقاتِ عامہ کے ہندوستانی شعبے کے لئے بلند پایہ کے بعض نامور صحافی اور اہلِ قلم جمع کر لئے تھے۔ انہیں اہلِ قلم میں ایک نام مولانا وقار انبالوی کا آتا ہے۔

جناب وقار انبالوی چنار تھل (انبالہ) کے مقام پر ۲۳ جنوری ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی۔ جہاں آپ کے دادا پشاور جیل کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ پھر مڈل سکول ملانہ اور مسلم ہائی سکول انبالہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلی جنگ عظیم میں 1/90 پنجابی رجمنٹ میں نائیک بھرتی ہو گئے۔ آپ جنگ کے دوران ہی ایک شاعر اور افسانہ نویس کی حیثیت سے منظر عام پر آ چکے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں ایڈیٹروں کے وفد کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک کا دورہ کیا یہاں ایک چیز میری سمجھ سے بالاتر رہی کہ آپ بحیثیت نائیک بھرتی ہوئے تھے اتنا عرصہ فوج میں گزارنے کے بعد نائیک ہی کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔ بہر حال فوج سے فارغ ہونے کے بعد پہلے "زمیندار" کے عملۂ ادارت میں شامل ہوئے۔ پھر "احسان" کے چیف ایڈیٹر رہے اپنا اخبار "سفینہ" بھی جاری کیا۔ بعد میں روزنامہ "وفاق" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔۔ جن دنوں پاکستان اور اکھنڈ بھارت کے موضوع پر انتخابات ہوئے راجہ غضنفر علی اور دولتانہ صاحب نے پبلسٹی آپ کے حوالے کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے سجووال تحصیل فیروز والا ضلع شیخوپورہ میں رہائش پذیر ہوئے اور بالآخر اسی مقام پر تقریباً نوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

مولانا وقار انبالوی نے بڑی بے تکلف اور سادہ طبیعت پائی تھی۔ مزاج فقیرانہ تھا لیکن بے باک اور نڈر، پاکستان سے اور افواجِ پاکستان سے بے حد محبت تھی۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو بھی فوج میں سپاہی بھرتی کروایا تھا۔

آپ چونکہ وقائع نگار تھے لہٰذا شاعری میں بھی وقائع نگاری بڑے دلآویز انداز میں کرتے تھے۔ ابتدا میں شاکر تخلص کرتے تھے لیکن جب پیارے لال شاکر کا کلام پڑھا تو وقار کے نام سے لکھنے لگے۔ آپ نے وقائع نگاری کے علاوہ نعت میں اپنا ایک خاص رنگ و آہنگ دکھایا ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

خواب سے نیند کے ماتے جو جگائے تو نے ۔۔۔ پردے کتنے ہی نگاہوں سے ہٹائے تو نے
زیست بے مقصد و بے مایہ ہوئی جاتی ہے ۔۔۔ اس کے سر پر بھی کئی تاج سجائے تو نے
غمِ دنیا کے اندھیرے کو اجالے بخشے ۔۔۔ راستے منزلِ عقبیٰ کے دکھائے تو نے
آتشِ کفر کے شعلوں کی لپک تھی ہر سو ۔۔۔ لیکن اس آگ میں بھی پھول کھلائے تو نے
تجھ کو اپنوں نے پرایوں نے بہت رنج دیئے ۔۔۔ کر دیئے ایک مگر اپنے پرائے تو نے
بوریا تیرے ہی صدقے میں ہوا ہمسرِ عرش ۔۔۔ تاج اور تخت نگاہوں سے گرائے تو نے

تیری کملی ہے کہ دامانِ محبت ہے کوئی
مجھ سے خاطی اسی دامن میں [illegible] تو نے

اے کہ تیرے نور سے روشن ہوئی بزمِ حیات ۔۔۔ اے کہ تو ہے باعثِ ایجاد و خلقِ کائنات
فرش والوں کو دکھائی تو نے راہِ مستقیم ۔۔۔ عرش والوں سے ہوئی ہدیہ تجھے راہِ نجات
تجھ سے پہلے کس پیمبر کو میسر آسکی ۔۔۔ وہ حریفِ گردشِ ایام وہ اسریٰ کی رات
یہ سبق انسان کو کس نے پڑھایا تھا کبھی ۔۔۔ وحدت انسان کی بنیاد ہیں [illegible] و زکات
باعثِ تقویتِ ایمان تیرا ذکرِ خیر ۔۔۔ نقطۂ پرکارِ حق بے شک تری ہر ایک بات
خلوتِ دل جگمگاتی ہے حضوری میں تری ۔۔۔ معجزہ تیرا ہے یہ اے بندۂ مولیٰ صفات

تجھ سے جو غافل ہوا وہ دین و دنیا سے گیا
ہے فلاحِ دین و دنیا اے محمدؐ! تیرے ہات

نائیک مرتضیٰ علی خان (دردؔ اسعدی)

"ضیاء الحق قاسمی ایک ایسا نام ہے جو اردو کی مزاحیہ شاعری کے پردھانوں میں گنا جاتا ہے۔ لیکن جب میں نے اسے حیدر آباد میں دیکھا تو وہ شعر و سخن کی ابجد سے بھی ناآشنا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک شخص اس کے میڈیکل سٹور پر ملازم ہوا اور ضیاء الحق قاسمی کو شاعر بنا کر چلا گیا۔ وہ شخص تھا جناب دردؔ اسعدی۔"

یہ Comments ہیں کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "کامیابی" کے چیف ایڈیٹر جناب اقبال سہوانی کے۔ اقبال سہوانی ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں جب تھے تو ریڈیو سے کچھ کچھ ناطے کے حوالے سے میری اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور یہ الفاظ تب آپ نے راقم کو بتائے تھے۔
دردؔ اسعدی (اردو شعر و سخن کا ایک بڑا نام) کا اصل نام مرتضیٰ علی خان اور دردؔ تخلص ہے۔ لیکن اپنے استاد حضرت صدیق حسن خان اسعدؔ شاہ جہانپوری سے عقیدت کے باعث اسعدی لکھتے ہیں۔

آپ ۱۲ جون ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد جعفر علی خان سے حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے آپ نے میٹرک کیا۔ ۱۹۳۸ء میں اسی یونیورسٹی سے ادیب کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء تک سول ملازمت کی اور پھر فوج میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء تک عسکری خدمات انجام دیں اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد حیدر آباد (سندھ) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۶۲ء میں گورنمنٹ سروس اختیار کی۔ جناب درد اسعدی نے ۱۹۳۳ء میں شاعری شروع کی۔ تب آپ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اور پھر یہ شغل زندگی بھر جاری رہا۔ استاد کی یاد میں جب "بزم اسعد" قائم کی تو کئی ایک کتب شائع کیں اور بے شمار شاگرد بنائے جو تقریباً سب ہی اسعدی اپنے تخلص کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں "چراغِ رہگزر (غزلیات)، درد کی لہر (غزلیات)، ہمہ رنگ" (بیشتر اصنافِ سخن) "آیاتِ درد" (غزلیات) شامل ہیں۔ جبکہ آپ نے کئی ایک کتب مرتب بھی کیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

"الجہاد بالقلم، منظومات بیت المقدس، مہران سورج، علامہ اسعد شاہ جہانپوری کا فنِ شاعری، معراجِ خیال، مجموعۂ کلام راغب کونوی، آگہی، مجموعۂ کلام عطار صدیقی، ثنائے خواجۂ کونین، ۷۷ شعراء کا نعتیہ کلام اور حمد، ۱۴۰ شعراء کا کلام۔ درد کا تعلق شعراء کے اس قبیلے سے ہے جس میں آج بھی ادبی روایات کی پاسداری صحت زبان اور شعری لوازمات کو شعر گوئی کے لیے لازم اور خیال یا فکر پر فنِ شاعری کو قربان کرنا ادبی گناہ سمجھتے ہیں۔" ○○○

غزلیں

ذی ہوش کبھی ہوش میں رہ کر نہیں ملتا
انساں حدِ ادراک کے اندر نہیں ملتا

میں پاس ترے آؤں یہ ممکن ہی نہیں ہے
دریا سے کبھی جاکے سمندر نہیں ملتا

تم اپنا بنالو مجھے اخلاص و وفا سے
ورنہ میری فطرت ہے کہ گر کر نہیں ملتا

کچھ بحث کروں میں بھی تری تیز روی پر
اے وقت کہیں تیرا پیمبر نہیں ملتا

حالانکہ ابھی تک وہی ساقی وہی مے کش
کیا بات ہے کیوں دور میں ساغر نہیں ملتا

کیا دور ہے کیا وقت ہے کیا گردشِ دوراں
دامانِ گلِ تر بھی معطر نہیں ملتا

کہنے کو تو خود دارِ زمانہ ہیں بہت لوگ
اے دردؔ جوازِ دلِ خود سر نہیں ملتا

مری وفا کا تاثر تو دو زمانے کو
سناؤ اپنی زباں سے مرے فسانے کو

غمِ حیات، غمِ دوستاں، غمِ عالم
کلیجہ چاہئے ایسے میں مسکرانے کو

میں بے ارادہ تری بزم میں چلا آیا
کہا تھا دل نے نیابت کدہ بنانے کو

نظر کے سامنے جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے بغیر میں کیا نام دوں زمانے کو

جو چاہتے ہو کہ میں ترک مے کشی کرلوں
تو پہلے آگ لگادو شراب خانے کو

خلوصِ دل کو جنوں سے کیا گیا تعبیر
میرے شعور سے ضد ہو گئی زمانے کو

ہر ایک اشک ہے مژگانِ دردؔ پر بے تاب
ستارۂ سحری بن کے جگمگانے کو

نائیک محمد اکرم (اکرم باجوہ)

نام محمد اکرم اور ادبی نام اکرم باجوہ ہے ۔ آپ کے والد کا نام عبدالوہاب ہے ۔ آپ بوریوالہ ضلع وہاڑی کے ایک جٹ (باجوہ) خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو آپ بورے والا میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم بورے والا میں حاصل کی اور پھر ملتان آ گئے ۔ جہاں تعلیم کے حصول کے ساتھ شعر و ادب سے بھی لگاؤ رکھا ۔ اور بالآخر پاکستان آرمی میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہو گئے ۔ یہاں آپ عسکری مصروفیات اور ادبی مصروفیات کو ساتھ ساتھ لے کر چلے ۔ آپ کو پیشہ ورانہ سلسلے میں ملک سے باہر بھی جانے کا موقعہ ملا ۔ اور پھر جب سعودی عرب سے حاجی بن کر واپس لوٹے تو مدتِ ملازمت اختتام کے قریب تھی ۔ آپ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے اور آجکل ایک سکول میں پڑھا رہے ہیں ۔

آپ نے شعر میں محبت کا وہ رنگ بھرا ہے کہ وطن سے عقیدت اور اس دھرتی سے مضبوط رشتہ ابھر کر سامنے آتا ہے ۔ وطن کی مقدس مٹی کو ماں کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی محبت میں سرشار ہو کر خوبصورت نظمیں کہتے ہیں ۔

آپ کی غزل کے بارے سرور انبالوی لکھتے ہیں "اکرم باجوہ کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن ہے جس میں تجربے کی گرمی اور جذبے کی آنچ نے ایک انوکھی اور دھیمی دھیمی خوشگوار روشنی پیدا کر دی ہے" ۔

آپ اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی شعر کہتے ہیں ۔ بلکہ اردو سے پہلے آپ کی پنجابی کتاب "اکھ دا جنگل" ہی ادبی حلقوں میں متعارف ہوئی ۔ آپ تقریباً ۱۵۰ کتب پر تنقیدی مضامین بھی لکھ چکے ہیں ○○○

غزلیں

عقدے حیات و موت کے ہم کھولتے رہے　سرکٹ کے گر پڑے تو بدن بولتے رہے
صدیوں کا ایک لمحے میں طے کر لیا سفر　کتنے کٹھن زمانوں کے دل ڈولتے رہے
میں جن کو بھر کے دیتا رہا جامِ مشکبو　میرے سبو میں زہر وہی گھولتے رہے
آنسو بھی پونچھتے جو کسی کے تو بات تھی　تم صرف شبنموں کے گہر رولتے رہے
اے وقت تیرے ہاتھ ہے اب ان کا فیصلہ　میرے جنوں کو عقل سے جو تولتے رہے
گو اذنِ گفتگو نہ تھا پہرے لبوں پہ تھے　لمحے خموشیوں کے مگر بولتے رہے

اکرم ہمارا واسطہ ان سے رہا ہے جو
میزانِ زر میں جنسِ ہنر تولتے رہے

ناگ بن کر ڈس رہی ہے مجھ کو دن کی تیرگی　کون شب کی تیرگی کو کہہ رہا ہے روشنی
خون میں ڈوبی ہوئی تحریر ہے اس کا ثبوت　شہرِ دل میں پھر کسی خواہش نے کرلی خودکشی
ڈھل گئی اسکی جوانی زرد چہرا ہو گیا　جیسے لالہ کی جگہ کھلنے لگے سورج مکھی
رقصِ بسمل پر لہو کے دائرے نے یوں کہا　ظلم کی زنجیر یارو کاغذی ہے کاغذی
جس طرح خانہ بدوشوں نے کہیں چھوڑی ہو راکھ　اس طرح مجھ کو نظر آتی ہے اپنی زندگی
گر پڑے گا جلد ہی تم دیکھنا یہ خشک پیڑ　کہہ رہی ہے دشت و صحرا کی ہوا روتی ہوئی

کیا ہوا ہے آج اکرم تو نہیں جاگے گا کیا؟
پوچھتی ہے روزنِ در سے لپٹ کر روشنی

نائیک سید الطاف حسین شاہ بخاری

سادات گھرانے کے یہ چشم و چراغ اپنے جد حضرت امام حسین علیہ السلام کے مرثیہ خوان، جب غزل کی شاعری کرتے ہیں تو اس میں بھی حق گوئی سے گریز نہیں کرتے بلکہ سچ بات سرِعام کہہ دیتے ہیں۔

جناب سید الطاف حسین بخاری ولد سید عباس علی شاہ یکم فروری ۱۹۵۵ء کو دھول رانجھا تحصیل پھالیہ ضلع منڈی بہاؤالدین میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول سے کرنے کے بعد پاک فوج میں سپاہی کلرک بھرتی ہوگئے۔ جہاں آپ نے عسکری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایف اے اور پھر بی اے کیا۔ ۹ سال تک فوج میں خدمات سرانجام دیں اور نائیک تھے جب اسے خیرباد کہہ دیا۔ فوج سے آنے کے بعد وزارت خوراک و زراعت میں کیشئر کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔ اس ادارے میں تقریباً ۵ سال گزارے۔ لیکن جی اکتا گیا اور لوک ورثہ شکرپڑیاں میں ایک سال ریسرچ اسسٹنٹ اور اسسٹنٹ لائبریرین رہے۔ پھر ایک سال آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی میں زیرِ تعمیر امریکن لائبریری میں سپرنٹنڈنٹ اور سٹور آفیسر رہے۔ لیکن سیابی فطرت نے کہیں بھی ٹکنے نہ دیا اور بالآخر اکادمی ادبیات میں آگئے جہاں آپ اکاؤنٹ میں سپرنٹنڈنٹ متعین ہوئے اور ترقی کرکے برانچ آفس کوئٹہ میں ریذیڈنٹ ڈائریکٹر بن گئے۔ اسی دوران آپ نے بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔

شاعری آپ نے ۱۹۸۹ء میں شروع کی۔ اسے آپ نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور شب و روز کی محنت سے عروض پر عبور حاصل کیا۔

آپ ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں آج کل چھپ رہے ہیں۔ جن میں روزنامہ جنگ، روزنامہ میزان، روزنامہ نعرۂ حق، روزنامہ کلیم، ماہنامہ حق پرست، ماہنامہ پیامِ عمل، روزنامہ زمانہ اور ہفت روزہ زمانہ شامل ہیں۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ گہوارۂ سخن کے نام سے طباعت کے مراحل میں ہے۔ OOO

غزلیں

چمن پرست اندھیرے میں آ کے بیٹھ گئے
لہو چراغوں میں اپنا جلا کے بیٹھ گئے

جنہیں میں آدمی کہتے ہوئے بھی شرماؤں
کچھ ایسے لوگ مرے پاس آ کے بیٹھ گئے

وہ آج قوم کا غم کھا رہے ہیں بیچارے
تمام قومی خزانہ جو کھا کے بیٹھ گئے

یہ معجزہ ہے کہ پکوان جن کا پھیکا تھا
مگر دکان وہ اونچی سجا کے بیٹھ گئے

ہم اپنی آن میں تہذیب میں اسیر رہے
اور اپنے دوستوں سے چوٹ کھا کے بیٹھ گئے

بخاری وہ بھی ہیں جو بھر رہے ہیں گھر اپنا
اور ایک ہم ہیں کہ سب کچھ لٹا کے بیٹھ گئے

ان دنوں ایسی کوئی تدبیر ہونی چاہیئے
وحشیوں کے واسطے زنجیر ہونی چاہیئے

جب قلم کی ضرب کاری سے نہ بن سکتا ہو کام
پھر تمہارے ہاتھ میں شمشیر ہونی چاہیئے

میں نے دیکھا ہے در و دیوار پر خوف و ہراس
کچھ نہ کچھ اس خواب کی تعبیر ہونی چاہیئے

میں رئیسِ شہر کے کردار کا ہوں معترف
کچھ تو میرے نام بھی جاگیر ہونی چاہیئے

کس کو فرصت ہے لب و رخسار کے قصے سنے
شاعری اس دور کی تصویر ہونی چاہیئے

ہر عقیدے کے لئے جس کی فضا میں ہو امن
اک عمارت ایسی بھی تعمیر ہونی چاہیئے

اے بخاری ان دنوں میرے قلم پر فرض ہے
ظالموں کے ظلم کی تشہیر ہونی چاہیئے

نائیک محمد یعقوب فردوسی

"قدیم شعراء سے لے کر جدید شعراء تک شعر میں جس جذبے نے سب سے زیادہ کارفرمائیاں دکھائی ہیں۔ وہ ایک اور صرف ایک جذبہ محبت کا ہے۔ میر کو چاند میں جو صورت نظر آتی تھی اس کی جھلکیاں آج کے اشعار میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ شاعری انقلابی رہی ہو یا تجریدی، ہر شعر اور شاعر پہلے محبت کے راستے پر رک کر بہت دیر تک ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر اپنی منزل کا تعین کرتا ہے۔ ورنہ فیض

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

جیسا مصرع نہ تراشتے۔۔۔ محمد یعقوب فردوسی بھی ابھی راہ میں ہی کھڑے ہیں ان کے سامنے ابھی ایک ہی سیدھا راستہ ہے"۔ اکرام تبسم

یہ فردوسی جو ابھی چوراہے پر نہیں پہنچے کہ صحیح راستہ تراشیں ۱۹۸۳ء سے ادب کے اس سفر پر رواں ہیں۔ راہنمائی کے لئے آپ نے جناب آرزو انبالوی صاحب کا انتخاب کیا۔ جو ایک مدت سے ادارہ شعر و ادب میں گائیڈ کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

محمد یعقوب ولد محمد حسین کھیڑا یکم فروری ۱۹۶۸ء کو چک نمبر ۲ شمالی تحصیل بھلوال (سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ لیکن یہ سلسلہ ادھورا چھوڑ کر فوج میں آ گئے۔

آپ کی ادبی زندگی بہت کم ہے لیکن ادبی خدمات کی فہرست کافی طویل ہے۔ جو آپ کی عمر سے بھی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ آپ کا تالیف و تحقیق کا کام پختہ اور دلنشیں ہے۔ آپ نے نثر اور نظم دونوں میدانوں میں خاصی دوڑ لگا رکھی ہے۔ شاعری میں آپ کی کتاب "چاہت کے پھول" منظر عام پر آ چکی ہے۔ جو فردوسی کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ جلد آنے والے شعری مجموعے "مئے گلفام" (نعت و غزل) "اتھرو چاواں دے" پنجابی شاعری "گمنام غزل" (نعت و غزل) "عشق عاشق" (اردو غزل) اور "ردندیاں سدراں" پنجابی غزل طباعت و اشاعت کے کسی نہ کسی مرحلے پر پہنچ چکے ہیں۔

نثر میں بھی آپ نے بڑا کام کیا۔ سو سے زائد کہانیاں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ آٹھ عدد ناول بھی قسط وار علیحدہ جریدوں میں چھپ چکے ہیں۔ بے شمار اصلاحی تحریریں اور افسانوں کی ابھی تک گنتی نہیں کی۔ کچھ رسالوں میں باقاعدگی سے آپ کے ناول چھپ رہے ہیں۔ اور ایک اخبار کے لئے ایک کالم "فردوس نظر" لکھ رہے ہیں۔ آپ کے پنجابی اور اردو کلام کی آڈیو کیسٹس بھی مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ جو رفعت ہزاروی، افتخار گوہر، کے کے بھٹی اور اکرم راہی وغیرہ کی آوازوں میں گائی گئی ہیں۔ ○○○

غزلیں

رہ سکوں زندہ بچھڑ کر یہ کبھی سوچا نہ تھا / اجنبی بن جاؤں گا یہ ذہن میں آیا نہ تھا

اشک جو بہتے رہے ، بہتے رہے وہ یاد ہیں / ان کو بہنے ہی دیا ہم نے کبھی روکا نہ تھا

یوں بھی گزری زندگی اس بے وفا کی یاد میں / جیسے طوفاں تھا، ہوا کا وہ کوئی جھونکا نہ تھا

اپنے بیگانے سبھی دشمن بنے دشمن رہے / آنکھ اٹھا کر بھی کبھی ہم نے جنہیں دیکھا نہ تھا

کتنی مدت سے ترستی تھیں نگاہیں دید کو / چاک داماں پھر بھی محفل میں تری پہنچا نہ تھا

یار کے گیسو شبِ ہجراں سے بھی لمبے ملے / اژدھوں کے خوف سے اس گھر میں پھر جھانکا نہ تھا

وہ سلامت ہی رہیں فردوسی خوشبو میں بسیں
اپنی الفت میں کبھی ان کے لئے دھوکہ نہ تھا

★

بھلا کر تیری چاہت کو مجھے جینا نہیں آتا / مئے غم میں ملا کر اشک، مے پینا نہیں آتا

سجائی من کے مندر میں تری تصویر کیوں میں نے / گریباں چاک رہتا ہے مگر سینا نہیں آتا

سجا ہے پیار کا گلشن، بھرا ہے جام الفت کا / اٹھانا میرے ہاتھوں کو مئے و مینا نہیں آتا

وہ اک جو چاند صورت ہے وہ ہے کتنی بلندی پر / پہنچنے کے لئے اس تک کوئی زینہ نہیں آتا

میں تجھ بن جی سکوں گا کسطرح یہ سوچتا ہوں میں / تری صورت نہ ہو گر سامنے جینا نہیں آتا

جدائی کے سلیں گے زخم کس طرح یہ فردوسی
شبِ ہجراں میں ان زخموں کو اب سینا نہیں آتا

نائیک اخلاق حسین ساقی

نام اخلاق حسین اور تخلص ساقیؔ ہے۔ لہٰذا پورے نام اخلاق حسین ساقی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام حاجی محمد طفیل ہے۔

اخلاق حسین ۱۷ جون ۱۹۶۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول قاضیاں تحصیل گوجر خان سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کمرشل کالج گوجر خان سے انٹرمیڈیٹ کیا اور گھریلو حالات سے مجبور ہو کر کراچی چلے گئے۔ وہاں روزگار کے سلسلے میں قسمت آزمائی کی اور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ میں جونیئر کلرک ملازم ہو گئے۔ لیکن یہ کام دل کو نہ بھایا اور استعفیٰ دے دیا۔ اب آپ ماسٹر مولٹی فوم والوں کے ہاں ورکر بن گئے۔ لیکن جس شخص کو کلرکی نہ بھائی ہو یہ معمولی جاب کیسے پسند آتی۔ جلد ہی طبیعت اکتا گئی اور چند ماہ بعد کراچی ہی چھوڑ کر آ گئے۔ آپ کے والد ان دنوں سعودی عرب میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ آپ نے بھی تگ و دو کی۔ لیکن مقدر نے یاوری نہ کی اور آپ یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء کو پاک فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۹۴ء میں آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

آپ کچھ عرصہ سے بڑی تیز رفتاری سے مختلف ادبی رسائل اور جرائد میں لکھ رہے ہیں۔ نثر اور نظم ہر دو میں لکھتے ہیں۔ آپ کو کئی ایک رسالوں سے اعزازی مدیر کے لیے بھی پیشکش ہوئی۔ لیکن عسکری ڈسپلن اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ جس کے باعث آپ نے وہ آفرز ٹھکرا دیں۔

جناب ساقی گو سادہ اور پُر اسلوب شاعری کرتے ہیں لیکن ان میں کچھ استعارے اور مضامین ایسے ہیں جو آپ کی پہچان ہیں۔ قفس، شب، ساقی، خوف، پر، آنکھیں وغیرہ وغیرہ جب آپ اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں تو ان میں سے ایک محرومی، ایک احساس، ایک روایت، ایک حسن اور ایک پیار جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو ان کے طرزِ بیان کو سمجھنے اور پرکھنے میں قاری کی کافی مدد کرتے ہیں۔ ○○○

غزلیات

باغ میں سوکھے شجر باقی ہیں تیری یادوں کے ثمر باقی ہیں
تیری محفل سے میں اٹھ آیا ہوں پر میرے عیب و ہنر باقی ہیں
آشیاں خاک ہوا ہے جل کر میرے دامن میں شرر باقی ہیں
قدر اپنی ہے جہاں میں اب بھی ابھی کچھ اہل ہنر باقی ہیں
دیکھ تو کنجِ قفس کو آکر اب بھی نوچے ہوئے پر باقی ہیں
رات بھر جام لنڈھائے تم نے رند کچھ وقتِ سحر باقی ہیں
جھک نہیں سکتے ہیں ساقی ہرگز
اپنے کاندھوں پہ جو سر باقی ہیں

ہمیشہ خوں فشاں رہے تمہارے غم جواں رہے
کہاں کے پارسا تھے ہم قتیلِ مہوشاں رہے
ترے بغیر شب کو پھر نہ پوچھ ہم کہاں رہے
بسر ہوئی ہے اس طرح تو ساتھ تھا جہاں رہے
گزارے تیرے ساتھ جو
وہ لمحے جاوداں رہے

اے ایل ڈی شیر محمد عالم قادری

علی احمد تالپور وزیر دفاع تھے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ جو اپنی اپنی عرضیاں پیش کر رہے تھے۔ خوشامدیں ہو رہی تھیں کہ ایک نوجوان کھڑا ہوتا ہے خوبصورت اور Well Decorated کمرے کی تصویروں سے مزین دیوار پر ہاتھ رکھ کر پنجابی میں ایک شعر کہتا ہے۔ پہلا مصرعہ یوں ہے ؎

پی پی خون غریباں دا ایہناں کوٹھیاں بندیاں رہناں اے

مجمع میں سے ہر شخص کی نگاہیں اس جرأت مند نوجوان کی طرف اٹھتی ہیں اور لوگ دانتوں میں انگلیاں داب لیتے ہیں۔ چہ میگوئیاں ہوتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ جواں مرد ایک فوجی سپاہی ہے۔ جی ہاں یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو گردن کٹوانا، خون کا نذرانہ دینا اور دشمن کے سامنے گولیوں کی بوچھاڑ میں سینہ تان کر کھڑے ہونا جانتا ہے۔ (سندھ میں وڈیروں کے سامنے کوئی آدمی ایسی بات ان کی بھری محفلوں میں نہیں کر سکتا) جسے حق اور سچ کا علم ہوتا ہے اور اس دور میں اتنی ہمت و جرأت کہ "ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا" بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تفتیش کے بعد اس سپاہی کو ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اس پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اسے سزا دی گئی لیکن وہ سب کچھ بخوشی برداشت کر گیا۔ کیونکہ سچ بات کا اجر تو آخر ملنا تھا ناں۔ یہ سپاہی شیر محمد عالم قادری تھا۔

ابوالخالد شیر محمد عالم القادری اس وقت ایکٹنگ لانس دفعدار (اے ایل ڈی یعنی لانس نائیک) تھا۔ جب ہم ایک دوسرے سے ملے اور پھر چند سال ساتھ گزارے۔ میں نے اس شخص کو پکا فوجی پایا۔ جو اپنے ٹک اور پلیٹ کے ساتھ واسطہ رکھتا تھا ان دنوں اس کی کتاب "نوائے روح" شائع ہو کر مقبولیت پا چکی تھی۔ لیکن میں نے کبھی بھی اسے ایک شاعر کے روپ میں نہیں دیکھا ہر وقت فوجی سوچ، ہر لمحہ عسکریت، ایک بھرپور سپاہی، ہاں کبھی کبھار جب اس سے ادب کی بات ہوتی تو کہتا "یار شاکر! فوج سے جانے کے بعد دیکھیں گے۔ البتہ ادب کے اجارہ داروں سے میں اپنا حساب مانگوں گا" لیکن آج فوج سے گئے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ میں نے دوبارہ اس کا نام نہ کبھی سنا نہ دیکھا۔ ممکن ہے تلاش روزگار کے گرداب میں کشتی ذوق ڈوب گئی ہو۔ یا حالات سے سمجھوتہ کر کے اجارہ داروں کے حق میں ووٹ دے دیا ہو۔ اب تو انتظار کی گھڑیوں میں بھی ان کے لئے ہوئے الفاظ کی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔

اے بادِ صبا یثرب جاکے پیغام مرا پہنچا دینا
ٹوٹے ہوئے دل کی دھڑکن کے حالات انہیںؐ بتلا دینا
بے تاب نگاہیں الفت میں آنسو برساتی رہتی ہیں
تنگدل گھڑیاں یہ جیون کی آتی اور جاتی رہتی ہیں
سرکارؐ کے آگے میری طرح رو رو کے ذرا دکھلا دینا
اے بادِ صبا یثرب جاکے پیغام مرا پہنچا دینا
میخوار اپنے کو اے ساقی اک بھر کے جام پلا دینا
اے بادِ صبا یثرب جاکے پیغام مرا پہنچا دینا
درگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھا، دولت نہ جنت مانگی ہے
شیرِ عالم والئِ یثرب کی بس ایک محبت مانگی ہے
اٹھے ہوئے ہاتھوں کو مولا اب خالی نہ لوٹا دینا
اے بادِ صبا یثرب جاکے پیغام مرا پہنچا دینا

غزل

اس دنیا میں دل والوں کے جذبات دبائے جاتے ہیں
دولت کے لالچ میں آکر ایمان لٹائے جاتے ہیں
کیا کھول سناؤں رازِ خفی اس دل کی حقیقت کس سے کہوں
سچ کہنے والے دنیا میں پاگل کہلائے جاتے ہیں
جس دل کی ہو جرأت حق کہنا الٹا ہے رویہ دنیا کا
اس بیچارے پر ناحق ہی الزام لگائے جاتے ہیں
سن لے او دنیا کے مالک تیرا بھی بسیرا ہے جگ میں
یہ ارض و سما بھی دیکھ ستم بے خود لرزائے جاتے ہیں
موسیٰ کی ضرورت ہے پھر سے تہذیب و تمدن کی ہے صدا
اب پھر فرعونی طاقت کے پرچم لہرائے جاتے ہیں

لانس نائیک محمد اسلم خان (اسلم ناز سواتی ثم اسلم ناز خواجگانی)

میرا اسلم خان ولد بہرام خان موضع خواجگان تحصیل و ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لوئر مڈل سکول شیر پور سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول بفہ سے پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں سیپر اینڈ مائنز بنگال میں بحیثیت سپہ بھرتی ہو گئے لیکن ۱۹۴۶ء میں ریلیز کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۰ء میں آرمی کی انجینئرز کور میں شامل ہو گئے۔ ۹ سال بعد لانس نائیک کے رینک سے اپنی پندرہ سالہ مدتِ ملازمت پوری کر کے پنشن پائی۔ آپ نے دوسری جنگِ عظیم میں مغربی محاذ پر لڑائی میں بھرپور حصہ لیا اور جب فارغ ہوئے تو انڈیا سروس میڈل، وار میڈل اور ری پبلک میڈل آپ کی چھاتی پر سجے تھے۔ آپ نے ۱۹۵۹ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سکردو، بلتستان میں پی ڈبلیو ڈی میں ٹھیکیداری کی۔ اس دوران وہاں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے۔ ریڈیو پاکستان سکردو کی ابتدائی نشریات میں بچوں کے لیے پروگرام لکھے اور نشر کئے۔ ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والے یوم آزادی کے مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۸۹ء میں انجمن علم و ادب لوئر پکھل خواجگان کی بنیاد رکھی جس کے آپ صدر بھی ہیں۔

اسلم ناز خواجگانی ملک کے مختلف رسائل اور جرائد میں لکھتے رہتے ہیں۔ جن میں اجالا لاہور، ہمسفر راولپنڈی، مجاہد اور ہلال وغیرہ شامل ہیں۔ روزنامہ تعمیر، نوائے وقت، حیدر، شمال، نشیمن، قرطاس وغیرہ میں بھی آپ کی تحریریں جگہ پاتی ہیں۔ مجموعہ کتب میں ویران بہاریں (ناول) سواں کے کنارے، پھول اور کلیاں (بچوں کے لیے نظمیں) ننھے خزانے (بچوں کے لیے کہانیاں) شامل ہیں۔ نوید سحر کے نام سے انجمن علم وادب کے شعراء کا کلام یکجا کیا ہے جو زیر طبع ہے۔

آپ نے اپنی نظم کو جہاں بچوں کے لیے وقف کیا وہاں اپنی غزل کو ارد گرد کے ماحول، حالات و واقعات اور معاشرے کی اونچ نیچ سے علیحدہ نہیں ہونے دیا اور نہ ہی انسانی زندگی کے فطری مسائل اور غم و تکالیف سے اسے بیگانہ رکھا آپ کے اشعار میں جگہ جگہ درد و محبت کے استعارے ملتے ہیں۔ ہاں ایک خوش کن بات یہ ہے کہ آپ نے اپنا ذہنی ورثہ اپنی بیٹی کو بھی منتقل کر دیا ہے۔ جو ناظمہ وفا کے نام سے بڑے پیارے اور خوبصورت شعر کہتی ہیں۔ ○○○

غزلیں

ہم لوگ غمِ گردشِ دوراں میں پڑے ہیں
دیکھو تو کئی چھید گریباں میں پڑے ہیں

کچھ حادثہ پیش آیا ہے پیغام رساں کو
بکھرے ہوئے خط کوچۂ جاناں میں پڑے ہیں

صحرا میں چبھے تھے جو مرے پاؤں میں کانٹے
آلودہ لہو سے مرے داماں میں پڑے ہیں

کب گردشِ حالات ہمیں دے گی رہائی
مدت ہوئی حالات کے زنداں میں پڑے ہیں

درباروں میں جن شاہوں کی تھی شانِ حکومت
گمنام وہ اب گورِ غریباں میں پڑے ہیں

ملتی نہ تھی جن کو کبھی ہنگاموں سے فرصت
تنہا وہ یہاں کنجِ بیاباں میں پڑے ہیں

جن لوگوں سے رونق تھی کبھی بزمِ جہاں میں
وہ آج یہاں شہرِ خموشاں میں پڑے ہیں

جلتے ہوئے ارمانوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
اے نازؔ مرے سینۂ سوزاں میں پڑے ہیں

میری بے باک نگاہوں نے چمن دیکھے ہیں
خوں اگلتے ہوئے غنچوں کے دہن دیکھے ہیں

برسرِ عام چمکتے ہوئے پیسوں کے عوض
میں نے بکتے ہوئے مجبور بدن دیکھے ہیں

میں نے دیکھی ہے مہکتے ہوئے پھولوں کی بہار
میں نے جلتے ہوئے شعلوں میں چمن دیکھے ہیں

میں نے زربفت میں لپٹے ہوئے پھولوں سے بدن
وقت کے دوش پہ بے گور و کفن دیکھے ہیں

خندہ زن بزم میں اور رزم میں ہیں سینہ سپر
میں نے اے نازؔ جوانانِ وطن دیکھے ہیں

لانس نائیک فضل احمد بھٹی

فضل احمد بھٹی ولد میاں محمد بھٹی یکم جون ۱۹۴۲ء کو موضع کنڈان ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اور پھر گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ گھر میں تمام بہن بھائیوں سے بڑے تھے۔ لہذا میٹرک کے بعد گھر کے کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جب پاکستان کا ہر شہری ایک عجیب خلش سے بے چین اور جذبے سے ناموس وطن کے لئے سر کٹوانے نکلا تو آپ نے بھی گھر سے باہر قدم نکالا اور پوتر دھرتی کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ آپ کو انجنیئرز کور کے لئے چنا گیا۔ ابھی آپ تربیتی مراحل سے گزر رہے تھے کہ جنگ بند ہو گئی۔ یوں آپ عملاً اس میں حصہ نہ لے سکے لیکن چھ ہی سال بعد بھارت جب دوبارہ ناپاک عزائم کے ساتھ ہماری سرحدوں کی جانب بڑھا تو آپ نے آزاد کشمیر کے علاقے میں بڑے جوش اور لگن سے اپنے فرائض ادا کئے۔ لیکن جب حالات امیدوں کے برعکس نکلے تو شکستہ دلی سے ملازمت چھوڑ دی۔ اس وقت آپ مری میں تھے۔ پس مری ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔ وہیں شادی کی۔ بچے ہوئے اور وہیں کاروبار زندگی میں مصروف ہو گئے۔ کبھی کبھار گاؤں آتے یا پھر سردیوں کا سیزن گاؤں میں گزارتے لیکن جب والد صاحب فوت ہوئے تو ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے گاؤں واپس آ گئے۔

جناب فضل احمد بھٹی ایک عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے اس شوق کو پالا تھا۔ اور ابھی تک اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ پنجابی اور اردو شاعری آپ کا خاص میدان ہے۔ لیکن آپ کہانی کاری میں بھی ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں۔ معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں اور ماحول کی سنگینیوں کو نثر میں پیش کرنے کا انہیں بڑا عمدہ ڈھنگ آتا ہے۔ آپ نظم میں بھی انہی حالات اور زیادتیوں کو اشعار کی مالائیں پروتے ہیں۔ البتہ غزل روایتی کہتے ہیں۔ لیکن اس میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ ایک نرمی پائی جاتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار اس میں تلخی بھی آجاتی ہے۔ لیکن اس تلخی میں چبھن ہوتی ہے۔ احساس ہوتا ہے۔ ایک سوچ ہوتی ہے۔ آپ ملک کے اکثر جرائد میں باقاعدگی سے لکھتے رہتے ہیں۔ اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں ○○○

حسرتِ ناکام

ماہتاب ڈھل رہا ہے کہیں شام ہو نہ جائے — دل میں نہاں ہے حسرت ناکام ہو نہ جائے

گر رازداں نہیں تو کھولو نہ رازِ الفت — خاموش ہے محبت بدنام ہو نہ جائے

تری بے وفائیوں سے مری آرزو نہ ٹوٹے — سینے میں جو خلش ہے نیلام ہو نہ جائے

گر علم پر ہو نازاں چہرے سے درد پڑھ لو — جو چھپی ہے آہ دل میں کہیں عام ہو نہ جائے

مجبوریوں کو میری رسوا نہ کر خدارا
یہ فضل ترا جہاں میں بے دام ہو نہ جائے

آخر کب تک؟

میں بھی اک انساں ہوں آخر کب تک ستم گراؤ گے
پتھر جان کے میرے دل کو کب تک تم ٹھکراؤ گے
دل کو توڑنا کھیل تمہارا لیکن اتنا یاد رہے
ٹوٹ گیا جب یہ بھی کھلونا کس سے جی بہلاؤ گے
اک بے بس کی مجبوری پر ہنسنے والو، سوچو تو
میری وفا کا ماتم کرکے کب تک جشن مناؤ گے
بجھتی راکھ پہ تیل نہ چھڑکو بھڑک اٹھے گی یہ ورنہ
آگ لگے گی میرے من کو تو خود بھی جل جاؤ گے
جیون روگ بناکر جانے والو اتنا خیال رہے
ہم جب فضل یہاں نہ ہوں گے پھر کس کو تڑپاؤ گے

لانس نائیک ملک شاہ سوار علی ناصر

میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جنہوں نے اپنی شخصیت کی دیوار خود کھڑی کی اور اتنی محکم کہ مدتوں تک جھکڑ بھولوں کی ٹکریں سہتی رہے اور گرنہ سکے۔ انہی لوگوں میں ملک شاہ سوار علی ناصر کا شمار ہوتا ہے۔ میں اپنے اس سوہنے سجیلے، ہنس مکھ، چھیل چھبیلے، شگفتہ مزاج، سجنوں کے سجن اور بیلیوں کے بیلی، روایتوں کے امین دوست کو جس پہلو سے دیکھتا ہوں، پرفیکٹ پاتا ہوں۔ اس نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ کسی سے نفرت نہیں کی۔ ہر حال میں ہر کسی کے غم میں برابر کا شریک رہا۔۔۔ اور یہی انسانی اوصاف ہیں۔

۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو ارارڑہ ضلع خوشاب کے ایک متوسط زمیندار ملک دوست محمد کے گھر پیدا ہونے والا یہ بچہ ہمت و جرأت اور یگانگت و محبت کا پھریرا لہراتا ہوا آیا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی۔ جب ذرا کھلنڈرا ہوا تو فوج میں انجینئرز کور میں بھرتی ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ فوج میں آتے ہی مطالعے کا شوق شروع ہو گیا تھا۔ جس نے کچھ لکھنے کی ترغیب دی۔ اور آپ قلم لے کر معاشرے کی الجھنوں، ناہمواریوں، پیچیدگیوں، اور مسائل کو اوراق پر ترتیب دینے لگے۔ کبھی اصلی روپ میں، کبھی ان کے حل بتا کر اور کبھی ان کی خرابیوں کو اجاگر کر کے۔ آپ نے معاشرے کے ناسوروں کے بارے بہت لکھا۔ اور پھر مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپنے والی کہانیوں کو یکجا کر کے "زخمی چیخیں" کے نام سے کتاب شائع کی۔ جس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ایک ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اب قلم میں مزید روانی آ گئی۔ ذہن بھی نکھر آیا۔ ایف اے کرنے کے بعد یکدم پانسا پلٹا۔ اور اردو سے ہٹ کر پنجابی ادب کے ہو کر رہ گئے۔ فاضل پنجابی کا امتحان دیا اور گولڈ میڈل کے حقدار ٹھہرے۔ "کرلاٹ" کی اشاعت پر پنجابی حلقوں میں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اور ہاتھوں ہاتھوں اس کے دو ایڈیشن بک گئے۔ "نکی جیہی گل" پنجابی انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ جس نے پنجابی انشائیہ نگاری میں آپ کو صف اول میں لا کھڑا کیا۔ بی اے بھی چلتے چلتے کر لیا۔ عربی زبان کا کورس کیا۔ ریڈیو اور ٹی وی سروسنگ کا ڈپلومہ فوج کی طرف سے حاصل کیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عسکری خدمات کے سلسلے میں سعودی عرب چلے گئے۔ فریضۂ حج ادا کیا اور تین سال کے بعد جب وطن واپس لوٹے تو اتنی ہی مدت ملازمت زائد کر چکے تھے۔ لہٰذا فوج سے ریٹائر ہو کر گھر آ گئے۔ یہاں آ کر بھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھا پہلے اقبالیات اور پھر پالتانیات میں داخلہ لیا۔ پنجابی نظم و نثر کا سلسلہ جاری ہے۔ خوشاب سے پنجابی ادبی رسالہ "کرناں" بھی جاری کیا اور "پنجابی ادبی ویہڑا" کے سربراہ ہیں۔

غزلیں

میں نے کب چاہا تھا اے دوست یہ منظر دیکھوں   غم کے سانچے میں ڈھلا نور کا پیکر دیکھوں
گھر سے نکلا ہوں میں کشکول اٹھائے یارو   پیار کی بھیک کہاں ملتی ہے در در دیکھوں
میرے ماضی نے جنہیں چھین لیا ہے مجھ سے   ہاتھ کی ریکھا میں وہ پھوٹے مقدر دیکھوں
میری دیوانگی کرتی ہے تقاضا مجھ سے   ننھے ہاتھوں سے برستے ہوئے پتھر دیکھوں

میرا وہ لختِ جگر میرا سہارا ناصرؔ
میری خواہش ہے اسے اپنے برابر دیکھوں

راہِ وفا کے موڑ پہ کب سے کھڑا ہوا   آواز دے رہا ہوں تجھے ڈھونڈتا ہوا
دیکھا اسے تو ٹوٹ کے برسا ہے دوستو   مدت سے تھا جو آنکھ میں بادل رکا ہوا
شاید کہ اس سے میری شناسائی تھی کبھی   گزرا ہے جو یہاں سے مجھے دیکھتا ہوا
کیسے یہ مان لوں کہ گلستاں میں ہے بہار   جبکہ ہر ایک گل کا ہے سینہ پھٹا ہوا

ناصرؔ غمِ حیات سے کوئی نہیں بچا
ہر آنکھ اشک ہے ہر دل جلا ہوا

لانس نائیک محمد زمان سوز

کنجاہ ایک ایسا خطہ ہے۔ جس نے ادب کے حوالے سے بڑا نام پایا ہے۔ فارسی ادب میں غنیمت کنجاہی انگریزی شاعری میں لیفٹننٹ کمانڈر چوہدری نور محمد، پنجابی شاعری میں شریف کنجاہی اور اردو شاعری میں بے شمار نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ جن میں دانا کنجاہی، نازک کنجاہی، منیر صابری کنجاہی، انجم کنجاہی، زمان کنجاہی، زہیر کنجاہی، روحی کنجاہی وغیرہ وغیرہ۔ اردو کے انہی شعراء میں ایک اور نام بھی شامل کیا جاتا ہے جو ہیں جناب سوز کنجاہی۔

نام محمد زمان اور والد کا نام ولی محمد ہے۔ حسن و خوبصورتی اور شعر و ادب کی سرزمین کنجاہ ضلع گجرات میں ۱۲ مارچ 1951ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم یہیں سے حاصل کی اور پھر آرٹلری میں ریڈار اوپریٹر بھرتی ہوگئے۔ ۱۵ برس تک پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام رہا۔ نگر نگر کی اس سیاحی نے آپ کے دل و دماغ کو بہت وسعت دی اور آپ نے اپنی دھرتی، دھرتی کے باسیوں اور ہونے والے واقعات و حادثات کے بارے سوچنا شروع کردیا اور پھر یہ سوچ شعر کے قالب میں ڈھلنے لگی۔

ہر شخص کے چہرے پر نیا خوف لکھا ہے — کیا شہر میں پھیلی ہے وبار سوچ رہا ہوں
ہر سمت اندھیرا ہے تو ہر آن ہے وحشت — گزرے گا یہ کب سیلِ بلا سوچ رہا ہوں
گزری ہے ابھی سوز جو صحراؤں کے سر سے — برسے گی کہاں پر یہ گھٹا سوچ رہا ہوں

یہ سوچ انہوں نے اپنے تک ہی محدود نہیں رہنے دی بلکہ گاہے بگاہے "ہلال، غنیمت، جذبہ، شاہ سوار اور زمزمہ" جیسے اخبارات و رسائل کے ذریعے لوگوں تک پہنچائی اور انہیں بھی دعوت دی کہ وہ اپنے وطن اور اس وطن میں ہر روز نت نئے رونما ہونے والے واقعات پر سوچیں۔

جناب محمد زمان سوز نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد واپڈا میں ملازمت کرلی اور جب پیٹ کا مسئلہ حل ہوگیا تو ادب کی طرف بھرپور توجہ دی۔ آپ کی شعری خدمات کے باعث کنجاہ کے اہلِ ذوق نے آپ کو بزم غنیمت کا صدر نامزد کیا۔ کنجاہ میں جب بزمِ شعر و سخن وقوع پذیر ہوئی تو اس کی صدارت بھی سوز کے حصے میں آئی اور پھر آپ نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آس پاس کے دیہاتوں میں بھی ادب کے فروغ کے لئے بزمِ شعر و سخن کی شاخیں قائم کیں۔ جہاں بڑے جذبے اور شوق سے شعر و سخن پر کام ہورہا ہے۔ ○○○

غزل

جس نے ہر اک بات پہ ہنسنا سیکھا ہے — اس کی آنکھ میں آنسو آنا کیسا ہے؟
تجھ کو جو شہتیر دکھائی دیتا ہے — شاید میری آنکھ میں کوئی تنکا ہے
اس نے مجھ کو تاریکی میں چھوڑ دیا — میں نے جس کا نام اجالا رکھا ہے
پیاسی فصلیں ترس رہی ہیں پانی کو — بادل جاکر صحراؤں پر برسا ہے
اب وہ شخص ہمیں کو سوزؔ پڑھائے گا
جس نے باتیں کرنا ہم سے سیکھا ہے

غزل

یاد میری دوستوں کے درمیاں رہ جائے گی — میں چلا جاؤں گا میری داستاں رہ جائے گی
اَن کہی رہ جائیں گی ان کی بھی کچھ مجبوریاں — میری محرومی بھی محتاجِ بیاں رہ جائے گی
چاند جیسی صورتیں ہو جائیں گی خواب و خیال — چاہتوں کی خوبصورت داستاں رہ جائے گی
غمگسار آخر چلے جائیں گے تنہا چھوڑ کر — غم اٹھانے کو یہ جانِ ناتواں رہ جائے گی
رفتہ رفتہ نقش یادوں کے بھی مٹ جائیں گے سوزؔ
دل کے آئینے میں تصویرِ بتاں رہ جائے گی

لانس نائیک محمد اقبال ملک

۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں حالات نے شدت اختیار کی اور بھارت بھی ہمارے اندرونی معاملات میں کود پڑا تو ہر محب وطن پاکستانی نے کسی نہ کسی انداز میں اپنے آپ کو ملکی خدمات کے لئے پیش کیا۔ خاص کر نوجوان طبقہ جس نے ہر آڑے وقت قربانی دی۔ پیش پیش رہا۔ اقبال ملک بھی اس وقت سترہ سال کا جوشیلا جوان تھا۔ گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے ایف اے کیا ہی تھا کہ سرزمین وطن نے آواز دی اور یہ لبیک کہتا ہوا فوج میں داخل ہو گیا۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل خون۔

۲۵ مئی ۱۹۵۴ء کو موضع کھوڑہ ضلع خوشاب میں جنم لینے والے اس نوجوان نے ملازمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس امید پر کہ شاید وطن عزیز کی خدمت اس طرح بہتر کر سکوں۔ لیکن تعلیم کو بھی بریک نہیں دیا۔ یہ سلسلہ وقتی طور پر صرف دھرتی ماں کی پکار پر منقطع ہوا تھا۔ شوق نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اور پھر جس دن ایم اے کی ڈگری ہاتھ میں لی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے۔ انہیں دنوں آپ کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ مہربان کمانڈنگ آفیسر کی اجازت سے بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے گورنمنٹ لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ جناب اقبال اب لانس نائیک تھے۔ سلیکشن ہوئی اور ملازمت کے چودھویں سال آپ سعودی عرب چلے گئے۔ جہاں پیسہ بھی کمایا اور حج بھی کیا۔ تین سال بعد جب وطن واپس لوٹے تو عرصہ ملازمت ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ حاجی محمد اقبال ملک نے پنشن لی اور وکالت شروع کر دی۔

فوج میں ملازمت کے دوران شعر و شاعری سے رابطہ رہا۔ کبھی کبھار کچھ نہ کچھ کہہ لیتے لیکن جب پریکٹس شروع کی تو ایک کامیاب اور مصروف ایڈووکیٹ بنے۔ اس مصروفیت میں شعر کہنا تو کجا گاہ بگاہ کہے ہوئے اشعار بھی یکجا نہ کر سکے۔

اقبال کے دل میں انسانوں کے لیے محبت اور خلوص کے سوا کچھ نہیں اور یہی صفت ان کی شاعری کا بنیادی جوہر ہے۔

نمونۂ کلام

مرے آقا تمہارا آستانہ یاد آتا ہے   چھپا اک ایک لمحے میں زمانہ یاد آتا ہے
سیہ کاروں کی خوش بختی سبحان اللہ سبحان اللہ   حسیں پُرکیف وہ منظر یگانہ یاد آتا ہے
زمیں سے آسماں تک نور کی پھیلی ہوئی چادر   مجھے رہ رہ کے وہ موسم سہانا یاد آتا ہے

...

جانے کیسا یہ لگ گیا ہے روگ   دل کہ ہر پل ہے برفضائے سوگ
جب سے دیوانگی ہوئی ہے عیاں   راستہ چھوڑنے لگے ہیں لوگ
اور آہستہ ! عمرِ نازیبا   شوق سے سر پہ آئی کو اب بھوگ

...

فقیہہِ شہر نے جب سے شروع کیا پینا   خلوصِ ساقی و پاکیزگیٔ جم نہ رہی
کسی وجود سے دیوار و در کی رونق تھی   گیا وہ جب سے فروغاتِ کیف و کم نہ رہی

...

قسمت بکف ہوں شوق کے ساماں لئے ہوئے   آنکھوں میں تیری دید کے ارماں لئے ہوئے
میری نہ فکر آپ کریں حضرتِ فقیہہ   آیا ہوں میں تو وعدہ یزداں لئے ہوئے

...

تری محفل میں ساقی اک نرالی ریت دیکھی ہے   کہ جب ہم تشنہ آتے ہیں تو پیمانے نہیں ملتے

...

قدم قدم پر غم کی چٹانیں گو حائل ہیں راہوں میں   جان گنوا سکتا ہوں ہنس کر میں دھرتی کی بانہوں میں

...

ذرا آرائشِ کاکل سے فرصت ہو تو کر دینا   عنایت چند لمحے ہم کو بھی نظرِ محبت کے
حدیثِ درد کہہ کر دل کا ہلکا بوجھ کرلوں گا   اگر تیری خود آرائی مجھے جاناں اجازت دے

لانس نائیک سلطان احمد (محسن سیال)

دو دہائیاں پہلے کراچی سے بچوں کے لئے ایک رسالے "پھول اور کلیاں" کے اجرا کا اعلان ہوا۔ اشتہارات مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ قابل غور بات یہ تھی کہ "راقم کو" معاون مدیر" کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا تھا۔ میں بڑا حیران تھا مدیر ایس اے محسن سیال تھے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ مہربانی مجھ پر کیوں کی گئی۔ اس واقعے کے تین سال بعد محسن سیال سے میری ملاقات ہوئی۔ بہر حال ---۔ آج اتنی مدت بعد دوبارہ مجھے اس شخصیت کی یاد آئی۔

نام سلطان احمد ولدیت خان محمد سیال۔ آپ محسن سیال کے ادبی نام سے ہی پہچانے گئے۔ ۱۵ جون ۱۹۵۸ء کو مظفر گڑھ کے ایک گاؤں لنگر سرائے میں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم اپنے گاؤں میں ہی پائی اور پھر ۲۹ مئی ۱۹۷۸ کو پاکستان آرمی کی سگنل کور میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۸۷ء میں آپ نے آرمڈ فورسز بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ٹریڈ تبدیل کروا کر کلرک بن گئے۔ یوں پندرہ سال کی مدت ملازمت پوری کی اور ۲۸ مئی ۱۹۹۳ء کو پنشن لے کر گھر آ گئے۔ اس وقت آپ لانس نائیک تھے۔ فوج سے آتے ہی ایک موذی مرض نے آلیا اور ۲ نومبر ۱۹۹۴ء کو اسی بیماری میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ آپ نے آخری شعر جو کہا یہ تھا۔

زندہ تھا تو آجاتے تھے ملنے کو سب احباب　　اب موت کی دہلیز پہ کوئی بھی نہیں ساتھ

جناب محسن سیال بچپن سے لکھنے کی طرف مائل تھے۔ ابتدا "پھول اور کلیاں" نوائے وقت "بچوں کی دنیا" امروز "پھول اور کانٹے" شمع کراچی اور "بچوں کی باجی" روز نامہ امروز میں لکھا کرتے تھے۔ پھر بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی رسائل میں نظم اور نثر دونوں حوالوں سے کئی فرضی ناموں مثلاً شگفتہ عندلیب شبانہ افروز سے بھی لکھا آپ نے دو رسالے بھی جاری کئے۔ جن میں ماہنامہ بچوں کا ڈیس اور میگزین قلمی دوستی انٹرنیشنل شامل ہیں۔ جس رسالے کا ذکر (پھول اور کلیاں) اوپر ہوا ہے یہ صرف اشتہارات تک محدود رہا اور شائع نہ ہو سکا۔ دراصل اس وقت آپ فوج میں ملازمت کر رہے تھے اور قانوناً اس کی اجازت نہیں تھی۔ آپ نے دو بچے وسیم محسن سیال اور انیلا محسن سیال نشانی چھوڑے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ بڑے ہو کر باپ کے کام کو یکجا کر کے محفوظ کر سکیں۔

غزلیات

مت کرے مجھ سے کوئی ہر گز بہار آنے کی بات
رند کی ، مے کی ، سبو کی اور پیمانے کی بات
کیجئے مت ذکر میرا ان کی محفل میں حضور
موسم گل میں نہ کیجے آپ ویرانے کی بات
میرا قاتل آپ کو کہتے پھریں گے لوگ سب
کیجئے گا مت کسی سے میرے مر جانے کی بات
ماننا نہ ماننا یہ تو ہے مرضی آپ کی
سن تو لیجے ہائے للّٰلہ ایک دیوانے کی بات
کون جانے کس لئے لکھی ہے محسنؔ نے غزل
شعر کہنا ویسے تو ہے دل کو تڑپانے کی بات

تری خاطر میں اپنے غم ستم گر بھول جاؤں گا
سدا تو خوش رہے تیری قسم میں مسکراؤں گا
تمنا تھی جو دل میں اب وہ پوری ہو چکی میری
کوئی شکوہ کوئی نالہ نہ ہر گز لب پہ لاؤں گا
زمانہ سنگدل ہے پھر بھی تو میری محبت ہے
تری ہی یاد تیرا پیار میں دل میں بساؤں گا
محبت کا تقاضا ہے کہ کہہ دے حالِ دل اپنا
مگر محسوس ہوتا ہے اکیلے جل ہی جاؤں گا
یہی ہے آرزو محسنؔ سدا وہ ساتھ دے میرا
بھلایا اس نے گر مجھ کو تو دنیا چھوڑ جاؤں گا

سوار سبطِ علی صبا

نوشہرہ کینٹ کے مین بازار میں ایک چھوٹی سی تمباکو کی دکان ہے۔ جسے آج کل مقصود نامی شخص چلا رہا ہے۔ اس دکان کو دیکھ کر اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ۱۹۸۰ء سے پہلے وہاں ایک مدت تک ملک کے بڑے بڑے شعراء آیا کرتے تھے اور شعر و سخن کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ اس وقت کلیم جلیسری زندہ تھے جن کو شاعری کی دنیا میں ایک مقام حاصل ہے۔ یہ چھوٹی سی دکان ان کی اور ان کے خاندان کی کفیل تھی۔ یہاں ۱۹۷۷ء میں مجھے بھی آپ سے شرفِ ملاقات ہوا۔ ۱۹۶۵ء سے پہلے یہاں پر فطرت زیدی، م حنیف، سید سبط علی صبا، محسن زیدی ادیب وغیرہ باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب آرمرڈ کور کا ایک خوبصورت نوجوان دن کو رجمنٹل پولیس کا آرم بینڈ باندھے چوراہے پر یا کسی بڑے دروازے پر کھڑا بڑے دلکش انداز سے سلیوٹ کرتا یا بڑے نخرے سے گاڑیوں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کے لیے اشارے کرتا دکھائی دیتا تو شام کو وہی لڑکا کلیم جلیسری کی دکان پر شعر و ادب پر بھرپور بحث کرتا ہوتا۔ یا خوبصورت اشعار سنا رہا ہوتا۔ جنہیں سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ ٹینک کے ساتھ کھیلنے والا دماغ اتنے نفیس شعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اس ہستی کا نام سید سبط علی تھا جو صبا کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

جناب سید سبط علی صبا ۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کو کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رڑکی (بھارت) اور سیالکوٹ سے حاصل کی اور کچھ عرصے کے بعد آرمرڈ کور میں سوار (سپاہی) بھرتی ہوگئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر دشمن سے دو دو ہاتھ ہوئے۔ چند سال مزید آپ نے فوج میں گزارے اور پھر یہاں سے فارغ ہو کر پاکستان آرڈننس فیکٹری واہ کینٹ میں ملازم ہو گئے۔ بالآخر یہیں ۱۴ مئی ۱۹۸۰ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال فرمایا۔

جدید اردو شعراء میں صبا کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ آپ کا کلام ملک کے تقریباً تمام ادبی جریدوں میں شائع ہوتا ہے۔ آپ نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ○○○

غزلیں

ملبوس جب ہوا نے بدن سے چرا لئے
دوشیزگانِ صبح نے چہرے چھپا لئے

میں نے تو اپنے جسم پہ زخموں کے آئینے
ہر حادثے کی یاد سمجھ کر سجا لئے

دیوار کیا گری میرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لئے

میزانِ عدل تیرا جھکاؤ ہے جس طرف
اس سمت سے دلوں نے بڑے زخم کھا لئے

لوگوں کی چادروں پہ بناتی رہی وہ پھول
پیوند اس نے اپنی قبا پر سجا لئے

ہر صبح پرندوں نے یہ سوچ کے پر کھولے
ان آہنی پنجروں کے شاید کوئی در کھولے

ذہنوں پہ تکبر کے آسیب کا سایہ ہے
اولاد پہ بھی ہم نے اپنے نہ ہنر کھولے

اس شہرِ خیانت کے بے مہر مکینوں نے
دیوارِ حفاظت کے دن ڈھلتے ہی در کھولے

ہم سہل پسندوں نے آنکھیں ہی نہیں کھولیں
دھرتی تو ازل سے ہے گنجینۂ زر کھولے

زردار کے کمرے کی دیوار کے سائے میں
بیٹھے ہیں زمیں زادے کشکول نظر کھولے

ساون مری آنکھوں سے خوں بن کے برستا ہے
جب کوئی زمیں زادی دربار میں سر کھولے

سوار سجان الدین (گلؔ بخشالوی)

سجان الدین ولد اسرار الدین جو گلؔ تخلص کرتے ہیں۔ بخشالی ضلع مردان جنم بھومی کی نسبت سے بخشالوی کہلوانا پسند کرتے ہیں اور ہاں جب سے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی ہے تب سے حاجی گل بخشالوی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ گلؔ جب سجان الدین پر فوقیت پانے کے لیے نام کا حصہ بنا تو اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ دھرتی سے محبت کی بنا پر ہے بلکہ صرف پٹھانیت سے پیار کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا اور بالآخر شعور میں چھپے ہوئے جذبے نے گل میں وطن سے محبت، اس دھرتی سے پیار اور اس سرزمین سے چاہت کی ایک شمع روشن کر دی۔

جناب گل بخشالوی ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول نوشہرہ سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے اور چند سال آرمڈ کور میں سوار کی حیثیت سے خدمات ادا کرنے کے بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔ لاابالی ذہن تھا جس نے واپس مردان جانے کی بجائے کھاریاں میں ہی رہنے پر مجبور کیا۔ کچھ کرنے اور کچھ بننے کے شوق میں بڑے بڑے پاپڑ بیلے۔ مزید تعلیم حاصل بھی کی۔ غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ محنت مزدوری کو عار نہ سمجھا۔ دنیا اور حالات کی ٹھوکروں سے ذہنی شعور کی آبیاری ہوئی اور شعر نے کہیں پسِ پردہ جنم لیا۔ جس کو علامہ انیسؔ لکھنوی جیسے استاد نے سنوار کر گل کو ابھارا کہ اس کے اندر وہ جذبہ پوشیدہ ہے جس سے محبت و الفت کا پیغام دیا جا سکتا ہے اور یوں گل ادب کے آسمان پر طلوع ہوا۔ اور پھر "سوچ رت، بزم رسالت، خود نوشت، دربار رسالت، غذائے محمد، فن و شخصیت میاں جمیل صدیقی، بے نظیر قیادت، فن و شخصیت پریشان خٹک، فن و شخصیت حکیم محمد سعید" جیسی کتابیں مرتب کر کے دنیائے ادب میں ہلچل مچادی۔ اسی دوران "قلم قافلہ" ایک تنظیم بنائی۔ پہلے تو صحافت میں "خلش" کے اجراء سے قدم رکھا اور پھر ماہنامہ "قلم قافلہ" مستقل جاری کر دیا۔ صرف یہی نہیں کھاریاں سے پہلا ہفت روزہ اخبار "کھاریاں ٹائمز" بھی منظر عام پر لایا۔ جو ایک بین الاقوامی صورت اختیار کر گیا اور بیک وقت پاکستان اور پاکستان سے باہر چھپنے لگا۔ گجرات کھاریاں کے لوگ چونکہ دوسرے ممالک میں کافی تعداد میں رہ رہے ہیں اس لیے اسے خوب پذیرائی ملی۔

اس پُرعزم اور باہمت شخص کو میں نے کبھی ٹک کر بیٹھتے نہیں دیکھا۔ یہ ہر لمحہ کسی نہ کسی کام کے کرنے کی دھن میں سرگرداں رہتا ہے۔ واقعی وہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو دنیا میں کچھ نہ کچھ کر جاتے ہیں۔ ○○○

حمد

ترے کرم تری رحمت کا کیا حساب کروں
میں حمد کہنے کی کیا سعی کامیاب کروں

چمن میں چاروں طرف پھول تیرے جلووں کے
یہ کشمکش ہے کہ کس گل کا انتخاب کروں

تجھے قریب سے دیکھا ہے دل کے کعبے میں
ترے جمال کا کیا کیا رقم نصاب کروں

میں تیری بندہ نوازی کا معترف ہوں بہت
میں آدمی ہوں خطا کیوں نہ بے حساب کروں

ترے بغیر ہر اک سوچ ہے گناہِ عظیم
میں ذکر غیر سے کیوں عاقبت خراب کروں

مشامِ جاں ہے معطر ترے تصور سے
میں اپنے دل کے ہر اک داغ کو گلاب کروں

خدا کبھی تو گل ایسی عطا کرے توفیق
ہر اک برائی کا دنیا میں سدباب کروں

غزل

وہ منظر بھی عجب ہوگا مرے گھر آئے گی دنیا
کہ مجھ پر احتراماً پھول بھی برسائے گی دنیا

میں لکھتا ہوں قلم کی نوک میں لے کر لہو دل کا
مری تحریر میں خوشبو وطن کی پائے گی دنیا

میں ساغر ہوں۔ میری قیمت کا اندازہ تمہیں ہوگا
مری تربت پہ جب آنسو بہانے آئے گی دنیا

غبار آلود ہیں چہرے مگر شمس و قمر ہم ہیں
یقیں جانو ہمیں کھو کر بہت پچھتائے گی دنیا

میں مثلِ دائرہ پھیلا ہوا ہوں ارضِ ہستی میں
مجھے جب ڈھونڈنے نکلے گی خود کھو جائے گی دنیا

میں گل بخشالوی آخر تو مر ہی جاؤں گا لیکن
مرے اشعار میں اکثر مجھے دہرائے گی دنیا

سپاہی مرزا محمود سرحدی

مرزا محمود سرحدی ۱۹۱۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کم عمری سے ہی گردشِ روزگار میں "گھمن گھیریاں" کھانے لگے۔ کچھ عرصہ مزدوری کی اور پھر دوسری جنگِ عظیم میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ چند سال تک انگریز کی خاطر دربدر پھرتے رہے لیکن یہ سلسلۂ شب و روز آپ کو پسند نہ آیا۔ یار لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ نے خود اپنے اوپر پاگل پن طاری کر لیا لیکن آپ کا کہنا کہ بدقسمتی سے پاگل ہو گیا تھا۔ جس کے سبب تین سال تک مینٹل ہسپتال میں رہنا پڑا۔ بہرحال کچھ بھی ہوا آپ میڈیکل بورڈ ہو کر گھر آ گئے۔ اب آپ ایک سکول میں استاد بن گئے۔ اچھی ملازمت تھی لیکن بے قرار دل کا کیا کرتے جو ٹک کر بیٹھنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کلرک بادشاہ بن گئے۔ بہرحال زندگی گزارنے کے لیے بڑے بڑے جتن کرنے پڑے۔ اس رنگ ڈھنگ نے آپ کو بے باک نقاد اور تنقیدی شاعر بنا دیا۔ زندگی کے تضادات اور نشیب و فراز نے آپ کو وہ لہجہ دیا کہ آپ "اکبر سرحدی" مشہور ہو گئے۔ یہ نام اکبر الہ آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ انداز کی تقلید کی بنا پر ملا۔

بقول جناب احمد ندیم قاسمی "مرزا محمود سرحدی کی شخصیت میں جو بے ساختہ پن اور رسیلا پن ہے وہ ہی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ انہوں نے طویل نظمیں لکھنے کی بجائے مختصر نویسی اختیار کی اور طنز و مزاح کو بناوٹ اور آورد سے قطعی طور پر پاک کر کے اس لطیف صنفِ سخن کو اس کا صحیح منصب عطا کیا۔ اسی لیے مرزا محمود کو اردو کے طنز نگار اور مزاح گو شعراء میں ایک منفرد مقام حاصل ہے جو سراسر ان کا اپنا ہے۔"

آپ نے ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو پشاور میں ہی وفات پائی۔ آپ کے دو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ "سنگینے" اور "اندیشۂ شہر"۔ آپ نے تمام عمر تجرد کی زندگی گزاری۔ لیکن تجربہ ہے کہ

جب وہ پہلے ملی تو چپ چپ تھی　اور میں تھا کہ بولے جاتا تھا
وہ دوبارہ ملی تو میں چپ تھا　اور اسے بولنے کا چسکا تھا
ہوئی شادی تو دونوں چپ چپ تھے　بولنے والا صرف گلا تھا
پھر یہ عالم کہ دونوں بولتے تھے　اور سارا محلہ سنتا تھا

OOO

الیکشن

اس الیکشن میں ہم نے کیا دیکھا ‎ ‎ اک انوکھا سا ماجرا دیکھا
کچھ سمجھ میں نہ آسکا محمود ‎ ‎ جیتنے والا ہارتا دیکھا
گننے والوں کو اس پہ حیرت ہے ‎ ‎ کس طرح یہ میرے یہاں نکلیں
چار سو ووٹروں کی تھی فہرست ‎ ‎ سات سو بیس پرچیاں نکلیں
اپنے ممبر کی کامیابی کو ‎ ‎ بعض لوگوں نے نام بدلے ہیں
بیویوں نے بھی جوش میں آکر ‎ ‎ شوہرانِ کرام بدلے ہیں
کچھ بزرگوں نے ساتھ ہی اپنے ‎ ‎ نونہالوں کے ووٹ دے ڈالے
بعض جدت پسند لوگوں نے ‎ ‎ مرنے والوں کے ووٹ دے ڈالے
تجربہ تھا جنہیں الیکشن کا ‎ ‎ اور جنہوں نے مزے اڑائے تھے
کامیابی کے واسطے ووٹر ‎ ‎ دوسرے شہر سے بھی لائے تھے
نوٹ لے کر جو ووٹ دیتے تھے ‎ ‎ ان فقیروں کو ہم نے دیکھا ہے
ہم نے دیکھا ہے جنس کی صورت ‎ ‎ آدمی کس طرح سے بکتا ہے

غزل

بعد مدت کے حضور ایک غزل لکھی ہے ‎ ‎ آپ کی جان سے دور ایک غزل لکھی ہے
شیخ جی ہم نے مچائی ہیں زمیں پر دھومیں ‎ ‎ آپ نے تو سرِ طور ایک غزل لکھی ہے
گنگنایا ہے تصور میں ترے پھر ہم نے ‎ ‎ پی کے پھر بادۂ نور ایک غزل لکھی ہے
تو نے للچا کے ہمیں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں ‎ ‎ اس لئے تو نے ضرور ایک غزل لکھی ہے
اپنی تقصیر کا پوچھا تو وہ بولے ، تو نے ‎ ‎ سو قصوروں کو قصور ایک غزل لکھی ہے

کوئی زندوں میں سخن فہم نہیں کس کو سنائیں
ہم نے اے اہل قبور ایک غزل لکھی ہے

سپاہی عبدالرحیم (صحرائی گورداسپوری)

تحریکِ پاکستان کے جانباز مجاہد اور برصغیر پاک و ہند کے معروف ادیب و شاعر عبدالرحیم صحرائی ۱۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو کوٹ سندوخ راہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ناظرالدین مغل اور والدہ گوہر بی بی نیک سیرت اور پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے۔ یوں صحرائی صاحب نے اس ماحول اور ایک دینی درسگاہ سے تعلیم حاصل کی۔ چودہ سال کی عمر میں مصرعے کہنے لگے۔ دوسری جنگِ عظیم میں آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو آپ نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور پھر حصولِ آزادی کے محاذ پر مورچہ سنبھالنے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی جانبازانہ حصہ لیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب مملکت خداداد پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہوئی تو صحرائی گورداسپوری مرحوم کو یہ نمایاں اعزاز حاصل ہوا کہ چودہ اگست کو بارہ بجکر ایک منٹ پر ریڈیو پاکستان لاہور سے آزادی کا پہلا ترانہ انہی کی تخلیق تھا۔

آپ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہیں سے ہفت روزہ "ناخدا" کا اجراء کیا۔ آپ بزمِ اہلِ ذوق لاہور کے صدر، پاکستان رائٹرز گلڈ کے سرگرم رکن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے رکن اور پنجابی لکھاری لیگ کے تاحیات صدر رہے۔

"ناخدا" کے مالی بحران کا شکار ہونے پر پاکستان انجینئرنگ کمپنی کے شعبہ تعمیرات میں بحیثیت سپروائزر قومی خدمات انجام دینے لگے۔

آپ بنیادی طور پر پنجابی زبان کے شاعر ہیں لیکن آپ کا پنجابی کلام تاحال اشاعت کا منتظر ہے۔ جس میں آپ نے باقی اصناف سخن کے علاوہ ترانے اور ملی نغمے پر زیادہ زور دیا اور دراصل یہی قومی ترانے ہی قیامِ پاکستان سے پہلے آپ کی پہچان تھے۔ اردو میں نسبتاً کم شعر کہے۔ جنہیں انجمنِ فروغِ ترویجِ اردو نے "لالۂ صحرا" کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ آپ کے کلام میں جرأت، اسلامی اخلاقیات اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔

آپ اپنی تحریروں کے علاوہ پسماندگان میں ۵ لڑکے اور ۲ لڑکیاں چھوڑ کر ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ○○○

نعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جو بھی گمراہ نظروں پہ مغرور تھے آگئے راہ پر دیکھتے دیکھتے
رہبرِ دیں کی دہلیز پر سر تو کیا جھک گئے سربسر دیکھتے دیکھتے
جس طرف سے بھی گزرے ہیں شمس الہدیٰ ؐ کفر کی رات کا خاتمہ ہوگیا
ذرے ان ؐ کے قدم چومتے چومتے بن گئے ہیں سحر دیکھتے دیکھتے
تاجدارِ ؐ حرم کے کرم سے ہوئی روشنی زندگی، زندگی روشنی
شب کی دیوار میں کھڑکیاں کھل گئیں، مسکرائی سحر دیکھتے دیکھتے
آپ ؐ کا ہر قدم انقلاب آفریں آپ ؐ تاریکیوں کو ہیں نورِ مبیں
آپ ؐ نے کی ہے بیدار سوئی ہوئی قسمتِ بحر و بر دیکھتے دیکھتے
آگہی کے چمن میں بہار آگئی غنچے غنچے کو ایماں کی خوشبو ملی
آپ ؐ کی دید کا ذوق جس کو ہوا ہوگیا دیدہ ور دیکھتے دیکھتے
آپ ؐ کی جب نگاہِ عطا ہوگئی زندگی موت سے ماورا ہوگئی
جنتِ منزلِ آرزو مل گئی، آپ کی رہگزر دیکھتے دیکھتے
میں مدینے میں صحرائی جاکر رہوں روز و شب ان کے روضے کو دیکھا کروں
یہ تمنا ہے میرا نکل جائے دم، قصرِ خیر البشر ؐ دیکھتے دیکھتے

غزل

جب سے شبابِ فکر کے منظر بدل گئے — میری نگاہِ زیست کے تیور بدل گئے
چرچا ہو کیوں نہ مرگِ تمنا کا ہر طرف — تہذیبِ زندگی کے پیمبر بدل گئے
شہرِ جمالیات میں اب وہ کشش نہیں — نظریں بدل گئی ہیں کہ منظر بدل گئے
جاری رہی ہے مشقِ ستم میری ذات پر — آئے ہیں تیر دل میں تو نشتر بدل گئے
برہم ہماری ذات سے اِک شخص کیا ہوا — اس بزمِ کائنات کے تیور بدل گئے

صحرائی جب اٹھے ہیں بہ عزمِ بہارِ نو
ہر خار زارِ غم کا مقدر بدل گئے

سپاہی عبدالرحیم (صحرائی گورداسپوری)

تحریکِ پاکستان کے جانباز مجاہد اور برصغیر پاک و ہند کے معروف ادیب و شاعر عبدالرحیم صحرائی ۱۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو کوٹ سندوخ راہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ناظرالدین مغل اور والدہ گوہر بی بی نیک سیرت اور پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے۔ یوں صحرائی صاحب نے اس ماحول اور ایک دینی درسگاہ سے تعلیم حاصل کی۔ چودہ سال کی عمر میں مصرعے کہنے لگے۔ دوسری جنگِ عظیم میں آپ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو آپ نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور پھر حصولِ آزادی کے محاذ پر مورچہ سنبھالنے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی جانبازانہ حصہ لیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب مملکت خداداد پاکستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر جلوہ گر ہوئی تو صحرائی گورداسپوری مرحوم کو یہ نمایاں اعزاز حاصل ہوا کہ چودہ اگست کو بارہ بجکر ایک منٹ پر ریڈیو پاکستان لاہور سے آزادی کا پہلا ترانہ انہی کی تخلیق تھا۔

آپ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ یہیں سے ہفت روزہ "ناخدا" کا اجراء کیا۔ آپ بزم اہلِ ذوق لاہور کے صدر، پاکستان رائٹرز گلڈ کے سرگرم رکن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے رکن اور پنجابی لکھاری لیگ کے تاحیات صدر رہے۔

"ناخدا" کے مالی بحران کا شکار ہونے پر پاکستان انجینئرنگ کمپنی کے شعبہ تعمیرات میں بحیثیت سپروائزر قومی خدمات انجام دینے لگے۔

آپ بنیادی طور پر پنجابی زبان کے شاعر ہیں لیکن آپ کا پنجابی کلام تاحال اشاعت کا منتظر ہے۔ جس میں آپ نے باقی اصناف سخن کے علاوہ ترانے اور ملی نغمے پر زیادہ زور دیا اور دراصل یہی قومی ترانے ہی قیامِ پاکستان سے پہلے آپ کی پہچان تھے۔ اردو میں نسبتاً کم شعر کہے۔ جنہیں انجمنِ فروغ و ترویجِ اردو نے "لالۂ صحرا" کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ آپ کے کلام میں جرأت، اسلامی اخلاقیات اور قدیم و جدید کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔

آپ اپنی تحریروں کے علاوہ پسماندگان میں ۵ لڑکے اور ۲ لڑکیاں چھوڑ کر ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ○○○

نعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جو بھی گمراہ نظروں پہ مغرور تھے آگئے راہ پر دیکھتے دیکھتے
رہبرِ دیں کی دہلیز پر سر تو کیا جھک گئے سربسر دیکھتے دیکھتے
جس طرف سے بھی گزرے ہیں شمس الہدیٰ ؐ کفر کی رات کا خاتمہ ہوگیا
ذرے انؐ کے قدم چومتے چومتے بن گئے ہیں سحر دیکھتے دیکھتے
تاجدارِ ؐ حرم کے کرم سے ہوئی روشنی زندگی، زندگی روشنی
شب کی دیوار میں کھڑکیاں کھل گئیں، مسکرائی سحر دیکھتے دیکھتے
آپؐ کا ہر قدم انقلاب آفریں آپؐ تاریکیوں کو ہیں نورِ مبیں
آپؐ نے کی ہے بیدار سوئی ہوئی قسمتِ بحر و بر دیکھتے دیکھتے
آگہی کے چمن میں بہار آگئی غنچے غنچے کو ایماں کی خوشبو ملی
آپؐ کی دید کا ذوق جس کو ہوا ہوگیا دیدہ ور دیکھتے دیکھتے
آپؐ کی جب نگاہِ عطا ہوگئی زندگی موت سے ماورا ہوگئی
جنتِ منزلِ آرزو مل گئی، آپ کی رہگزر دیکھتے دیکھتے
میں مدینے میں صحرائی جاکر رہوں روز و شب ان کے روضے کو دیکھا کروں
یہ تمنا ہے میرا نکل جائے دم، قصرِ خیر البشرؐ دیکھتے دیکھتے

غزل

جب سے شبابِ فکر کے منظر بدل گئے — میری نگاہِ زیست کے تیور بدل گئے
چرچا ہو کیوں نہ مرگِ تمنا کا ہر طرف — تہذیبِ زندگی کے پیمبر بدل گئے
شہرِ جمالیات میں اب وہ کشش نہیں — نظریں بدل گئی ہیں کہ منظر بدل گئے
جاری رہی ہے مشقِ ستم میری ذات پر — آئے ہیں تیر دل میں تو نشتر بدل گئے
برہم ہماری ذات سے اِک شخص کیا ہوا — اس بزمِ کائنات کے تیور بدل گئے

صحرائی جب اٹھے ہیں بہ عزمِ بہارِ نو
ہر خار زارِ غم کا مقدر بدل گئے

سپاہی محمد صادق (لالہ صحرائی)

محمد صادق ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ان دنوں دوسری عالمی جنگ نے دنیا کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ برصغیر کے نوجوان بھی دھڑا دھڑ فوج میں بھرتی ہو رہے تھے۔ آپ نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ کچھ ابتداء سے طبیعت میں مذہبی رجحان تھا۔ کچھ فوج میں جا کر مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے قرآنِ کریم اور تحریکِ اسلامی کے لٹریچر کو جب غور سے پڑھا تو یہ حقیقت آپ پر منکشف ہوئی کہ ایک مسلمان کے لیے اسلامی حکومت کے سوا کسی دیگر حکومت کی نوکری اختیار کرنا شرعاً حرام ہے اور کسی غیر اسلامی حکومت کی فوج کی ملازمت یا کسی ایسی جنگ میں چاکری تو بدرجہ غایت حرام ہے۔ جس کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی کی بجائے حرص و آز کے جذبہ کے ماتحت محض کشور کشائی ہو۔ لہٰذا اس انکشاف کے ساتھ ہی آپ اس ملازمت سے چھٹکارا پانے کی فکر کرنے لگے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور فوج میں تخفیف ہونا شروع ہوئی۔ تو آپ نے بھی درخواست دے دی۔ آپ کی رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ اور آپ کے سکواڈرن کمانڈر نے آپ کی درخواست یہ کہتے ہوئے رد کر دی کہ تم ہر لحاظ سے کمشن کے مستحق ہو سو درخواست دے دو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ لیکن آپ نہ مانے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۶ء میں جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع میں پٹھان کوٹ حاضری دی اور پھر اسی جماعت کے ہو کر رہ گئے۔

جناب محمد صادق نے ۱۹۴۹ء سے اپنے قلم کو رواں کیا۔ قلمی نام آپ نے لالہ صحرائی تجویز کیا۔ بلکہ جہانیاں ضلع خانیوال مسکن ہونے کی بناء پر کبھی کبھار لالہ صحرائی (جہانیاں) بھی لکھتے ہیں۔ آپ کی اب تک تین نثری کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن کے نام "نور منارہ" "چمن میری امیدوں کا" اور "نئے پھول پرانی خوشبو" ہیں۔

"نور منارہ" ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بارے میں ہے "چمن میری امیدوں کا" بعض حضرات کے تاثراتی خاکوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ "نئے پھول پرانی خوشبو" تفہیم القرآن کے چند اقتباسات پر مشتمل ہے۔

نثر کے علاوہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں اور اس میں آپ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ نے نعت کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ نعت گوئی کی عمر اگرچہ زیادہ نہیں لیکن آپ اپنے پہلے مجموعۂ نعت "لالہ زارِ نعت" سے ہی نعت کے باب میں اہم نام کہلانے۔ ○○○

نعت

مرادِ عاشقاں تمؐ ہو، نویدِ طالباں تمؐ ہو
جبینِ عشق نازاں ہے، کہ اس کا آستاں تمؐ ہو

متاعِ مرضیِ مولا، عطا کرتا ہے بندوں کو
مرے آقا مرے ہادیؐ وہ فیضِ جاوداں تمؐ ہو

چھپے ہو گرچہ صدیوں میں، مگر میں دیکھ لیتا ہوں
کہ اپنی سیرتِ انور کے شیشے میں عیاں تمؐ ہو

تمہاراؐ حسنِ صورت، حسنِ سیرت بے بدل ٹھہرا
خجل ہیں سامنے جس کے، نگارانِ جہاں، تمؐ ہو

محبت سلطنت جس کی، عقیدت مملکت جس کی
دلوں کی اس رعایا کے اک ایسے حکمراں تمؐ ہو

ہو شمعِ بزمِ دنیا کی، ہو مشعل راہِ عقبیٰ کی
تمہیؐ سے دو جہاں روشن، کہ نورِ دو جہاں تمؐ ہو

سہارا بے کسوں کا ہو، تبہ حالوں کے مونس ہو
مداوا غم زدوں کا ہو، شفیعِ عاصیاں تمؐ ہو

گناہوں سے جو گھائل ہیں وہ دکھیارے جہاں بھر کے
تمہیؐ سے آس رکھتے ہیں، مسیحائے جہاں تمؐ ہو

خدا کے آخری پیغام کے ہو ترجماں تم ہی
خدا کی رحمتِ کامل کے، اک کامل نشاں تمؐ ہو

جو سودا ہے کیا ہم نے عوض میں جاں کے جنت کا
یہ ہو گا نفع آور اب، کہ اس کے درمیاں تمؐ ہو

قیامت میں حضورِ حق، زباں اپنی تو ہو گی گنگ
سُنا ہے التجائے عاصیاں کے ترجماں تم ہو

خدا کی مجھ پہ رحمت ہے، کہ تمؐ آئے مرے دل میں
مرا دل عرش پایہ ہے، کہ اس کے میہماں تمؐ ہو

تجلی ریز یہ حُبِ نبیؐ کا نیّرِ تاباں
فلک وجدانِ عالم کا اسی نیّر سے ہے رخشاں

نبیؐ کا اسوۂ اطہر، کشودِ رازِ ہستی ہے
جہل کے پیچ و خم میں ہے سراغِ منزلِ عرفاں

کھلے منہ پر جو مقصورہ کبھی اے رحمتِ باری
تو اسکے فرش کی جاروب کش ہو گی مری مژگاں

درودوں کے تموّج میں رواں ہوں جانبِ طیبہ
کیا ہے تیزیؐ رفتار کا میں نے بہم ساماں

طریقِ باغبانی جب ملا کردار احمدؐ کا
تو کشتِ نوعِ انسانی ہوئی ہے پھر سے گل افشاں

بجھے گی تشنگی جاں کی، اسی کی حدتِ خوش سے
مدینے کی ہے یارو دھوپ گویا چشمۂ حیراں

جو ان سے پھوٹتی ہیں اب شعاعیں حُبِ احمدؐ کی
یہی ہے ان دنوں، ہمدم مرے افکار کی پہچاں

سپاہی عبدالروف (اخترؔ امرتسری)

نام: عبدالرؤف ولدیت: میاں عبدالرحمان تاریخ ولادت: ۱۱ مئی ۱۹۲۱ء

جائے ولادت: امرتسر ادبی نام: اخترؔ امرتسری

رسمِ بسم اللہ مسجد سے ہوئی۔ قرآنِ مجید کے ساتھ ساتھ اسلامیہ ہائی سکول امرتسر سے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ آپ اپنے ابتدائی حالات یوں رقم کرتے ہیں۔

"۱۹۳۵ء میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ گھر سے سونے کا ہار چرا کر دوستوں کے ساتھ لاہور بھاگ گیا۔ وہاں احسان دانش، الطاف مشہدی اور مجید لاہوری کی صحبت سے فیض یاب ہوا۔ یہاں سے بمبئی چلا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں "انجمن معراجِ ادب" کے نام سے شعراء کی ایک الگ بزم قائم کی۔ بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "سروش" سے چھپنے کا آغاز ہوا"۔

جناب اختر امرتسری نے جیل کی ہوا بھی کھائی۔ بمبئی میں جن دنوں رہ رہے تھے وہیں گرفتار ہوئے اور پھر ضمانت پر رہا ہو کر راولپنڈی کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر لال کرتی میں احمد حسین قریشی نامی ٹھیکیدار اٹک آئل کمپنی کے ہاں بطور سپروائزر ملازم ہو گئے۔ لیکن جی نہ لگا اور لاہور چلے آئے اور پھر۔۔۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو رائل انڈین انجینئرز میں سپاہی کلرک بھرتی ہو گئے۔ کچھ عرصہ تو گزارا لیکن آزاد طبیعت پر پابندی ناگوار گزری اور بھاگ نکلے۔ چند سال اِدھر اُدھر پھرتے رہے چونکہ فوج کے قانون سے فرار ناممکن تھا لہٰذا حاضر ہوئے اور برطرف کر دیئے گئے۔

سپاہی عبدالرؤف نے فوج سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ نوشہرہ میں گزارا۔ وہاں سے کراچی چلے گئے اور ایک مدت تک وہاں رہے۔ حتیٰ کہ دسمبر ۱۹۷۳ء میں وہیں وفات پائی۔ آپ نے شاعری میں غزل کو ترجیح دی ہے۔ لیکن نظم سے بھی کشاں نہیں رہے۔ نثر میں بھی قلم کی قوت کو آزمایا اور زیادہ تر افسانے لکھے۔ آپ کا کلام "سروش، الہلال، ہندوستان، جمہور، انقلاب، انہام، کہکشاں، ادبی دنیا، زمیندار، احسان، تعلیم و تربیت، صبح صادق، چترا، اداکار، پکچر، پارس، انجام، ایوننگ نیوز، جنگ، انسان، گلفروش، ڈان، شہباز" اور "الفلاح" وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ○○○

محبوبِ داور صلی اللہ علیہ وسلم

پہنچ جاؤں اگر اک بار اے ہمدم مقدر سے
تو مرکر بھی نہ اٹھوں روضۂ محبوبِ داورؐ سے

کبھی تو اپنے روضے پر بلائیں گے مرے آقاؐ
بس اتنی عرض ہے اس ماہ لقا ماہِ منور سے

گزر تاریکیٔ انسِ بتاں کا اس میں کیونکر ہو
منور قلب ہر مومن کا ہے حبِ پیمبرؐ سے

مجھے کب سے حصارِ بے کسی نے گھیر رکھا ہے
نکالو "رحمتٌ اللعالمینؐ" جلد اس کے چکر سے

بناتا مرغِ دل جاکر نشیمن باغِ طیبہ میں
اڑا جاتا اگر اس ناتواں بے بال و بے پر سے

مقابل میں اگر رکھ دوں درِ دندانِ آنحضرتؐ
چمک الماس سے اڑ جائے آب و تاب گوہر سے

یہ کیا اندھیر ہے مولا زیارت یاب عالم ہو
غریب و بے نوا اختر یوں پاکستان[1] میں ترسے

غزل

حقیقت میں بڑی دلچسپ دونوں کی کہانی ہے
میں خوگر ہوں ستم کا اور وہ ظلموں کا بانی ہے

کہاں جاتے ہو بیٹھو تو ذرا دم بھر تسلی سے
ابھی تو مجھ کو رودادِ شبِ فرقت سنانی ہے

وہ تیغِ بے مروت ہاتھ میں اور جانبِ مقتل
الٰہی آج کیا اس سنگدل نے جی میں ٹھانی ہے

ادھر آ دردِ فرقت تجھ کو سینے سے لگا لوں میں
مرے کھوئے ہوئے دل کی بس اک تو ہی نشانی ہے

اسے تیرا ستم سمجھوں یا اپنا امتحاں جانوں
جفائیں مجھ پہ ہیں غیروں پہ تیری مہربانی ہے

ہزاروں آرزوئیں خوں ہوئیں لاکھوں تمنائیں
بڑی پُردرد میری عمرِ رفتہ کی کہانی ہے

سرِ تسلیم خم ہے تیری اس بیدادِ پیہم پر
کہ یہ آئینِ الفت ہے وہ آئینِ جوانی ہے

خدائے پاک اس طوفاں میں تجھ کو ناخدا بن کر
مری ٹوٹی ہوئی کشتی کنارے سے لگانی ہے

زہے قسمت وہ مجھ سے پوچھتے ہیں حال اے اختر
نوازش ہے، عنایت ہے، کرم ہے، مہربانی ہے

۱۔ اصل شعر میں پاکستان نہیں بلکہ ہندوستان لکھا ہے۔

سپاہی فضل حق

جناب فضل حق ۱۹۲۳ء میں ضلع گجرات کے ایک گاؤں مرالہ میں پیدا ہوئے۔ مڈل کا امتحان ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول کھاریاں سے، میٹرک مسلم زمیندار ہائی سکول گجرات سے کیا اور پھر زمیندار کالج گجرات سے بی اے کی ڈگری ۱۹۴۴ء میں حاصل کی۔ کش مکش روزگار سے سمجھوتہ کرتے ہوئے سگنلز کور میں بھرتی ہو کر جبل پور آ گئے۔ جہاں آپ نے تربیت مکمل کی اور پھر ۱۹۴۹ء تک آپ مختلف مقامات پر فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ نے فوج سے ریزائن دیا اور پولیس آفیسر سلیکٹ ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جب صرف لاہور میں مارشل لاء کے نفاذ پر فوج اور سول حکومت میں اختلاف ہوا تو آپ جو کہ اس وقت صوبہ بلوچستان کے آئی جی پولیس تھے، نے اپنی خدمات پیش کیں اور پھر لاہوریوں پر ظلم ڈھائے۔ ۱۹۷۷ء میں وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ جب جنرل محمد ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو آپ کی چھٹی کر دی گئی۔ تب سے آپ روزنامہ جنگ میں ہفتہ وار کالم "گاہے گاہے باز خواں" لکھ رہے ہیں۔

شعر آپ نے تیرہ سال کی عمر سے کہنے شروع کئے۔ جب پندرہ سال کے تھے تو آپ کی پہلی غزل زمیندار کالج گجرات کے جریدہ "شاہین" میں شائع ہوئی۔ جس کے دو شعر تھے۔

بہار آئی ہوا تازہ مجھے شوقِ غزل خوانی
خوشا ذوقِ نواریزی، دریغا سوزِ پنہانی
گریباں چاک کر کے شاہدِ گل مسکراتا ہے
متاعِ ہستیِ عالم ہے گویا چاک دامانی

اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی اور بنگالی میں بھی شعر کہے ہیں۔ آپ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور مشرق و مغرب کے اکثر ممالک کا سفر کیا۔ یوں آپ کی شاعری آپ کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ آپ کے مجموعہ ہائے کلام میں "آہنگِ حجاز، مہرِ عرب، نمِ صحرا، سوئے حرم، خارِ مژگاں، مثنوی مولا علیؑ" اور "سورج" شامل ہیں۔ آپ کی ان تخلیقات میں زیادہ تر نعتیں اور غزلیں ہیں۔ مثنوی مولا علیؑ منظوم سوانح حیات ہے۔ ○○○

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نہ دل ہے کوئی پریشاں نہ چشم تر کوئی
کہاں ملے گا مدینے کا ہم سفر کوئی

ہم اس مقامِ تمنا پہ ہیں کہ جس میں نہیں
جنوں کو اذنِ لب و فرصتِ نظر کوئی

غبارِ رہ کو پکارو مسافروں سے کہو
کہ مصطفیٰؐ سے نہیں بیش راہ بر کوئی

غمِ حبیب میں ہم نے کبھی روا نہ رکھی
تمیزِ دامن و چاک و دل و جگر کوئی

ترےؐ مقام سے روح الامیں بھی لوٹ آئے
ترےؐ مقام کو پہنچے گا کیا بشر کوئی

خیالِ ہجرِ نبیؐ یوں محیط ساعت ہے
نہ شب ہے کوئی ہماری نہ ہے سحر کوئی

رسولِؐ دشتِ عرب سے کہیں گے قصۂ دل
نہیں ہے عشق میں ان سے خبیر تر کوئی

نسیم آتی ہے ہر صبح خلدِ یثرب سے
ملے گی ایک نہ اک دن ہمیں خبر کوئی

غزل

لَو دیکھتے ہیں لوگ چراغوں کے علاوہ
میں ایک نظر آتا ہوں داغوں کے علاوہ

کیوں پوچھتے ہو مجھ سے مرے غم کی حقیقت
اک زخم تہِ دل ہے سراغوں کے علاوہ

آباد ہیں کچھ دل، کہ بہت ہم نے کئے ہیں
وہ کام جو ہوتے ہیں دماغوں کے علاوہ

گلچیں کے لئے محشرِ گل سے ہیں زیادہ
وہ پھول جو کھل جاتے ہیں باغوں کے علاوہ

سائے سے جلا دیں جو عقابوں کے نشیمن
کچھ ایسے پرندے بھی ہیں زاغوں کے علاوہ

مے خانے سے گزرا تھا میں کل شام ڈھلے پر
ٹوٹے ہوئے کچھ دل تھے ایاغوں کے علاوہ

سپاہی خلیل الرحمان خان (خلیل رامپوری)

مجھ کو بھی ایک نرس نے خون دیا تھا جنگ میں
آج اسی سبب سے ہے نرمی مرے مزاج میں

لیکن خدا کے خوف سے ڈرنا پڑا مجھے
پیچھے کبھی پلٹے نہ قدم جنگ میں خلیل

ان اشعار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خلیل رامپوری کے کلام میں فوج کی زندگی کے اثرات اور یادداشتیں چھپی ہوئی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس پوشیدہ سوانح عمری کو تلاشنا پڑے گا۔

خلیل پہلے فوجی اور پھر شاعر ہیں۔ عسکری ملازمت کے دوران آپ کے اندر ایک شاعر نے جنم لیا۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ ان کی یونٹ نے مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جب شعراء حضرات تشریف لائے تو کرنل صاحب اور دیگر بڑے افسران نے کھڑے ہو کر ان کو تعظیم دی۔ یہ منظر اور یہ توقیر دیکھ کر خلیل نے بھی شاعری کی لگن اپنے دل میں محسوس کی۔ اور پھر لگے شعر موزوں کرنے ۰۰۰ وقت کے ساتھ ساتھ شاعر بڑا ہوتا رہا اور فوجی گھٹتا رہا۔ یہاں تک کہ صرف شاعر ہی باقی رہ گیا۔ اور لیفٹ رائٹ کی بجائے فاعلن، مفعولن نے لے لی۔ اشعار کے ڈھیر لگتے گئے۔ جنہوں نے بعد میں "پہلا مسافر، روشنی کا صحرا، چراغ پانی میں، تھل کا سورج" اور "آسمان پیروں میں" کی صورت اختیار کر لی۔

جناب خلیل الرحمان خان دسمبر ۱۹۲۳ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی وہیں گزاری۔ جب دوسری عالمی جنگ نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہر شخص اس سے متاثر ہوا تو بے شمار ٹیلنٹڈ لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لہذا آپ نے بھی اپنے شب و روز اسی پیشے سے وابستہ کر لئے۔ اسی دوران رامپور میں ہی آپ کی شادی ہو گئی۔ جس سے آپ کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ فوج میں آنے کے بعد اوپر ذکر کئے گئے واقعے نے آپ کی زندگی اور سوچوں کا دھارا بدل گیا اور آپ نے ۱۹۵۳ء میں ریٹائرمنٹ لے کر سرحد ٹیکسٹائل ملز نوشہرہ میں ملازمت کر لی۔ بعد ازاں تھل ٹیکسٹائل ملز میں بطور ویلفیئر اور سیکورٹی افسر تعینات ہوئے اور بھکر آ گئے۔ پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جب شکیب جلالی اور منشا پانی پتی بھکر آئے تو یہ جدید شاعری کی ایک تثلیث بن گئی اور ان تینوں نے اس میدان میں خوب نام کمایا اور تجربے کئے جس سے آنے والے شعراء کو جدت کی طرف رہنمائی ملی۔

خلیل رامپوری اپنی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میری مثال ایک چشمے جیسی ہے جو چشمے سے جھیل اور جھیل سے دریا بنا۔ یا اس خود رو پودے کی ہے جو رات کی شبنم اور دن کی دھوپ کھا کر جوان ہوا اور سایہ دار درخت بنا" ○○○

غزل

آج اگر وہ میرا ہوتا مجھ کو ایسی مات نہ ہوتی
اتنی کالی رات نہ ہوتی اتنی لمبی بات نہ ہوتی

میں دھرتی پر پاؤں نہ دھرتا دنیا میرے ساتھ نہ ہوتی
گلزاروں میں پھول نہ کھلتے کھیتوں میں برسات نہ ہوتی

کسی کے من میں کھوٹ نہ ہوتا کوئی بھی بے انصاف نہ ہوتا
پھول کھلا کرتے صحرا میں صرف چمن کی بات نہ ہوتی

میں آیا تو اپنا اپنا چہرہ لے کر ہر شے آئی
ورنہ ایسی دھوپ نہ ہوتی ورنہ ایسی رات نہ ہوتی

آج بھرے بازار میں اس نے ٹوک دیا تو رنج بہت ہے
میری آنکھیں میرے بس میں ہوتیں تو یہ بات نہ ہوتی

بے مقصد بے مطلب باتیں جیسے میزوں پر گلدستے
کام کی ہم باتیں کرتے تو کام کی یہ بہتات نہ ہوتی

فردیات

زمین اوڑھ کے چلتا ہوں آسماں کی طرف
ہوا ہوں، خاک اڑاتا ہوں بے نشاں کی طرف
کوئی چراغ جلانے کو لے ہی آؤں گا
کبھی تو جاؤں گا شہرِ سخنوراں کی طرف

چاٹ لی کیڑے نے پتے کی زباں
ترجمانی کر رہا تھا خار کی

ہوا کے رخ پہ ہمیشہ پتنگ اڑتی ہے
زمانہ چھوڑ کے تم میرا ساتھ کیا دو گے

بادل دھوئیں کے گھر پر، ڈیزل کی بو گلی میں
کیا جانے کس طرح سے میں سانس لے رہا ہوں

قلم فنکار کا یارو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑتا
کبھی کائی نہیں جمتی ہے شعلوں کی زبانوں پر
کبھی بہتے ہوئے پانی میں دیواریں نہیں اٹھتیں
کبھی پہرے نہیں لگتے پرندوں کی اڑانوں پر

خلیلؔ میری تو ہمدردیاں ہیں سب کے ساتھ
میں راستے کے شجر کی طرح سے سب کا ہوں

موڈ بات کرنے سے ٹوٹتا نہیں بھائی
کھیت لہلہاتے ہیں ٹیوب ویل چلنے سے

سپاہی فضل حسین شاہ (ساغر بخاری)

ساغر نظامی اور ساغر صدیقی کی تقلید میں میدانِ شاعری میں اترنے والے ساغر بخاری کو کوئی نہیں جانتا اور اس کی وجوہات ان کی معاشی و معاشرتی مجبوریاں ہیں۔ ساغر صدیقی کو ان کی وفات کے بعد شہرت کی بلندیاں نصیب ہوئیں اور اگر انہوں نے زندگی لاہور جیسے ادبی مرکز سے ہٹ کر کسی گاؤں میں گزاری ہوتی تو شاید ان کو بھی کوئی نہ جانتا۔ ساغر صدیقی اور ساغر بخاری میں ایک قدر مشترک ہے کہ ساغر صدیقی مافیا وغیرہ کے لیے اپنی غزلیں بیچتے تھے اور ساغر بخاری اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی تحریر بیچتے ہیں۔

ساغر بخاری صرف اور صرف شانِ حضرت علیؓ اور اہلبیت کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ ذاکر لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور قصائد و منقبت لکھوا کر لے جاتے ہیں۔ جس کے بدلے دو چار روپے دے جاتے ہیں۔ جس سے سید فضل حسین شاہ کی دال روٹی چل رہی ہے۔

جنابِ فضل حسین شاہ، کوٹ امیر حسین ضلع گجرات کے اہل تشیع سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد کا نام حیدر شاہ ہے۔ ساغر بخاری آپ کا قلمی نام ہے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ پیدا ہوئے۔ اینگلو ورنیکلر (مڈل) تک تعلیم پائی اور ۱۹۴۲ء میں بلوچ رجمنٹ میں بھرتی ہوگئے۔ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ فوجیں متحرک تھیں آپ بھی حرکت میں رہے۔ اور برما، تھائی لینڈ، منی پور، آسام اور جالندھر وغیرہ میں پھرتے رہے۔ جالندھر میں آپ کا قیام کچھ زیادہ تھا۔ جہاں آپ نے ابرار حسین شاہ صاحب سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ اس دور میں آپ افسانے لکھا کرتے تھے جو "شمع" دہلی اور "آجکل" جالندھر میں شائع ہوتے تھے۔ "ایک دن"، "جھیل کا کنارہ" اور "نازو کی محبت" آپ کے افسانے بڑے مشہور ہوئے۔ آخر الذکر افسانہ آپ کے استاد مولانا ابرار حسین شاہ نے کہیں پڑھا اور کافی خفے ہوئے۔ جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ساغر بخاری نے افسانہ نگاری چھوڑ دی اور شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور نجم صدیقی مدیر آج کل جالندھر سے کچھ تعلیم رموز حاصل کی۔ اس دور کی شاعری اور افسانے آپ سے ضائع ہو چکے ہیں اور ذہن میں بھی کچھ نہیں بچا۔ بعد میں آپ نے اپنے آپ کو صرف توصیفِ پنجتن کے لیے وقف کر دیا۔

عسکری ملازمت آپ نے صرف ۸ سال کی اور ریٹائرمنٹ لے لی۔ لیکن چونکہ آپ ریزرو تھے۔ اس لیے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھی شمولیت کی۔ ○○○

نمونۂ کلام

کہا یہ علیؓ نے محمدؐ کی جا پہ نہیں آپ سویا سلایا گیا ہوں
مرا کام دینِ نبیؐ کو بچانا وصی میں نبیؐ کا بنایا گیا ہوں
مدینے کے بازار کو کوئی دیکھے محمدؐ کے اسوار کو کوئی دیکھے
نبیؐ کہہ رہے ہیں نواسوں کا گھوڑا بنا خود نہیں میں بنایا گیا ہوں
ہوا سے یونہی باب خیبر کا بولا کہ ثقلین کو آج حیدرؓ نے تولا
میں روزِ حشر تک ہی اڑتا رہوں گا علیؓ بادشاہ کا اڑایا گیا ہوں
ہے ساغرؔ یہ آواز عابد کی آئی کہ اک رسم ہے باپ بیٹے نے پائی
نہ برساؤ پتھر اب اے شام والو میں کربل میں کافی ستایا گیا ہوں

یہ مرحب نے آکر نجومی سے پوچھا فتح کس کی ہوگی مجھے جلد بتلا
تو بولا نجومی، قضا بن کے تیری مدینہ سے شہ ذوالفقار آ گیا ہے
اے محبوب میرے تو سر کو جھکانا یہ جب تک نہ اٹھے نہ سر کو اٹھانا
نواسے ترےؐ کی نرالی ادا پہ مجھے کملی والے ، پیار آ گیا ہے
یہ کیوں چلتے چلتے شتر رک گئے ہیں پلانوں سے اہلِ حرم جھک گئے ہیں
ہے ویراں میں رونے کی آواز آئی سکینہ کا جیسے مزار آ گیا ہے

جو ہیں دوشِ رسالت کی زینت بنے وہ جوانانِ جنت کے سردار ہیں
فاتح خیبر کے ہیں دونوں لختِ جگر اور خیر النساء کے وہ دلدار ہیں
پہنے ہم نے تو جنت کے ملبوس ہیں عید پڑھنے تو اونٹوں پہ سب جائیں گے
جو نہ بے مثل ہم کو سواری ملی، جب ملے گی سواری تو تب جائیں گے
تم فرشتو نہ چھیڑو لحد میں مجھے میں ولائے علیؓ میں ہوں کھویا ہوا
غسلِ میت ملا مجھ کو ایسا نہیں، میں ہوں کوثر کے چھینٹوں سے دھویا ہوا

نرسنگ اسسٹنٹ نادر حسین بھٹی

بہت کم شادی شدہ جوڑے ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو ہم مزاج ہوں، ہم خیال ہوں، ایک جیسی عادات کے مالک ہوں، ایک جیسی سوچ کو ذہن میں پالتے ہوں۔ ہم رویہ اور ہم اشغال ہوں، ایسے جوڑے تو شاید کمپیوٹر بھی ملانے میں فیل ہو جائے۔ لیکن میں ایسے ایک کپل کو جانتا ہوں جو اپنے خصائل، معمولات، مشاغل، پیشہ، فکر بلکہ ہر لحاظ سے یک جان و یک قالب ہیں اور وہ ہیں ڈاکٹر نادر اور ڈاکٹر رضیہ نادر۔

۱۹۸۴ء میں جب ڈاکٹر نادر سے جلالپور جٹاں میں ملاقات ہوئی دونوں میاں بیوی ڈاکٹر تھے، شاعر تھے، کونسلر تھے، ادبی سیریز "فکرِ نو" کی ادارت سنبھالے تھے، ادبی محفلوں کی جان تھے، کئی تنظیموں کے سربراہ اور کئی اداروں کے ممبر تھے، فرق تھا تو دونوں کی عمروں کا جو کبھی دونوں نے محسوس نہیں کیا۔

ڈاکٹر نادر جلالپور جٹاں میں حکیم میاں محمد حسین کے ہاں ۳۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاک فوج میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہو گئے۔ آرمی میڈیکل کور میں کچھ عرصہ گزارا۔ آپ کے والد صاحب چونکہ حکیم تھے ادویات کی شُد بُد تھی۔ میڈیکل کور میں ایلوپیتھی سے واسطہ رہا اور بہت کچھ سیکھا۔ لہٰذا ریٹائرمنٹ لے لی اور ہومیو پیتھک کی تعلیم حاصل کر کے جلالپور جٹاں میں ہی اپنا کلینک کھول لیا۔

۱۹۷۲ء میں آپ باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے لگے اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پھر ۱۹۸۲ء میں اپنے حلقے کے کونسلر مقرر ہوئے۔ تب ڈاکٹر رضیہ کے ساتھ آپ کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ بھی کونسلر منتخب ہوئیں۔ نادر حسین بھٹی پہلے سے شادی شدہ تھے اور پہلی بیوی سے اولاد بھی تھی۔

۱۹۹۵ء میں میرا دوبارہ جلالپور جانا ہوا تو میں نے ڈاکٹر نادر کا پتہ کیا لیکن سن کر بڑا دکھ ہوا کہ آپ کا وصال ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ بھابی رضیہ کے پاس تعزیت کے لئے گیا۔ اب ڈاکٹر رضیہ خود کلینک چلا رہی ہیں۔ کوئی اولاد نہیں لہٰذا ایک لڑکے کو اپنا بیٹا بنا رکھا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب مرتے دم تک مجلسِ علم و ادب جلالپور کے سرپرست رہے۔ جو آپ کے بعد دم توڑ گئی اور ۱۹۸۸ء میں آپ کو سٹی مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکرٹری بھی منتخب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رضیہ کہتی ہیں

کیا کریں ہم سے اندھیروں میں سفر ہوتا نہیں　　روشنی درکار ہے ہم کو سفر کے واسطے
ماسوا آباد ان کے یہ نگر ہوتا نہیں　　لاکھ اور آئیں بسانے دل کی یہ بستی مگر

غزل

زخم دل کا یوں رفو کرتے چلیں
سنگدل سے گفتگو کرتے چلیں

وہ ہے نالاں یہ سنا ہے غیر سے
کیوں نہ باتیں روبرو کرتے چلیں

چند روزہ زندگی ہے دوستو
مل کے سب کی آبرو کرتے چلیں

دل کو ملتا ہے سکوں جس نام سے
ذکر اس کا کُو بہ کُو کرتے چلیں

یہ بجا کہ اس کا ملنا ہے محال
پھر بھی اس کی جستجو کرتے چلیں

خارزاروں میں بسر کی ہے مگر
کچھ بیانِ رنگ و بو کرتے چلیں

ہے یقیں در پر بلائیں گے ضرور
پھر بھی نادر آرزو کرتے چلیں

غزل

ترس مت کھاؤ دلِ افگار پر
مہرباں ہونا ہے جو اغیار پر

کوئی بھی چہرہ شناسا نہ لگے
جب نظر ڈالوں بھرے بازار پر

کر دیا رسوا بھری محفل میں کیوں؟
میں تو آیا تھا ترے اصرار پر

دل ہی تھا آخر بیچارہ ہائے دل
مر گیا پائل کی اک جھنکار پر

پھر سے دھوکہ دے گیا کوئی تمہیں
ناز تھا تم کو کسی کے پیار پر

یہ وہی جانے کہ میں کس جرم میں
آج لٹکایا گیا ہوں دار پر

دل یہ کہتا ہے وہ آئے گا ضرور
آج کاگا بولے پھر دیوار پر

دستِ قدرت نے بنایا ہو جیسے
کون مر جائے نہ اس شہکار پر

اس جہاں میں کوئی بھی مخلص نہیں
کر گیا نادر بھروسہ یار پر

سپاہی سید شہباز حسین شاہ (شہباز نقوی)

سید شہباز حسین ایک سادات گھرانے میں اپریل ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہ گھرانہ گوجرہ میں مقیم تھا۔ پھر آپ والدین کے ہمراہ لیہ آگئے۔ جہاں ۱۹۶۶ء میں ایم سی ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۶۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں پاکستانی سیاست ایک عجیب دور سے گزر رہی تھی۔ ملک کے مشرقی اور مغربی بازو الجھن کا شکار تھے اور دشمن اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لہٰذا آپ نے سرحدوں کی حفاظت کو ترجیح دی اور سگنل کور میں بھرتی ہو گئے۔ ٹریننگ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پاک وطن جنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ آپ نے ان حالات میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کمیونی کیشن کو بحال رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ لیکن بدقسمتی کہ اصل کمیونی کیشن بحال نہ رہ سکا اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ جس سے آپ بھی دلبرداشتہ ہو گئے اور ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کے تسلیم ہونے کے ساتھ ہی آپ بھی فوج سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں آپ نے بی اے کیا۔ اور ۱۹۷۶ء میں لیہ شوگر ملز میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس ملازمت کے دوران آپ نے ایم اے اردو کیا اور یہ ملازمت چھوڑ کر ۱۹۸۲ء میں محکمہ تعلیم میں لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔

جناب شہباز نقوی خوش اسلوب اور تازہ فکر شاعر ہیں۔ لیکن بکھرے بکھرے اور پاش پاش حالات جیسے ہر شخص پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ پر بھی اپنے نقوش مرتب کر گئے۔ بلکہ ایک صاحبِ فکر و خیال ہونے کے ناطے کچھ زیادہ ہی زد پڑی۔ جو آپ کی تحریروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ محرومیوں اور مخدوشیوں کے وہ زمانے آپ آج تک نہیں بھولے اور ان کی یادیں، اُس قیمتی اثاثے اور ان صحبتوں کو آج بھی یاد کر کے تڑپ اٹھتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ آپ کا رخشِ قلم اب تنقید اور انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی منزلیں قطع کر رہا ہے۔ اس میدان میں بھی آپ کا اندازِ تحریر شاعری سے بے حد مماثل ہے اور شاید اس فیلڈ میں اترنے کے پیچھے بھی انہی حالات کا ہاتھ ہو۔ جن سے ایک مدت تک آپ دست بگریباں رہے۔ ٥٥٥

حمد

کوئی ثانی کوئی ہمسر ہے نہ ہمتا تیرا
ذاتِ واحد ہے تری نام ہے یکتا تیرا

اتنا تنہا کہ نہیں کوئی شریک ہستی
اتنا بھرپور کہ ہر چیز سے رشتہ تیرا

اتنا ظاہر کہ نہیں تجھ سا ہویدا کوئی
اتنا مستور کہ ہر شخص ہے جویا تیرا

برگِ لرزاں کی زباں پر ترے ہونے کی صدا
سبز کونپل کے لبوں پر ہے قصیدہ تیرا

مست جھونکا ہو کہ بادل میں چھپی کرنیں ہوں
دل سمجھتا ہے بہر رنگ اشارہ تیرا

یہ رواں وقت یہ سیال زمانے تیرے
لمحے لمحے کی ہتھیلی پہ ہے لکھا تیرا

شعر کہتا ہوں کہ کرتا ہوں عبادت تیری
کاش حرفوں میں اتر آئے سراپا تیرا

غزل

اے میرے خدا کوئی عذابوں میں نیا پن
اس شہر میں ہوتے ہیں ستم اور طرح کے

ہے برسرِ پیکار مجھی سے میرا لشکر
اب دستِ عدو میں ہیں علم اور طرح کے

دیباچۂ تاریخ سفر میں یہی لکھنا
رہ اور طرح کی ہے قدم اور طرح کے

ہے قصۂ ہجراں نہ حدیثِ غمِ جاناں
اس عہدِ مسائل میں ہیں غم اور طرح کے

ہر شخص کو دولت سے خریدا نہیں جاتا
وہ اہلِ قلم اور ہیں ہم اور طرح کے

سوچوں کو تراشا تھا کسی اور ہی ڈھب سے
کاغذ پہ ہوئے لفظ رقم اور طرح کے

سپاہی محمد اسلم فائق

شاعر میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو لفظوں کے موئے قلم سے کینوس پر اتار کر پیش کرنے کے فن سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جیسے ہر مصور کی ہر تصویر میں ایک سی کشش نہیں ہوتی۔ ایسے ہر شاعر کا ہر شعر بھی یکساں نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے فن کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ جناب محمد اسلم فائق بھی لفظوں سے تصویریں بنانے والے فنکار ہیں۔ جسے ہم شاعر کہتے ہیں۔

پورا نام مسکین محمد اسلم، قادری نسبت اور فائق تخلص ہے۔ والد ماجد کا اسم گرامی محمد خلیل راجپوت منہاس ہے۔ آپ کا گاؤں لالہ موسیٰ ضلع گجرات سے بجانب مغرب دو میل کے فاصلے پر موضع چک سروانی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کوٹلہ قاسم خان سے حاصل کی اور پھر لالہ موسیٰ آگئے۔ جہاں اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر وہیں ایک سکول میں ٹیچری کرنے لگے۔ لیکن ڈیڑھ دو سال کے بعد اسے چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ تقریباً اڑھائی سال فوج میں خدمات سرانجام دیں لیکن شوریدگی نے چین نہ لینے دیا اور آپ نے ڈسچارج لے لیا۔ پھر نوکری کی تلاش میں کراچی جا پہنچے اور ملیر کینٹ میں ایم ای ایس میں ملازم ہو گئے۔ وہاں ایم امجد ارمان سے ملاقات ہو گئی تو ان کے مشورے سے ایک پرائیویٹ سکول بھی چلانے لگے اور شاعری میں بھی ان سے رہنمائی لینے لگے۔

جناب محمد اسلم ابھی چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے کہ شعر کی دھن سما گئی۔ شاعری کا اتا پتہ تو تھا نہیں۔ وہیں آپ کی ملاقات لالہ موسیٰ کے مایہ ناز شاعر جناب شاطرؔ سے ہو گئی۔ ابھی بچے ہی تھے۔ جب تک شعر انہیں سنانے کی کوشش کرتے وہ پھینک دیتے۔ اور یوں جو کچھ سوجھ بوجھ کے بغیر لکھا تھا استاد کے ہاتھوں پھینکوا بیٹھے۔ مدتوں بعد جب کراچی میں امجد ارمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو سوجھ بوجھ بھی تھی اور شعور بھی۔ شعر کہنے لگے اور پختہ کار شاعر بن گئے۔ جو آج اس روپ میں ہمارے سامنے ہیں۔ ○○○

غزلیں

جب فضل خدا کا ہوتا ہے گمنام سہارے ملتے ہیں
طوفان کی سرکش موجوں میں ہمدرد کنارے ملتے ہیں
جا کام کر اپنا وقت نہ کھو اس بزم میں تیرا کام نہیں
تو کاروباری دنیا کا یاں عشق کے مارے ملتے ہیں
جب دیدۂ بینا حاصل ہو جس سمت نظر اٹھ جاتی ہے
تاریکیاں روشن ہوتی ہیں پُرکیف نظارے ملتے ہیں
اس وقت کی حالت کیا کہئے کچھ حدِ بیاں سے باہر ہے
جب حسن و جنوں کے آپس میں نظروں کے اشارے ملتے ہیں
راضی ہو مشیت جب جس پر وہ فیض مراتب پاتا ہے
تعظیم سے اس کو جھک جھک کر سب چاند ستارے ملتے ہیں
فائق نے یہاں روداد عمل احباب کی ایسی پائی ہے
طغیانیِ دریا میں جیسے طوفان کے دھارے ملتے ہیں

سہل جانا تھا دل لگانے کو ہم نہ سمجھے تھے اس نبھانے کو
طبع نازک کے حظ اٹھانے کو غم کا دیواں کیا فسانے کو
بے گناہوں کا خون کرتے ہو آپ شمشیر آزمانے کو
آب ہے تیغ کا تو تل دانہ ہم ترستے تھے آب و دانے کو
شمع ساں جل رہا ہوں محفل میں تھی جو محفل لگی بجھانے کو
کوئی پایا پتہ نہ فائق کا
پوچھتے رہ گئے ٹھکانے کو

سپاہی غضنفر علی دُکھی

افواجِ پاکستان میں سپاہی بھرتی ہونے والوں میں اکثریت بلکہ ننانوے فیصد جوانوں کا تعلق دیہات سے ہوتا ہے۔ جہاں تعلیم کی کمی ضرور ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں احساسات کی کمی یا شعور کا فقدان ہے۔ وہاں مواقع کم ہیں لیکن ذہن سرسبز و شاداب ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ سے یہ بات روشن نظر آتی ہے کہ شہروں کو رونقِ دوام انہی دیہاتی ذہنوں نے بخشی اور فوج کو بہادر اور جان پر کھیلنے والے سپوت انہی دیہاتوں نے دیئے۔ ادب کی آبیاری اسی ماحول سے ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کیوں پسند کئے جاتے ہیں؟ اس لیے کہ انہوں نے ان دور دراز پسماندہ بستیوں سے جنم لیا اور اپنی تحریروں میں اسی ماحول اور انہی مسائل کی بات کی۔

راولپنڈی کے ایک گاؤں ور کالی میں ۱۹۵۳ء میں ایک غریب گھرانے میں غضنفر علی پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرتے ہی نوکری کی تلاش شروع ہوئی۔ جب کہیں سینگ نہ سمائے تو فوج کی سگنل کور میں بھرتی ہو گئے۔ گھر اور ماحولؔ کے جو دکھ اس کے حصے میں آئے تھے، ملازمت مل جانے کے بعد سکون کی گھڑیوں میں وہ کبھی کبھار کچوکے لگاتے۔ جن کا اظہار وہ شعروں کی صورت میں کرتے۔ جناب غضنفر علی ہر وقت سوچتے رہتے۔ چونکہ سوچ پر کوئی قدغن نہیں۔ وہ اپنے خیالوں کو صفحات پر منتقل کرتے۔ لیکن چپکے چپکے اور خاموشی کے ساتھ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اپنی محرومیوں کا رونا، دکھوں کا اظہار، غموں کے قصے، درد کی داستانیں، خلش کے افسانے یہ سب کچھ وہ اپنی حساس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر غزل کے پیکر میں ڈھالتے رہتے اور اوراق جمع کرتے رہتے۔ یوں انہوں نے پندرہ برس کی مدتِ ملازمت فوجی اور ادبی ہنگامے اور خاموشی میں گزار دی۔ ۱۹۸۷ء میں جب آپ فوج سے رخصت ہو رہے تھے تو سب سے پہلا شخص غالباً میں تھا جو ان کی بیاض سے مستفید ہوا۔ اردو اور پوٹھواری زبان میں غزل کو انہوں نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔ دکھی صرف آپ کا تخلص ہی نہیں کلام بھی ہے۔ لہجے میں پختگی کی جانب بڑھتی ہوئی بے ساختگی کی ایک موج مچل رہی ہے۔ آج خدا جانے وہ کس حال میں ہیں۔ لیکن اگر ان کی حوصلہ افزائی ہو جائے تو پختگی ان کے کلام کو مل سکتی ہے اور وہ شاعری کے میدان میں اپنی پہچان کروا سکتے ہیں۔ ○○○

نمونۂ کلام

کہنے لگے کہ بستیاں ان کی اجاڑ دو — یہ اہلِ دل ہمیں کہیں برباد کر نہ دیں
گر ہو سکے تو چین سے جینے نہ دو انہیں — تا اور کوئی رسم یہ ایجاد کر نہ دیں

بجھ سکے گی نہ تجھ سے آتشِ دل — دیدۂ اشکبار جانے ذے
کون آئے گا اجڑی بستی میں — کس کا ہے انتظار جانے دے

جب بھی سجدے میں گئے تِلک لگا کر اٹھے — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ صنم رکھا ہے
کھا کے پتھر بھی دکھی پھول دکھائے سب کو — ہم نے اس طرح محبت کا بھرم [illegible] ہے

زور سے دھڑکا جو دل تو آنکھ میری کھل گئی — اور جب دیکھا تو تاحدِ نگاہ کوئی نہ تھا
سب نظر آئے ہیں مجھ کو تیری محفل میں بخیل — دیکھ کر میری تڑپ کہنے کو واہ کوئی نہ تھا
اے دکھی جب روبروئے داورِ محشر گئے — وہ بری ٹھہرے کہ میرا تو گواہ کوئی نہ تھا

غزل

ہم جی رہے ہیں جس طرح جینا محال ہے — واللہ غم ملا ہے کہ جو [illegible] ہے
مانگا نہیں [illegible] نے کچھ اس کے ماسوا — اک نظرِ التفات کا [illegible] ہے
کہتے ہیں [illegible] جانب نہ دیکھنا — پابندیٔ نظر کی انوکھی مثال ہے
دیکھا [illegible] لو مٹی تو یوں کہا — یہ بھی سرودِ غم کی نئی اک مثال ہے

ہم اور اے دکھی ترے پانے کی جستجو
توبہ ! حضور ! یہ کہاں اپنی مجال ہے

سپاہی اوصاف احمد شیخ

آج بہت سے ادبی رسائل میں ایک نام کثرت سے دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے اوصاف احمد شیخ۔ میں نے تو اس شخصیت کے ساتھ رابطہ کیا تھا۔ "میرے دیس کی ہواؤ" والے کیپٹن اوصاف احمد کے حوالے سے اور یہ صاحب نکلے سپاہی اوصاف احمد جو بہت تھوڑا عرصہ یعنی صرف چند ماہ فوج میں رہے اور پھر میڈیکل ان فٹ ہو کر فوج سے ڈسچارج لے لیا۔

اوصاف احمد شیخ ولد شیخ احسان الحق ایڈووکیٹ ۵ اپریل ۱۹۶۵ء تحریری ریکارڈ کے مطابق ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیمی سلسلہ ادھورا چھوڑ کر ۱۹۸۱ء میں سگنلز کور میں بھرتی ہو گئے لیکن چند ہی ماہ بعد ۱۹۸۲ء میں فارغ ہو کر دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ اور ایم اے پولیٹیکل سائنس پر جا کر رکے۔

ادبی حوالے سے آپ آجکل بہت تیز چل رہے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی ادبی جرائد میں تواتر سے آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ادبی میگزین "انٹرنیشنل جو کہ پاکستان اور برطانیہ سے بیک شائع ہوتا ہے کے آپ چیف ایڈیٹر اور پبلشر ہیں ایک علمی، ادبی، سماجی و ثقافتی تنظیم "بزم سجاد" انٹرنیشنل کے صدر بھی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ رکن پاکستان رائٹرز گلڈ، رکن پریس کلب ساہیوال، رکن انجمن صحافیان ساہیوال اور جنرل سیکرٹری ایڈیٹرز کونسل ضلع ساہیوال بھی ہیں۔

آپ کی مصروفیات اور کام کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی چوک نہیں ہوتی کہ جوان اوصاف کے حوصلے بھی جوان ہیں اور آنے والے وقت میں بہت کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے شب و روز محنت سے کام لے رہے ہیں۔ شاعری میں آپ کا قلم اکثر غزل اگلتا ہے اور اتنے پیارے شعر بکھیرتا ہے کہ انہیں نگاہوں سے چن کر ذہن و دل میں سجانے کو جی چاہتا ہے۔ لہجہ بھی جدید ہے اور کلام میں پختگی بھی ہے۔

غزلیں

کھڑکیاں سوئی در و دیوار چپ
ساری گلیاں اور بھرے بازار چپ

کس قیامت کی خبر آنے کو ہے
گاؤں کے چوپال چپ ، اخبار چپ

درمیاں ہے خوف کا دریا رواں
اس طرف میں چپ ہوں وہ اس پار چپ

کیسا قحطِ آدمیت ہے یہاں
زندگانی کے سبھی آثار چپ

میں نے تو انصاف مانگا تھا مگر
آج ہیں اوصاؔف مرے یار چپ

تلاش کرتا ہوں ہر پل جواب سوچوں کے
بھگت رہا ہوں میں کب سے عذاب سوچوں کے

غمِ معاش غمِ عاشقی غمِ دل نے
گلاب چہروں پہ ڈالے نقاب سوچوں کے

ہر ایک سمت اندھیرا دکھائی دیتا ہے
افق پہ چھائے ہوئے ہیں سحاب سوچوں کے

کسی کی یاد کا کچا گھڑا تو ڈوب گیا
بپھرتے جاتے ہیں لیکن چناب سوچوں کے

تمہارے واسطے دامن میں میرے کچھ بھی نہیں
تمہاری نظر میں تازہ گلاب سوچوں کے

میں اس کو سوچنے بیٹھا ہی تھا ابھی اوصاؔف
کہ مجھ پہ کھل گئے کتنے ہی باب سوچوں کے

سپاہی محمد افضل (افضل گوہر)

محمد افضل گوہر ۱۹۶۵ء میں پھلروان ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبدالستار ہے۔ آپ نے میٹرک ہائی سکول پھلروان سے کیا اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخلہ لے لیا۔ لیکن کالج کی ہوا راس نہ آئی اور آرمی میڈیکل کور میں نرسنگ اسسٹنٹ بھرتی ہو گئے۔

آپ کا اپنے بارے کہنا ہے کہ "ہوش سنبھالنے کے بعد جب قلم اٹھانے کا شعور آیا تب احساس ہوا کہ میرے اندر بھی ایک شخص ہے جو معاشی و معاشرتی پیچیدگیوں کے زہر کا تریاق لفظوں کے سم سے کرتا ہے۔ اسی لیے مطالعے کا شوق انتہائی ہے۔ بغیر اصلاح اور بغیر استاد کے مشورہ سے مطالعے ہی کو استاد اور رہنما سمجھتا ہوں۔ تقریباً ۱۲ سال سے شاعری کر رہا ہوں"۔

جناب افضل گوہر نے اتنی کم عمر اور کم مدت میں اتنی عمدہ شاعری کی ہے کہ اس پر کسی کہنہ مشق شاعر کا گمان ہوتا ہے۔ غزل کو دیکھیں تو جدت اور پختگی لیے ہے۔ نظم کو دیکھیں تو دلکشی اور بھولپن نظر آتا ہے۔ سنجیدہ شاعری تو اپنی جگہ سونا لیکن مزاحیہ اور طنزیہ شاعری نے اس پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ جس میں آپ نے بڑے سیدھے سادے اور مزاح کے انداز میں سچے کی باتیں کی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ خلفشارِ زمانہ، بے قاعدگیِ معاشرہ اور فتنِ ماحول کو باریکی سے پڑھا اور گہرائی تک گُڑھا ہے۔

سپاہی محمد افضل ایک فزیو تھراپسٹ ہے جو دوسروں کے اعضاء کے درد مختلف رنگ و قسم کی شعاعوں اور لہروں سے جہاں دور کرتا ہے وہاں ایک دردمند شاعر کے روپ میں دلوں کے درد کا بھی علاج کرتا ہے۔ آپ کی شاعری ایک دردمند شخص کی شاعری ہے جو انسانوں اور قوموں کو جب نفرتیں تقسیم کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو کڑھنے لگتا ہے۔ اور پھر کبھی کوئی مشورہ دیتا ہے تو کبھی حقیقت کو آئینے کے روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ کبھی سبق دیتا ہے تو کبھی رونے لگتا ہے اور کبھی طنز کے تیر برسا کر من کی شانتی پاتا ہے۔

آپ ملک کے چوٹی کے اخبارات و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ جن میں "ماہِ نو، اوراق، تخلیق، ہلال" اور "روزنامہ جنگ" جیسے پرچے اور اخبارات شامل ہیں اور ہاں جنگ لندن بھی آپ کی غزلیں کبھی کبھار خاص طور پر شائع کرتا ہے۔ ○○○

غزلیات

خوف سے سہما ہوا ایسے بشر لگتا ہے کوئی اب سانس بھی لیتا ہے تو ڈر لگتا ہے
ہم تری چھاؤں میں بیٹھے ہیں تو محسوس نہ کر دھوپ ایسی ہے کہ تنکا بھی شجر لگتا ہے
یہ بجا ہے تری تکمیل ہوئی ہے مجھ سے رائیگاں پھر بھی مجھے اپنا ہنر لگتا ہے
تم نے اس شہر میں رہنا ہے تو اے دوست میرے پھول سمجھا کرو پتھر بھی اگر لگتا ہے

پھولنے پھلنے کا موسم ہو تو افضل گوہر
تیز آندھی میں بھی پیڑوں کو ثمر لگتا ہے

یہ بھی کیا ہے ایک ہی سودا سر میں رہنا پیٹ کی خاطر رزق کے ہی چکر میں رہنا
تیرے بدن کی خوشبو سے من مہک رہا ہے اے دیوداسی بس اب اس مندر میں رہنا
اک لذت کی دھنک لہو میں اتر رہی ہے اور ذرا سی دیر اسی منظر میں رہنا
ایسی زیست بھی کیا ہے تم نے دیکھا ہوگا کٹھ پتلی کا دستِ شعبدہ گر میں رہنا

تم کو کیا معلوم ہے گوہر اس دنیا میں
شیشے کو بھی پڑتا ہے پتھر میں رہنا

سپاہی سید ساغر علی نقوی (ساغر نقوی)

سادات گھرانے کے چشم و چراغ ساغر علی نقوی ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید گل نواز نقوی اور بڑے بھائی گو شاعر تو نہیں لیکن شاعر گر ضرور ہیں۔ انہیں ادب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ جس کے باعث گھر کا ماحول ادبی ہے اور شاعری اکثر موضوعِ بحث رہتی ہے۔ ایسے ہی ادب دوست ماحول میں ساغر علی نقوی پروان چڑھا اور پھر ساغر نقوی بن گیا۔ گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک اور پھر انٹر کالج بھیرہ سے ایف اے کرنے کے بعد یکم فروری ۱۹۹۱ء کو آرٹلری میں سپاہی بھرتی ہوگیا۔ انٹر تعلیم کا آپ کو فائدہ اتنا ہوا کہ آپ کو کلرک ٹریڈ دے دیا گیا۔ لہٰذا آپ بڑے شوق اور لگن سے قلم، بیلچہ اور ٹائپ رائٹر سے نباہ کر رہے ہیں۔ جونیئر سپاہی ہونے کے ناتے ٹائپ رائٹر تو کم ہی استعمال میں آتا ہو گا۔

ساغر نقوی جو ابھی مبتدی ہیں، فکر و خیال کے سفر پر نئے نئے روانہ ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں اتنی پختگی اور مضبوطی نہیں اور نہ ہی ابھی خیال میں ندرت اور جدت آئی ہے۔ لیکن ایسے ماحول میں رہتے ہوئے جہاں کوئی بھی ادبی سفر میں ان کا ساتھی نہیں۔ وہ جس جذبے سے گامزن ہیں۔ انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کیونکہ گھر تو انہیں سال میں کبھی ایک آدھ بار آنا ہوتا ہے۔ اور وہ چند دن کی چھٹی والد یا بھائی سے ادبی بحث کریں یا دوستوں اور احباب کو ملیں۔ ہاں! چونکہ میرا موضوع اردو ہے اس لیے میں اردو شاعری کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ ساغر نقوی کی پنجابی شاعری میں واقعی روانی لہجہ کے ساتھ پختگی پائی جاتی ہے۔ غالباً آپ شاعر ہی پنجابی کے ہیں۔ اردو تو شاید صرف ذائقہ کی تبدیلی کے لیے لکھتے ہوں گے۔ پنجابی کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترا میرا درد دا رشتہ اے ایس رشتے دا کوئی توڑ نئیں
زر دولت دا محتاج نئیں کسی لالچ دی کوئی لوڑ نئیں
اے جگ والے سبھ کملے من جناں ویر دی ریت اپنائی اے
جے رب سوہنے دا کرم ہووے کسی شے دی ساہنوں تھوڑ نئیں
میرا وس جے کدھرے چل جاوے قانون، کتاباں بدل دیواں
اک حکم میں جگ تے عام کراں دل والیاں نوں کوئی ہور نئیں

○○○

نمونۂ کلام

ہجر کا لمبا سفر ہمراہ مرے دیوانگی
درد کہ رکتا نہیں ہے اور بڑھے دیوانگی

پیار کی شدت ہے اتنی دل پہ کچھ قابو نہیں
جو سنے، حیران ہو، ہنس کر کہے دیوانگی

چاک دامن ہو چکا صحرا کا رستہ لے لیا
مل گئی رسوائی مجھ کو اب ملے دیوانگی

تن گیا، من بھی گیا، سب لٹ گیا مال و متاع
کر دعا، نہ ہو شفا، بڑھتی رہے دیوانگی

سن مری ساغرؔ محبت میں خرد کا کام کیا
عشق یاں جو بھی کرے آخر سہے دیوانگی

تری تلاش ہے تیری ہی جستجو اب کے
عجیب جاگ اٹھی من میں آرزو اب کے

مرے جنون کو شاید قرار آجائے
تجھے میں دیکھ لوں گر اپنے روبرو اب کے

دل و نگاہ تو پہلے لٹا کے بیٹھا تھا
تمہارے پیار میں جائے گی آبرو اب کے

چار سو تیری ہی تصویر میں دیکھے جاؤں
من کے مندر میں سجا کر تجھے پوجے جاؤں

یہ ہے معلوم سرِ بام نہ تو آئے گا
دل مچلتا ہے ترے کوچے سے ہو کے جاؤں

آ ذرا پاس کہ ساغرؔ میں چڑھا لوں کچھ تو
تیری آنکھوں کی گلابی کہے چھلکے جاؤں

ایئرمین قمر صدیقی

پندرہ برس کی عمر گو لڑکپن ہوتا ہے۔ لیکن شعور آنکھ کھول چکا ہوتا ہے۔ انسان خام ذہن رکھنے کے باوجود کبھی کبھار بڑی پختہ باتیں سوچتا ہے اور اکثر یہی عمر ہوتی ہے جب کوئی لڑکا دل کے پھپھولے پھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے اندر کی کیفیت کو ظاہر کرے اور لوگوں کو بتائے۔ لیکن لوگ اسے کم سن سمجھ کر اس کی باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔ جس سے بہت سے حساس طبیعت اس عمر میں شعر موزوں کرنے لگتے ہیں۔

جناب قمر صدیقی نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ دس سال کے تھے کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا جب ذرا ہوش سنبھالا تو اپنے دکھوں کو لفظوں کی زبان دینا شروع کر دی۔ شاعری میں آپ استاد کے قائل نہ تھے۔ خود ہی کہتے اور خود ہی اصلاح کرتے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آمد و آورد کی قید سے آزاد ہو گئے۔ جب جی چاہا کہہ دیا۔ زیادہ تر فی البدیہہ اشعار کہے ہیں۔

آپ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا تو خود کو سیوہارہ ضلع بجنور میں پایا۔ والد کی وفات کے بعد آپ کی والدہ نے سخت محنت مشقت کی اور آپ کو تعلیم دلوائی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ضلع نینی تال میں مکمل کی۔ آزادی کی تحریک ان دنوں اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی۔ آپ بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور یہاں آ کر پاک فضائیہ میں ایئرمین بھرتی ہو گئے۔ طبیعت شاعرانہ تھی۔ ماحول کو فطرت کے موافق نہ پا کر کچھ عرصہ بعد یہ ملازمت چھوڑ دی اور پھر کچھ مزید کرنے اور پانے کی لگن میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ہی ادبی محفلوں سے مستفید ہوتے رہے اور بالآخر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کر کے قدرے سکون پایا۔ اس دوران مختلف سرکاری محکموں میں خدمات انجام دیتے رہے اور آخر ش سلسلۂ روزگار درس و تدریس ٹھہرا۔

قمر صدیقی نہ صرف غمِ جاناں اور گردشِ روزگار والے انسان تھے بلکہ ایک سچے قوم پرست تھے۔ کائنات کے حوالے سے ان کے کلام میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ چونکہ مطالعہ بہت وسیع تھا اس لیے علم کے اثرات بڑے واضح نظر آتے ہیں لیکن آپ نے جو دکھ اٹھائے ان کا آپ کی شاعری پر بڑا گہرا رنگ ہے۔ ○○○

غزلیں

بھٹکے ہوئے رہتے ہیں کئی دن سے خیالات
کیا جانئے کیا پیش کریں ارض و سماوات

پھر در پئے آزار ہوئی گردشِ حالات
پھر چھوڑنا پڑ جائے گا یہ شہر طلسمات

ساغر ہیں شکستہ کبھی ساقی نہیں موجود
اس حال میں آئے بھی تو کیا لطف دے برسات

راحت کو بھی منسوب کیا رنج و الم سے
اس درجہ مرے دل میں غموں کی ہوئی بہتات

سن غور سے اک روز ہے، گر ذوقِ سماعت
خاموشی سے پیغام دیا کرتے ہیں ذرات

مل جائیں سرِ راہ تو کھلتے نہیں واعظ
مے خانے میں رہتی ہے مگر خوب ملاقات

کیوں محفلِ رنداں میں بھی خاموش قمر ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ اچھے نہیں حالات

خوابِ حسین تر سے جگایا گیا ہوں میں
یہ کس خطا پہ ہوش میں لایا گیا ہوں میں

اب تک ہے میرے ذہن میں خوشبو بسی ہوئی
پھولوں کی انجمن سے اٹھایا گیا ہوں میں

لوح و قلم بھی میرے لئے اشکبار ہیں
حرفِ غلط سمجھ کے مٹایا گیا ہوں میں

شاید بنانے والے نے سمجھی ہو مصلحت
اپنی نگاہ سے بھی چھپایا گیا ہوں

اتنا کرم ضرور ہوا تیری یاد سے
تاروں کی روشنی میں سلایا گیا ہوں

یہ حشر ہے یہاں مجھے آرام چاہئے
دنیا میں ہر قدم پہ ستایا گیا ہوں میں

میرا مقام عرش تھا اب فرش ہے قمر
کتنی بلندیوں سے گرایا گیا ہوں

سیلر محمد منیر (منیر نیازی)

اردو شاعری کاایک جاناپہچانانام ع

اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اور ع

جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

جیسی غزلوں کے خالق جناب منیر نیازی ۱۹۲۳ء میں ہوشیارپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے ایف اے کیا۔ ان دنوں دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ آپ بھی نیوی میں بھرتی ہو گئے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یہ ملازمت چھوڑ دی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور آگئے۔ لیکن مختلف مقامات پر تھوڑا تھوڑا عرصہ گزارتے رہے۔ جہاں تعلیم کے حصول کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

شاعری میں آپ منفرد سوچ اور اسلوب کے مالک ہیں۔ اردو اور پنجابی کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "اس بے وفا کا شہر، ماہ منیر، تیز ہوااور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، دشمنوں کے درمیان شام، چھ رنگین دروازے، سفر دی رات، چار چپ چیزاں، رستہ دسن والے تارے، پہلی بات ہی آخری تھی، ایک دعاجومیں بھول گیا" وغیرہ شامل ہیں۔

جناب محمد منیر نیازی کے والد فتح محمد نیازی جب فوت ہوئے تو آپ بچے تھے اور میرے خیال میں شاید یہ والد کی شفقت سے محرومی کااثر ہے کہ آپ نے ساری زندگی خود کو تنہا محسوس کیا۔ آپ بچپن میں بھی گھر سے باہر نکل جاتے اور اکیلے پن سے محظوظ ہوتے۔ اتنی عمر گزرنے کے بعد بھی آپ بھری محفل میں اکثر رو پڑتے ہیں اور جب آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ "شاید میرے پاس احساس تنہائی ہے اس وجہ سے رو تا ہوں"۔ ایک محفل میں آپ نے کہا تھا "خدا کو میں نے اپنی تنہائی سے پہچانا"۔

بقول شخصے "منیر نیازی کی شاعری نامعلوم کی تلاش کا سفر ہے۔ وہ منزلوں کو راستوں میں بدلتے ہوئے کہیں چند لمحے ٹھہرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ سفر ان کا بچپن سے شروع ہے اور نجانے کس مقام پر اس کا انجام ہو"۔ ○○○

غزلیں

اشکِ رواں کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس
برکھا کی رت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو

پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

شامِ الم ڈھلی تو چلی درد کی ہوا
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

غم کا وہ زور اب مرے اندر نہیں رہا
اس عمر میں میں اتنا ثمرور نہیں رہا

اس گھر میں جو کشش تھی گئی ان دنوں کے ساتھ
اس گھر کا سایہ اب میرے سر پر نہیں رہا

وہ حسنِ نوبہارِ ابد شوقِ جسم، سن
رہنا تھا اس کو ساتھ میرے پر نہیں رہا

مجھ میں ہی کچھ کمی تھی کہ بہتر میں ان سے تھا
میں شہر میں کسی کے برابر نہیں رہا

رہبر کو ان کے حال کی ہو کس طرح خبر
لوگوں کے درمیان وہ آکر نہیں رہا

واپس نہ جا وہاں کہ ترے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

۵۰ سالہ جشنِ قیامِ پاکستان مبارک

اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمیں وطنِ عزیز کی پچاسویں سالگرہ نصیب فرمائی۔ اس مبارک اور پُرمسرت موقع پر افواج پاکستان کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے وطن کے ہر شہری کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ان پچاس سالوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔۔۔ میں بصد معذرت اپنی نسل سے یہ حقیقت بیان کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہمارے بزرگوں نے بے شمار قربانیوں کے بعد یہ حسین و جمیل خطہ حاصل کیا تھا۔ لیکن ہم نے تاریخ کو مکمل طور پر فراموش کر دیا۔ اور ناشکری کے مرتکب ٹھہرے۔ جس کی ہمیں بہت بڑی سزائیں دی گئیں۔۔۔ ہم نے اپنی اس دھرتی ماتا کو صرف دکھ اور درد ہی نہیں دیئے بلکہ اس کی عزت و ناموس کی رکھوالی میں بھی ناکام رہے۔

آج ہم اپنے ضمیر (اگر زندہ ہیں تو) سے سوال کریں تو سوائے ملامت کے شاید ہمیں کوئی جواب نہ مل سکے۔

بہرحال۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے۔۔۔ آیئے! ہم سب مل کر ایک نہ ٹوٹنے والی (Unbreakable) قسم کے ساتھ عہد کریں کہ اپنی [illegible] کوتاہیوں اور غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنی ماں (وطنِ عزیز) کی ہر طرح سے خدمت [illegible] مزید دکھ نہ دیتے ہوئے اس کی ترقی کے لئے شب و روز جان و دل سے کوشاں رہیں گے۔

آیئے ہم سب اللہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعا کریں کہ

- اے الٰہ العالمین اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس وطن عزیز کو اسلام کا قلعہ اور اسلام کا مرکز بنا دے۔
- اے دلوں میں محبتیں پیدا کرنے والے! ہمارے دلوں کو وطن کی محبت سے بھر دے۔
- اے باری تعالیٰ! ہمیں اس کی خدمت کے جذبہ سے سرشار فرما۔
- یا رحیم و کریم! ہم سب کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور اپنی کریمی کے صدقے ہم سب میں اتفاق و اتحاد پیدا فرما۔
- یا مالک الملک! ہمیں اپنے ملک کی حفاظت کرنے کی ہمت و حوصلہ عطا فرما۔

اے عظیم و برتر! ہمیں وطن جیسی نعمت سے نوازا ہے تو اس کو تاقیامت عظمت و رعنائی سے بھی نوازے رکھے۔

- یا حیّ یا قیوم! اس عطا کردہ خطہ کو ابد تک قائم و دائم رکھ۔۔۔

آمین ثم آمین